وفاقی اردو یونیورسٹی
برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی

مفتیِ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی علمی، تصنیفی اور ملّی خدمات کا علمی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علومِ اسلامی)

ریسرچ اسکالر

اسد اللہ

شعبۂ علوم اسلامی، کلیہ معارف اسلامیہ
وفاقی اردو یونیورسٹی، عبدالحق کیمپس کراچی

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر حافظ محمد ثانی

صدر شعبہ قرآن وسنہ، کلیہ معارف اسلامیہ
وفاقی اردو یونیورسٹی، عبدالحق کیمپس کراچی

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی- کراچی

۱۴۳۹ھ - ۲۰۱۸ء

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحیم

اللّٰهمّ صلّ علیٰ سیّدنا محمد النبی

الاُمّی وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ وبارک وسلّم

افضل الصلوٰۃ ص ۹۸

انتساب

اپنے والدینِ گرامی کے نام

آج میں جو کچھ ہوں، ان کی حسنِ تربیت، ان تھک محنت، پر خلوص جذبوں اور لازوال قربانیوں کی بدولت ہوں!!

مولائے کریم ان دونوں کی قبروں کو نور سے بھر دے اور اُن کی روح کو سکون و اطمینان اور قرار عطا فرمائے۔ (آمین)

اظہار تشکر

میں سب سے پہلے اپنے رحیم و کریم پروردگار، اللہ عزوجل کا شکر ادا کرتا ہوں، جس نے اپنے خاص فضل سے مجھے یہ علمی و تحقیقی مقالہ ماہِ رمضان المبارک کے پرنور و بابرکت لمحات اور بالخصوص اس ماہِ مقدس کے آخری عشرے میں جملہ مراحل مکمل کرنے کی سعادت عطا فرمائی۔

میں اس موقعے پر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مقالے کی تکمیل میں جن حضرات کی تصنیفات سے میں نے اپنی اس تحقیق میں مدد حاصل کی ہے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں۔ اس کے بعد میں یہ اعتراف کرنے میں نہایت خوشی و مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ اپنے اس تحقیقی کام کے سلسلے میں اس عرصے کے دوران مختلف اوقات اور موڑ پر کئی حضرات کا خاص تعاون حاصل رہا، جملہ اساتذہ اور سینئرز نے قیمتی مشوروں سے نوازا، دوست احباب نے بھی گاہے بہ گاہے خصوصی دلچسپی کے ساتھ ہمت افزائی کی۔

اس سلسلے میں اپنے مقالے کے نگران محترم ڈاکٹر حافظ محمد ثانی صاحب (صدر شعبہ قرآن وسنہ) کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ ان کی موضوع سے خاص دلچسپی، مصادر و مراجع کی نشاندہی اور علمی راہنمائی نے میرے حوصلے بڑھائے، جس کی بدولت یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ پھر (رئیس کلیہ معارف اسلامیہ) پروفیسر عبدالغفور بلوچ صاحب اور (شعبہ علوم اسلامی کے چیئرمین) جناب صادق بلوچ صاحب کی جانب سے خاص سرپرستی پر ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

اسی طرح علوم حدیث کے عظیم محقق، استاد محترم، بلند پایہ محقق اور عالم جلیل علامہ نور البشر صاحب (مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ عثمان بن عفان کراچی) کا احسان مند ہوں جنہوں نے ہر ممکن رہنمائی فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

نیز میں اپنے رفقاء میں سے مولوی ہمایوں وقاص (متخصص معہد عثمان بن عفان) کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جنہوں نے مقالے کی کمپوزنگ، ڈیزائننگ اور پروف ریڈنگ کے حوالے سے بھرپور معاونت کی، اسی طرح برادر عزیز، زاہر نور بھی دوران تحقیق مختلف جہتوں سے معاونت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔

اسد اللہ

ریسرچ اسکالر، مقالہ نگار

شعبۂ علوم اسلامی/کلیہ معارف اسلامیہ

وفاقی اردو یونیورسٹی، عبدالحق کیمپس، کراچی

وفاقی اردو یونیورسٹی
برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ اسد اللہ بن محمود الرحمٰنؒ نے اپنا مقالہ "مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی علمی، تصنیفی اور ملی خدمات کا علمی، تحقیقی او تنقیدی جائزہ" میری نگرانی، رہنمائی اور سرپرستی میں مکمل کر لیا۔

یہ موضوع اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ ایک حقیقت مسلمہ ہے، یہ مقالہ مفتی محمد شفیعؒ کی شخصیت کے حوالے سے ایک دستاویز اور انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں ان کے تحقیقی عمل سے پوری طرح مطمئن ہوں اور بحیثیت ریسرچ سپروائزر پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کی غرض سے انہیں یہ مقالہ جمع کرانے کی اجازت دیتا ہوں۔

نگران مقالہ

ڈاکٹر حافظ محمد ثانی

صدر شعبہ قرآن وسنہ، عبدالحق کیمپس

وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، کراچی

ABSTRACT

Mufti Muhammad Shafi was born on 25 January 1897, in Deoband, British India, Mufti Muhammad Shafi was a South Asian Sunni Islamic scholar of the Deobandi school of Islamic thought. A Hanafi jurist and mufti, he was also an authority on shari'ah, hadith, tafsir (Qur'anic exegesis), and tasawwuf (Sufism).

Mufti Muhammad Shafi graduated in 1917 from Darul Uloom Deoband, where he later taught hadith and held the post of Chief Mufti. He resigned from the school in 1943 to devote his time to the Pakistan Movement. After the independence he moved to Pakistan, where he established Darul Uloom Karachi in 1951. Of his written works, his best-known is Ma'ariful Qur'an, a tafsir of the Qur'an.

Mufti Muhammasd Shafi also continued to teach some books of hadith and tafsir.

At the time Muhammad Shafi was teaching at Darul Uloom Deoband, Indians were struggling for independence from the British. When the All-India Muslim League was formed to campaign for the creation of a separate Muslim state, Ashraf Ali Thanvi instructed all ulama and Muslims in general to support this campaign. Muhammad Shafi, with other scholars including Zafar Ahmad Usmani, joined

the Jamiat Ulema-e-Islam, a council of Islamic scholars formed by Shabbir Ahmad Usmani to campaign for the creation of Pakistan In 1944, Muhammad Shafi resigned from teaching and issuing fatwas at Darul Uloom Deoband in order to devote his time to the movement for the creation of Pakistan. He toured India, gave speeches, and issued fatwas for this purpose.

After independence, in 1948, Muhammad Shafi left his hometown of Deoband and immigrated to Pakistan. He founded Darul Uloom Karachi in 1950/1951. Muhammad Shafi died on 6 October 1976.

He wrote around one hundred books explaining the Quran and interpreting Islamic law. His best-known and most widely translated work is the Ma'ariful Qur'an ("The Wisdom of the Quran"), which he finished (in Urdu) four years before his death. This work, a commentary on the entire Quran, began as a series of weekly lectures on Radio Pakistan that ran for ten years.

This Thesis contains the whole life and services in different ways of mufti Muhammad Shafi, it has 5 chapters, 1st chapter includes mufti Muhammad shafi's detail biography, like his birth, early life and education, family back ground, teachers, students and Sons.

2nd chapter has the details of his writing services; it covers specially his services in the fields of tafsir, hadiths, fiqh, Islamic economy, politics, seerat, history and other different researches.

3rd chapter has been written on his grasp on fatawa, speeches, teaching, foundation darul uloom Karachi and membership of law commission and board of Islamic education.

4th chapter is about mufti Muhammad Shafi's political career, in describes his role in Pakistan movement and his struggles after creation of Pakistan his meetings with political leaders and forming constitution.

The 5th and last one conclusively explains the opinions and tributes and compliments for his services by the national leaders, intellectuals, poets, writers and journalists too.

This thesis can be considered as a detailed biography of mufti Muhammad shafi, which describes all phases of his life's journey.

<u>Research Scholar</u>

(Asad Ullah)

تفصیلی فہرست مضامین

○ فصل دوم: قیام پاکستان سے قبل سیاسی جد و جہد 332

مُقَدِّمَة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی علمی، تصنیفی اور ملی خدمات کا علمی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقدمہ

موضوع کا تعارف، اہمیت اور منہجِ تحقیق:

مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، یہ بیسویں صدی کے وہ آفتاب و ماہتاب مفکر تھے، جن کی شخصیت کے چمکتے ستارے کی آب و تاب صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ بر صغیر ہندوستان سمیت بنگلہ دیش اور برما تک ان کی خدمات کے اَنمٹ نقوش موجود ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ ایک طرف تقویٰ و للہیت کے بلند مرتبے پر فائز تھے، وہ اپنے دور کے مفتی اعظم پاکستان رہے، ان کی پوری زندگی تصنیفی، تالیفی، تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ مسلم امہ کے لیے درد اور فکر کی علامت رہی۔

معارف القرآن جیسی شہرہء آفاق تصنیف منصہ شہود پہ لاکر عالمِ اسلام کی عظیم خدمت سرانجام دی، ریڈیو پاکستان سے درسِ قرآن کا سلسلہ بھی ایک عرصہ تک جاری رہا، ساری زندگی فتاویٰ نویسی و فقہی خدمات کے ساتھ وابستہ رہے، تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے اہم موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھیں، جبکہ دوسری جانب مفتی صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے چلائے جانے والی تحریکِ پاکستان میں بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا، مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے حصول کی جدوجہد میں ان کا مرکزی کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، تحریک کے دوران انہوں نے منبر و محراب اور قلم و قرطاس کے ذریعہ مسلمانوں میں آزاد وطن کا ایک نیا جذبہ جگایا، تحریکِ پاکستان میں بہترین قائدانہ کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ قیامِ پاکستان کے لیے مسلم لیگ کے رہنماؤں سے ملاقات و مذاکرات کیے، دیگر مخالفین کے ساتھ بھی اس حوالے سے مذاکرے کیے، جب قیامِ پاکستان کی تحریک عروج پہ پہنچی تو مفتی صاحبؒ نے ایک نئے اسلامی و فلاحی مملکت کے لیے دار العلوم دیوبند سے استعفیٰ دیا، تحریکِ پاکستان میں اپنی بھرپور توانائی صرف کرنے کے بعد قیامِ پاکستان کے لیے بڑی تگ و دو کی، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس طرف ہجرتِ

کی، بعدازاں وطنِ عزیز مملکتِ خداداد پاکستان کے استحکام وترقی کے لیے بھی بڑی عرق ریزی کی، قرار دادِ مقاصد کے لیے جہدِ مسلسل کی اور اس کے بعد پاکستان کے تعلیمی نظام ونصاب کے حوالے سے اس میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

ابتدائی حالات زندگی:

مفتی محمد شفیعؒ نے برصغیر کے ایک علمی خاندان میں آنکھ کھولی، ان کے والد ماجد مولانا محمد یاسینؒ ہندوستان کے بڑے ناموں میں سے ایک تھے، مفتی محمد رفیع عثمانی اپنے والد ماجد کے ابتدائی حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا آبائی وطن دیوبند ہے، جو ضلع سہارنپور، یوپی میں برصغیر کا مشہور ترین قصبہ ہے، یہیں آپ کی ولادت 1314ھ میں شعبان کی تقریباً 20تاریخ کو ہوئی، شمسی حساب سے یہ جنوری 1897ء تھا"[(1)]۔

مفتی محمد شفیعؒ کے نام کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی رقم طراز ہیں:

"آپ کے دادا نے نام 'محمد مبین' رکھا تھا، لیکن آپ کے والد بزرگوار نے والد کی اطلاع کا خط اپنے شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو لکھا تو حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں نام 'محمد شفیع' تجویز فرمایا"[(2)]۔

تعلیمی زندگی:

ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں حافظ اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

"مفتی محمد شفیعؒ نے پانچ سال کی عمر میں حافظ محمد عظیم صاحب کے پاس دارالعلوم دیوبند میں قرآن کریم کی تعلیم شروع کی، فارسی کی تمام مروجہ کتابیں اپنے والد محترم سے دارالعلوم میں پڑھیں، حساب و فنون اور ریاضی کی تعلیم اپنے چچا مولانا منظور احمد صاحبؒ سے حاصل کی، سولہ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں داخل ہوئے، 1335ھ میں فارغ التحصیل ہوئے"[(3)]۔

مفتی محمد رفیع عثمانی اپنے والد ماجد کی ابتدائی تعلیم کی بابت مزید لکھتے ہیں:

"والد ماجد نے عربی، نحو، صرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی فصول اکبری، ہدایۃ النحو اور منیۃ المصلی تک اپنے والد موصوف سے فارسی تعلیم کے ساتھ ہی پڑھ لی تھیں، اس طرح تعلیم قرآن کے بعد تقریباً پانچ سال فارسی، ریاضی وغیرہ کی پوری تعلیم اور عربی کی ابتدائی کتب میں صرف ہوئے"[4]۔

تدریسی زندگی:

1335ھ میں آپ نے دورہ حدیث کی تکمیل کی، کچھ فنون کی کتابیں باقی تھیں، جن کی تکمیل 1336ھ میں فرمائی، درس نظامی کی مکمل تعلیم سے نہایت ممتاز حیثیت سے فارغ ہوئے، اس وقت عمر 22 سال تھی، اساتذہ کرام اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی نگاہ انتخاب عرصے سے آپ پر تھی، اسی سال آپ کو کچھ اسباق پڑھانے کے لیے سپرد فرمادیے گئے[5]۔

اسی بارے میں حافظ اکبر شاہ بخاری کہتے ہیں:

"حضرت مفتی اعظمؒ نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی کتابوں سے شروع فرمایا، پھر سالہاسال اوپر کے درجات میں تمام علوم و فنون اپنے باکمال اساتذہ کے زیر سایہ پڑھائے۔ حضرت مفتی اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے تو صرف 6 گھنٹے کی پابندی تھی، مگر میں روزانہ 18 گھنٹے کام کرتا تھا۔ بالآخر بزرگوں کی خواہش و ایماء پر آپ کو درجہ علیاء (دورہ حدیث) کے اساتذہ میں شامل کر لیا گیا"[6]۔

مفتی محمد شفیعؒ کی شخصیت پر جن اساتذہ کے گہرے نقوش ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

"جن عظیم المرتبت علماء امت سے آپ نے شرف تلمذ حاصل کیا، ان میں امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، فخر الہند حضرت مولانا حبیب

الرحمٰن عثمانی، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، سید العلماء حضرت مولانا سید اصغر حسین، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی اور حضرت مولانا رسول خان ہزاروی جیسے اکابرین شامل ہیں"(7)۔

بیعت و خلافت:

مفتی محمد شفیعؒ نے بزرگوں اور اولیا کی گہری عقیدت و محبت اپنے والد ماجد سے وراثت میں پائی تھی، جو بزرگوں کے شیدائی اور ان کا زندہ تذکرہ تھے۔

"حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کو آپ پر بے حد شفقت تھی، اگر کسی روز حاضر نہ ہوتے تو دریافت فرماتے تھے، ایک مرتبہ آپ کو بخار ہوا، دو روز تک حاضر نہ ہو سکے، تیسرے روز جب پہنچے تو دیکھا حضرت کہیں جانے کے لیے کھڑے ہیں، معلوم ہوا آپ ہی کے گھر جانے کا قصد فرمایا تھا، اسی عرصے میں آپ نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ حضرت مجھے بیعت فرما لیجیے، ہمیشہ یہی فرمایا کہ طالب علمی سے فارغ ہو جاؤ تو کریں گے"(8)۔

سید قاسم محمود مفتی محمد شفیعؒ کے سلسلۂ بیعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ابتدا میں باطنی تعلق شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے قائم رہا، ان کی وفات کے بعد 1346ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، 1349ھ میں مجازِ بیعت قرار پائے، مفتی محمد شفیعؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علمی، روحانی اور سیاسی جانشین تھے"(9)۔

اسی سلسلے میں مفتی محمد رفیع عثمانی لکھتے ہیں:

"1337ھ میں درس نظامی کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو حضرت شیخ الہندؒ مالٹا جیل میں تھے، ان کی مفارقت آپ پر پہلے ہی بہت شاق تھی، اور اب تو انتہائی صبر آزما بن گئی، حضرت مولانا خلیل احمد

سہارنپوری بھی اس وقت ہندوستان میں تشریف نہ رکھتے تھے، دو بزرگوں پر نظر جاتی تھی، ایک حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ آپ کے والد ماجد کی رائے میں ترجیح اس کو ہوئی کہ حضرت تھانویؒ کی جانب رجوع کیا جائے، کیونکہ سابقہ حاضری اور تعلیم سے ایک مناسبت قائم ہو چکی ہے"[10]۔

اسی بابت احمد سعید کہتے ہیں:

"مفتی صاحب زمانہ طالب علمی سے ہی حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضری کا شرف رکھتے تھے اور حضرت بھی نہایت شفقت فرماتے تھے، اسارت مالٹا سے پہلے دو رمضان آپ کے ساتھ تمام تراویح میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی تھی، مگر اس وقت طالب علمی کی وجہ سے حضرت نے بیعت کرنا پسند نہ فرمایا تھا، حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ کی جانب رجوع کیا اور آپ کے دست مبارک پر تجدیدِ بیعت کی"[11]۔

علمی خدمات:

مفتی محمد شفیعؒ کی علمی خدمات پر سید قاسم محمود روشنی ڈالتے ہیں کہ:

"مفتی صاحبؒ نے درس و تدریس اور خدماتِ افتاء کے علاوہ قرآن و حدیث، فقہی مسائل اور تصوف و اصلاح کے اہم موضوعات پر بے شمار علمی اور دینی تصانیف مرتب فرمائیں، جن کی تعداد دو سو سے زائد ہے، آپ کی تصانیف میں "معارف القرآن کو اعلیٰ مقام حاصل ہے، یہ تفسیر آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے"[12]۔

اسی حوالے سے حافظ محمد اکبر شاہ بخاری بیان کرتے ہیں کہ :

"مفتی محمد شفیعؒ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو سو سے زائد ہے،ان میں سب سے عظیم الشان تالیف قرآن کریم کی تفسیر "معارف القرآن "ہے،جو آٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی،بلاشبہ یہ ان کا زبردست کارنامہ ہے،انہوں نے قانون،دستور،معاشیات،تاریخ اور لغت کے موضوعات پر بیش قیمت کتابیں تالیف کیں،ان کے تحریری فتاویٰ کی تعداد دو لاکھ سے متجاوز ہے،جو شرعی فیصلے زبانی دیے،ان کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی ہو گی،ریڈیو پاکستان سے سالہاسال تک درس قرآن کا نشری سلسلہ اس کے علاوہ ہے"[13]۔

مفتی محمد شفیعؒ کی تصنیفی و تالیفی خدمات پر مولانا عبدالشکور ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ :

"مفتی صاحب نے یوں تو دین کے ہر شعبہ،تفسیر و حدیث،فقہ و عقائد و کلام،معیشت و سیاست ، سیرت و تاریخ،اصلاح وارشاد اور تعلیم و تربیت اور زبانِ ادب میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں،مگر آپ کا خاص موضوع فقہ رہاہے اور اس میں جو خداداد ملکہ وسعت تحقیق کی اور دقت نظری آپ کو حاصل تھی،وہ مفتی صاحب کا ہی خاصہ تھا،صرف علم فقہ میں آپ نے ایک سو کے قریب رسائل تصنیف فرمائے،اسی طرح حضرت کے رشحات قلم سے جو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کراچی میں محفوظ ہیں،ان کی تعداد بھی ایک لاکھ کے قریب ہے[14]۔

علم فقہ میں مفتی محمد شفیعؒ کو جو خداداد بصیرت حاصل تھی اور تفقہ کا جو خاص ملکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تھا،اس کی وجہ سے بجا طور پر آپ کو "مفتی اعظم پاکستان" کے لقب کا اعزاز ملا۔

اس بارے میں مولانا عبد الشکور ترمذی مزید لکھتے ہیں کہ :

"علم تفسیر میں احکام القرآن عربی اور تفسیر معارف القرآن آپ کے لیے عظیم صدقۂ جاریہ ہیں اور ایسے علمی شاہکار ہیں جو معارف قرآنیہ کے پیاسوں کے لیے باعث تسکین بنے رہیں گے اور یہ ایسے عظیم کارنامے ہیں کہ اس صدی میں تو کیا، شاید قریب کی گزشتہ صدیوں میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، باوجود ضعفِ عمر اور انحطاطِ قویٰ اس خدمت کو انجام تک پہنچادینا مفتی صاحب کی کرامات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے، ظاہر ہے کہ تفسیر معارف القرآن کے تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل مضامینِ عالیہ اور معارفِ قرآنیہ کو محققانہ انداز میں بیان کرنا کرامت سے کم نہیں ہے"[15]۔

قیام دار العلوم:

مفتی محمد شفیعؒ کی علمی خدمات میں سب سے نمایاں کارنامہ دار العلوم کے نام سے ایک جدید یونیورسٹی کا قیام ہے، آج بھی دنیا کے گوشے گوشے سے علوم نبوی کے شیدائی آکر جامعہ سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

اس کے آغاز کے بارے میں حافظ اکبر شاہ بخاری بیان کرتے ہیں کہ :

" مفتی صاحبؒ کو دینی علوم کے فروغ کا بڑا احساس تھا، انہوں نے 1370ھ میں نہایت بے سروسامانی کے عالم میں اس کام کا یوں آغاز کیا کہ محلہ نانک واڑہ کی ایک عمارت میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا، جس میں صرف ایک استاد اور چند طلباء تھے، چند ماہ بعد یہ مدرسہ دار العلوم بن گیا اور آج کورنگی میں یہ شاندار دینی درسگاہ ہے، جس میں تقریباً دو ہزار طلباء تحصیل علم میں مصروف ہیں، یہاں قرآن مجید ،حدیث، فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی، علم کلام وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے"[16]۔

تاسیس دارالعلوم کراچی کے حوالے سے حضرت کے جانشین مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ :

"ہجرت پاکستان کے بعد حضرت والد صاحب نے دو کاموں کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا تھا۔ایک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد، دوسرے کراچی میں یہاں کے شایان شان دارالعلوم کا قیام۔

ابتدائی دو سال تو قرار داد مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجہد جو انتہائی بے سروسامانی میں ہو رہی تھی اسی کی مشغولیت اتنی رہی کہ دارالعلوم کے قیام میں کامیابی نہ ہو سکی، پھر اللہ تعالی نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ محلہ نانک واڑہ میں سکھوں کے زمانے کے ایک اسکول کی خالی عمارت دارالعلوم کے لئے عطافرما دی۔اس وقت تک کراچی میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے سوا کوئی مدرسہ نہ تھا، بلکہ پورے پاکستان میں گنے چنے چند ہی مدارس تھے، علوم دینیہ کے طلبہ پریشان تھے۔یہ مدرسہ کھلا تو ملک کے اطراف واکناف سے طلبہ آنے شروع ہو گئے اور چند مہینے کے اندر اندر یہی مدرسہ "دارالعلوم کراچی "بن گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد اللہ تعالی نے کورنگی میں والد صاحب کو چھپن ایکڑ زمین دارالعلوم کے لئے عطاء فرمادی، توجدید تعمیرات بقدر ضرورت مکمل ہو جانے کے بعد دارالعلوم یہاں منتقل فرمادیا۔حضرت والد صاحب کی للہیت کا یہ ثمرہ ہے اللہ تعالی نے اس دارالعلوم کو دنیا کے عظیم دینی مدارس کی صف میں لا کھڑا کیا اور پاکستان کے عظیم ترین دینی اداروں میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے"[(17)]۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیعؒ کے قائم کردہ اسلامی درس گاہ ''جامعہ درالعلوم کراچی'' کا شمار اس وقت عالم اسلام کے بہترین مذہبی تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کو پوری دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیم حاصل کر کے عالم یا مفتی بننے والوں کی پہلی ترجیح جامعہ دارالعلوم کراچی سے مذہبی تعلیم مکمل کر کے یہاں کی ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے۔آج کل

اسلامی دنیا کی اس قابل فخر اسلامی درس گاہ جسے اب اسلامی یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ (مرحوم) کے صاحبزادے مفتی محمد رفیع عثمانی ہیں جنہیں اس وقت مفتی اعظم پاکستان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ملی خدمات:

مفتی اعظم پاکستانؒ طبعاً ہنگاموں، سیاسی جلسوں اور جلوسوں سے الگ رہنا پسند فرماتے تھے، لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کی کسی اہم دینی ضرورت نے سیاست میں عملی حصہ لینے کا تقاضا کیا، آپ اس میں بھی سر گرمی سے بقدر ضرورت شریک ہوئے، پہلی جنگ عظیم کے اواخر میں جب مجاہدین بلقان ہر طرف سے کفر والحاد کے نرغے میں تھے، اس کی نزاکت اکابر علماء دیوبند نے پوری شدت سے محسوس کی، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اپنے تلامذہ اور مریدین کے ذریعے مجاہدین بلقان کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی، یہ وقت حضرت مفتی صاحب کی نو عمری اور طالبعلمی کا تھا، آپ نے اس پر خلوص مہم میں نہایت سر گرمی سے رضاکارانہ حصہ لیا۔

جس زمانے میں آپ دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی اور تدریس کے منصب جلیل پر فائز تھے، اسی زمانے میں مسلم لیگ نے کانگریس کے علی الرغم مسلمانان برصغیر کے لیے ایک آزاد اور خود مختار وطن پاکستان کا مطالبہ کیا، اس موقع پر اکابر علماء دیوبند اپنی دیانت دارانہ رائے کی بناء پر دو مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے، ایک گروہ جمعیت علمائے ہند کے سر کردہ علماء کا تھا، جو کانگریس کے ہم آواز ہو کر متحدہ قومیت کا حامی اور تقسیم ہند کے خلاف تھے اور مطالبۂ پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتا تھا، دوسرا گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیعؒ وغیرہ پر مشتمل تھا، جو حکیم الامت تھانویؒ کی رائے کے مطابق مسلمانان ہند کو کافروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے قیام پاکستان کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتا تھا اور جس طرح کا اشتراک بعض مسلم جماعتیں کانگریس کے ساتھ کرنے لگی تھی، اسے یہ گروہ درست نہیں سمجھتا تھا۔

قیام پاکستان کے معاملے پر اکابرین کے دونوں گروہوں کے اختلاف کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی بیان کرتے ہیں:

> "شروع میں یہ اختلاف آپس کے تبادلہ ء خیالات علمی مباحثوں اور دار العلوم کی چار دیواری تک محدود رہا، لیکن پاکستان کے لیے ہونے والا الیکشن جوں جوں قریب آ رہا تھا، مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ مسلم

لیگ بے دین امراء کی نمائندہ ہے،اسے علماء کی تائید حاصل نہیں،ادھر ارباب مسلم لیگ بھی یہ محسوس کررہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علماء کرام بھرپور تعاون نہ فرمائیں، پاکستان کا قیام ممکن نہیں ہے"[18]۔

قیام پاکستان کے لیے سرگرم جدجہد:

مفتی اعظم پاکستان نے اپنے اکابرین کے ہمراہ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا،انہوں نے دو قومی نظریئے کے فروغ کے لیے مختلف مواقع پر لوگوں کی ذہن سازی کے لئے خطابات کیے، مضامین لکھے،اسی سلسلے میں مفتی محمد شفیعؒ نے فتاویٰ کا سہارا بھی لیا۔

حافظ محمد اکبر شاہ بخاری کہتے ہیں:

"قیام پاکستان کے مسئلے میں عام فتاویٰ اور متفرق مضامین کے علاوہ آپ نے 1364ھ ، مطابق 1945ء میں ایک مستقل رسالہ "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ "تصنیف فرمایا، جس میں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے واضح فرمایا،اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی، جس میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کی موالات، مصالحت اور استعانت کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام بے انتہا محنت اور تفصیل سے جمع کیے گئے، دلائل میں حضرت مفتی اعظمؒ نے اپنی عادت کے مطابق قرآن و سنت اور فقہی عبارات کے نہایت معتمد شواہد پیش کیے اور عقل وسیاست کے ہر پہلو سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ حالات میں کانگریس کی حمایت سے دراصل کفر کی حمایت لازم آئے گی اور اس میں حصہ لینا قرآن وسنت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں"[19]۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

"حضرت مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں اور قیام پاکستان کے بعد بھی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں، آپ نے تحریک قیام پاکستان میں اپنے شیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایماء پر حصول پاکستان کی تاریخی جدجہد میں نمایاں کردار ادا کیا، علامہ شبیر احمد عثمانی کی معیت میں مسلم لیگ کی حمایت میں پورے

ہندوستان کے دورے کیے، مطالبہ پاکستان کی حمایت میں کانگریس اور مسلم لیگ کی شرعی حیثیت میں فتویٰ دیا، جس میں کانگریس کی شمولیت کو کفر کی حمایت قرار دیا گیا"[20]۔

تاریخی کارنامہ قرارداد مقاصد:

قیام پاکستان مسلمانوں کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تھا جس میں اللہ تعالی نے انہیں خصوصی نصرت وحمایت سے نوازا تھا،اب دوسرا مرحلہ یہاں اسلامی نظام حیات قائم کرنے کا تھا چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور انکے رفقاء نے قیام پاکستان کے فورا بعد اسلامی جدوجہد کا آغاز فرمادیا اور یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی دستور کا ایک اجمالی خاکہ مرتب کیا جائے تاکہ حکومت کے سامنے مطالبہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاسکے یہ خاکہ مرتب کرنے کے لئے شیخ الاسلامؒ نے جن اکابر علماء کرام کو خصوصی دعوت دی ان میں حضرت علامہ سید سلمان ندویؒ، مفتی اعظم محمد شفیعؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور جناب ڈاکٹر حمید اللہؒ قابل ذکر ہے ان حضرات نے اسلامی دستور مرتب کرنے کے لئے شب وروز محنت کی ،اور ایک اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کرکے حکومت کو پیش کردیا۔

اس کے بعد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی اعظم نے ایک تاریخی کارنامہ "قرارداد مقاصد " کے نام سے منظور کراکے سرانجام دیا۔قرارداد مقاصد جو پاکستان کے ہر آئین میں بطور دیباچہ چلی آرہی ہے اور 1973ء کے موجودہ آئین میں بھی شامل ہے۔یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کے مقاصد اور قومی جہد وعمل کی سمت قرآن وسنت کی روشنی میں مقرر کی گئی ہے اور ان بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پائے تھے۔اور جن کی پابندی دستور ساز اسمبلی اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی۔ یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا اب تک پاکستان کے دستور وقانون میں جو جو اسلامی دفعات شامل

ہو کر دستور ساز اسمبلی یں آئیں یا آیندہ شامل ہوں گی وہ سب در حقیقت اسی قرار داد مقاصد کی مرہون منت ہیں۔قرار داد مقاصد اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت کے وزیر اعظم شہید ملت لیاقت علی خان مرحوم نے پیش کی تھی مگر اس کا مسودہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے طویل غور خوض کے بعد مرتب فرمایا تھااوراس کے بعد اسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو طویل علمی اور سیاسی جدوجہد کرنی پڑی تھی"[21]۔

وفات:

حضرت مفتی محمد شفیعؒ ایک طویل عرصہ سے دل کی بیماری میں مبتلا تھے اور آپ کے انتقال سے قبل بھی آپکو دل کے کئی دورے پڑ چکے تھے لیکن 5،اکتوبر 1976 کو منگل کی دوپہر پونے دو بجے آپ کے دل میں سخت تکلیف ہوئی، شام کو ادارہ انسداد امراض قلب کے ماہر ڈاکٹر اسلم نے آپ کا معائنہ کیااور پھر اپنے ساتھ ہی جناح اسپتال لے گئے جہاں ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باوجود رات کو بارہ بجکر چوبیس منٹ پر آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔آپ کی جدائی سے جو خلا پیدا ہوا تھا شاید وہ کبھی بھی پر نہ ہو سکے گا۔آپ نے تقریباً تمام عمر دین کی خدمت میں بسر کی آپ حد سے زیادہ منکسر المزاج اور بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھے جو کسی ایک شخصیت میں کم ہی جمع ہوتی ہیں۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن بھی تھے اور ملک و قوم کے سچے بہی خواہ بھی۔

آپ جیسے یگانہ روزگار لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں،آپ ایک منفرد حیثیت اور مقام کے مالک تھے،آپ کے ہزاروں معتقدین نے آپ کی نماز جنازہ حضرت ڈاکٹر عبد الحئ کی امامت میں دار العلوم کورنگی کراچی میں ادا کی پھر آپ کو دار العلوم کی چار دیواری میں واقع قدیم قبرستان لے جایا گیا جہاں ہزاروں اشکبار آنکھوں نے آپ کو بڑے رنج و غم کے ساتھ آپکی آخری آرام گاہ میں اتارا اور پھر یوں اس صدی کے عظیم اسلامی رہنما کی تدفین کی گئی ،اس موقع پر دار العلوم کورنگی کی وسیع و عریض مسجد اور میدان میں حد نگاہ تک لوگ ہی لوگ نظر آرہے تھے جس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحب عام لوگوں میں کس قدر چاہے جاتے تھے۔

بہر حال اسلامی دنیا کی یہ قابل فخر اور قابل تقلید مذہبی شخصیت 6، اکتوبر 1976 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئی اور یوں عالم اسلام ایک بہت بڑے عالم دین سے محروم ہو گیا۔

یہ وہ حالات و کردار ہیں، جن کے پیش نظر مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیعؒ پر ضمناً تو بہت کچھ لکھا گیا، مگر ہمارے علم کے مطابق مفتی صاحب کی خدمات پر کوئی تفصیلی مقالہ آج تک سامنے نہیں آیا، اس لیے شدت سے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ مفتی اعظم پاکستان کی شخصیت پر تفصیلی تحقیقی مقالہ پیش کیا جائے، جس میں ان کی حیاتِ و خدمات کا تفصیلا جائزہ لیا جائے۔

منہج تحقیق اور اس کا اسلوب

مفتی محمد شفیعؒ کی زندگی پر تحقیق کے عمل کے دوران حوالے کی استناد کا خیال رکھا گیا، ان کی شخصیت جس قسم کی ہے، اس لحاظ سے اتنا ہی احتیاط موضوع کا تقاضا ہے، اس لیے اس دوران انہی کتابوں، مصنفوں اور حوالہ جات کا سہارا لیا گیا، جو مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ یا جانشینوں کی نظر میں معتبر سمجھا گیا۔

اس دوران قرآنی آیات کی عبارتوں کا خاص خیار کھا گیا، اس کے ترجمے اور رسم الخط کا بھی حد سے زیادہ اہتمام رکھا گیا، اسی طرح احادیث مبارکہ کو بھی بشری استطاعت کی حد تک بغیر کسی غلطی کے لکھا گیا اور عبارت کی تخریج اور ترجمے کا خاص لحاظ رکھا گیا۔

موضوع کے حوالے سے حتی الامکان اصل مصادر (Basic Sources) سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم بعض مقامات پر بنیادی مصادر کی عدم دستیابی کی صورت میں ثانوی مصادر سے بھی کام لیا گیا اور مقالے کو ایک ہی اسلوب پر رکھنے کی کوشش کی گئی۔

جہاں جہاں حوالے کی عبارت آئی ہے، اسے بین الواوین کر کے دونوں طرف حاشیہ رکھا ہے، اور اگر حوالہ عربی عبارت میں ہو تو اس کا اردو ترجمہ یا مختصر مفہوم ساتھ ساتھ لکھ دینے کی پابندی کی ہے۔ حوالہ جات کو ہر باب کے آخر میں لکھا ہے۔

حوالے میں پہلے مصنف کا نام، پھر کتاب کا نام پھر مکتبہ، پھر مقام اشاعت، پھر سن اشاعت اور پھر صفحہ نمبر دیا ہے۔ اگر کسی

کتاب کا سن اشاعت نہیں تو اس کی جگہ "س،ن" یعنی سن ندارد لکھ دیا گیا ہے۔

اگر ایک ہی باب میں ایک ہی کتاب کا حوالہ دوبارہ آگیا ہو، تو صرف مصنف کا نام، کتاب کا نام اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے اور ساتھ لفظ "محولہ بالا" لکھ دیا گیا ہے۔

اس مقالے کی ترتیب کچھ یوں رکھی گئی:

بابِ اول: مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے سوانحی حالات

- فصل اول: خاندانی پس منظر
- فصل دوم: آبائی وطن، پیدائش اور بچپن
- فصل سوم: تعلیم و تربیت
- فصل چہارم: بیعت و سلوک
- فصل پنجم: سیرت، کردار اور عملی زندگی
- فصل ششم: پسماندگان اور جانشین

بابِ دوم: مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تصنیفی خدمات

- فصل اول: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا تصانیف میں منہج واسلوب
- فصل دوم: تفسیرِ قرآن وعلوم قرآن
- فصل سوم: علم حدیث
- فصل چہارم: فقہی تصانیف
- فصل پنجم: اصلاحی تصانیف

بابِ سوم: مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی علمی خدمات

- فصل اول: مفتی محمد شفیع کی فقہی خدمات
- فصل دوم: مفتی محمد شفیع اور علم حدیث
- فصل سوم: تدریسی خدمات
- فصل چہارم: دار العلوم کراچی کی بنیاد و تاسیس
- فصل پنجم: بورڈ آف تعلیماتِ اسلام اور لاء کمیشن کی رکنیت

بابِ چہارم: مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ملی و سیاسی خدمات

- فصل اول: مفتی محمد شفیع اور سیاست - نظریات و تجربات
- فصل دوم: قیام پاکستان سے قبل سیاسی جدوجہد
- فصل سوم: قیام پاکستان کی تحریک میں کردار
- فصل چہارم: قیام پاکستان کے بعد خدمات

بابِ پنجم: مفتی محمد شفیعؒ.... مشاہیر کی نظر میں

- فصل اول: مشہور معاصر علماء کی نظر میں
- فصل دوم: فرزندان اور جانشینوں کی نظر میں
- فصل سوم: معروف دانشوروں اور مفکرین کی نظر میں
- فصل چہارم: شعراء و ادباء کی نظر میں

مصادر، مراجع وحواشی مقدمہ

(1) شفیع عثمانی، مفتی، میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص ۲۲)۔

(2) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۹ء، (ص ۳۰)۔

(3) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۲۹، ۳۰)۔

(4) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص ۳۳)۔

(5) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص ۴۸)۔

(6) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۳۳)۔

(7) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۳۰)۔

(8) مکاتیب حکیم الامت، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص ۳۰۲)۔

(9) سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، لاہور، مکتبۃ الفیصل، (ج ۲، ص ۱۴۴۶)۔

(10) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص ۵۰، ۵۱)۔

(11) احمد سعید، بزم اشرف کے چراغ، دیوبند-یوپی، دار الکتاب، (ص ۱۶)۔

(12) سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، لاہور، مکتبۃ الفیصل، (ج ۲، ص ۱۴۴۶)۔

(13) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، (ص ۱۳۰)۔

(14) عبد الشکور ترمذی، مفتی، پاک وہند کے نامور علماء و مشائخ، لاہور، ادارہ اسلامیات (ص ۱۶۴)۔

(15) عبد الشکور ترمذی، مفتی، پاک وہند کے نامور علماء و مشائخ، لاہور، ادارہ اسلامیات، (ص ۶۴)۔

(16) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، (ص ۱۳۰، ۱۳۱)۔

(17) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، -ملخصا (ص ۱۸۱-۱۸۵)۔

(18) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۳۹)۔

(19) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۴۰،۴۱)۔

(20) سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، لاہور، مکتبۃ الفیصل، (ج ۲، ص ۱۴۴۶)۔

(21) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۴۳۱ء، (ص ۵۰،۵۱)۔

۱

بابِ اوّل

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ - سوانحی حالات

- فصل اول: خاندانی پس منظر
- فصل دوم: آبائی وطن، پیدائش و بچپن
- فصل سوم: تعلیم و تربیت
- فصل چہارم: بیعت و سلوک
- فصل پنجم: سیرت، کردار، عملی زندگی
- فصل ششم: پسماندگان و جانشین

۱

فصلِ اوّل

خاندانی پس منظر

﴿باب اول: محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے سوانحی حالات﴾

فصل اول: خاندانی پسِ منظر

خاندان اور سلسلۂ نسب:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور یوپی کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کی والدہ ماجدہ سادات میں سے تھیں اور آباءواجداد جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں، دیوبند کے ممتاز اہل علم تھے جو ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف اور اہل قصبہ ان کے معتقد رہے۔

آپ کے سلسلۂ نسب کے بارے میں جناب محمد اویس سرور تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بن حضرت مولانا محمد یاسین صاحب بن خلیفہ تحسین علی صاحب بن میاں جی امام علی صاحب بن میاں جی حافظ کریم اللہ صاحب بن میاں جی خیر اللہ بن میاں جی شکر اللہ صاحب''(1)۔

افسوس کہ ان سے اوپر کے بزرگوں کے حالات معلوم نہیں ہو سکے جس کا ذکر مفتی صاحب نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

''مجھے اپنے خاندان کا کوئی موثق اور باسند نسب نامہ ہاتھ نہیں آیا جس سے خاندان کے صحیح اور مستند حالات معلوم ہوتے مگر شریعت نے ان معاملات میں ''سند متصل'' ہونے کی شرط نہیں رکھی بلکہ بڑے بوڑھوں کی زبان پر عام شہرت کو کافی سمجھا ہے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''تسامع'' کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے بہ تواتر یہ بات سنی ہے کہ ہمارا خاندان حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے(2)۔''

آباء واجداد کے مختصر احوال

ا۔حافظ کریم اللہ صاحب:

آپ کے خاندان کے جد امجد حافظ کریم اللہ ہیں، جن کے متعلق مفتی رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

خاندان کے جد امجد حافظ کریم اللہ صاحب کا اصل وطن قصبہ جوراسی تھا جو قصبہ منگلور کے پاس دیوبند سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ مغلی سلطنت کے زوال اور طوائف الملوکی کے دور میں قصبہ جوراسی کے ہندوؤں نے مسلمانوں پر مظالم کئے۔ حافظ کریم اللہ صاحب یہاں کے مسلمانوں کی فریاد لے کر نجیب الدولہ کے پاس نجیب آباد پہنچے۔

تو نجیب الدولہ کی ریاست کی طرف سے ایک کمک ان کی مدد کو پہنچی جس سے فتنہ دب گیا مگر جد امجد حافظ کریم اللہ صاحب کا دل یہاں کی حکومت سے اٹھ چکا تھا اس لئے مع اپنے خاندان کے دیوبند منتقل ہو گئے۔ دیوبند کے محلہ ''شاہ رمزالدین'' کی مسجد میں لگے ہوئے ایک قطعہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۸۳ھ میں یہ بزرگ دیوبند منتقل ہو چکے تھے کیونکہ یہ فارسی قطعہ جو پتھر پر کندہ ہے حافظ کریم اللہ صاحب ہی کا ہے۔ اس کے دوسرے مصرعہ میں ''خانہ حق، حق رمزالدین بود'' ہے انہوں نے تاریخ ۱۱۸۳ھ نکالی ہے۔ اس وقت تک دارالعلوم دیوبند قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کا قیام اس تاریخ کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۲۸۳ھ میں عمل میں آیا۔

غرض حافظ کریم اللہ صاحب خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو دیوبند منتقل ہوئے یہاں ان کی نسل ان کے صاحبزادے میاں جی امام صاحب سے چلی''(3)۔

۲۔ میاں جی امام علی صاحب:

حافظ کریم اللہ کے فرزند میاں جی امام علی تھے، جن کے احوال مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے یوں تحریر کیے ہیں:

حضرت میاں جی امام علی صاحب زندگی بھر درس وتدریس میں مشغول رہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کی عمراور تعلیم میں ایسی برکت عطافرمائی کہ قصبہ دیوبند کا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو جو ان کا شاگرد نہ ہو۔اس لئے یہ بزرگ ''میاں جی'' کے لقب سے معروف ہوئے اوران کی پہلی اولاد ''خلیفہ'' کے نام سے مشہور ہوئی[4]۔

لفظ ''میاں جی'' کا پسِ منظر:

بعض پرانے بزرگوں کے نام کے ساتھ لفظ "میاں جی" آتاہے،اس کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''قصبات ودیہات میں پھیلے ہوئے عام مکاتب جن میں قرآن کریم کی تعلیم کے بعد اردو فارسی، حساب ،ریاضی کی تعلیم کا عام رواج تھا جو آج کل ہائی اسکول کی تعلیم سے زیادہ معیاری تعلیم تھی،اس کے ایسے اساتذہ''میاں جی'' کے لقب سے معروف ہوتے تھے جو دینی تعلیم کے ساتھ عملی تقدس کے حامل ہوں جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے شیخ ''میاں جی نور محمد صاحب'' بھی لوہاری میں معروف ہوئے اور میاں جی ''منے شاہ صاحب'' دیوبند میں صاحب کشف وکرامت بزرگ ہوئے ہیں۔حافظ کریم اللہ صاحب کی اولاد میں میاں جی امام علی صاحب کی بھی اسی طرح دیوبند میں عام شہرت ہوئی۔

میاں جی امام علی صاحب کے پانچ صاجزادے تھے: جعفر علی، شجاعت علی، منیر علی، شبیر علی، تحسین علی[5]۔

۳۔ خلیفہ تحسین علی صاحب:

میاں جی امام علی صاحب کے صاحبزادے خلیفہ تحسین علی صاحب جو کہ مولانا محمد یسین کے والد تھے، ان کے متعلق مفتی محمد رفیع صاحب لکھتے ہیں:

''میاں جی امام علی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دیوبند میں اچھی زمینداری عطا فرمائی تھی جو ان کے صاحبزادوں میں تقسیم ہوئی۔ صاحبزادوں میں سے اکثر تو سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ خلیفہ تحسین علی صاحب آنکھوں سے معذور ہو جانے کے سبب کوئی ملازمت نہ کر سکے۔ زمین کا جو حصہ میراث میں ان کو ملا تھا اس پر تنگی کے ساتھ متوکلانہ گزران تھا۔ بعد میں وقتی ضرورتوں سے مجبور ہو کر کچھ زمین بھی فروخت کرنا پڑی تو تنگدستی اور بڑھ گئی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے، حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب اور منشی منظور احمد صاحب۔

اولاد کو دینی تعلیم دلانے کا شوق بہت تھا۔ اپنے لائق فرزند حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب کو اول گھریلو مکتب میں قرآن مجید حفظ کرایا، پھر اسی مکتب میں اردو فارسی، حساب، ریاضی کی مروجہ تعلیم دلائی اور اب وہ اس قابل تھے کہ اپنے معذور والد کا ہاتھ بٹا سکیں لیکن معذور باپ نے فقر وفاقہ کی زندگی اختیار کی اور ان کو دار العلوم دیوبند میں اعلیٰ دینی عربی تعلیم کے لئے داخل کر دیا۔ سعادت مند بیٹے نے بھی تعمیل حکم میں اس فقر وفاقہ کی حالت میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا''[6]۔

۴۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے احوال میں مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''مولانا محمد یٰسین صاحب کے دو صاحبزادے ہوئے:

ایک احقر کے والد مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے ''جناب محمد رفیع صاحب'' جن کا انتقال کم عمری ہی میں ہو گیا تھا۔ تین بیٹیاں تھیں مگر نرینہ اولاد میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب ہی اکلوتے رہ گئے تھے، جن کے متعلق مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا ایک ہی بیٹا چار کے برابر ہے (7)۔

حافظ محمد اکبر شاہ بخاری نے اپنی کتاب "اکابرین وفاق المدارس" میں مولانا یسین صاحب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب نور اللہ مرقدہ دار العلوم دیوبند کے ہم عصر تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی جو ان کے تاریخی نام ''افتخار'' سے ظاہر ہے اور دار العلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۳ھ میں ہوا۔ اس طرح ان کو دار العلوم دیوبند کا قرن اول نصیب ہوا۔ فارسی ادب کی اعلیٰ تعلیم مولانا منفعت علی صاحب مدرس دار العلوم دیوبند سے حاصل کی جو مشہور شاعر غالب کے شاگرد تھے، عربی درس نظامی کی تعلیم دار العلوم دیوبند کے قرن اول کے اکابر علماء سے حاصل کی جن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، ملا محمود صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو سب سے زیادہ مناسبت اور عقیدت و محبت تھی، استفادہ بھی سب سے زیادہ ان ہی سے کیا (8)۔

مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اپنے دادا مولانا محمد یٰسین صاحب کے زمانۂ طالبعلمی کے احوال بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا محمد یٰسین صاحب نے طالبعلمی کا پورا زمانہ عسرت اور تنگدستی میں بسر کیا، ایک روز آپ گرمی کی دوپہر میں دار العلوم کے اسباق سے تھک تھکا کر چھٹی کے وقت گھر پہنچے تو والدہ نے آبدیدہ ہو کر اپنے لائق فرزند سے کہا:

"بیٹا آج تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے البتہ ہماری زمین میں گندم کی فصل تیار کھڑی ہے، اگر تم اس میں سے کچھ گندم کاٹ لاؤ تو میں ان کو صاف کر کے آٹا پیس کر روٹی پکا دوں گی"۔

سعادت مند بیٹا محنت اور بھوک سے درماندہ اسی گرمی کی دوپہر میں اپنی زمین کی طرف چل دیا اور وہاں سے جس قدر بوجھ اٹھا سکتا تھا اتنے گندم کاٹ کر لے آیا۔ والدہ نے ان کو کوٹ کر چھان پیس کر آٹا بنایا اور روٹی پکائی۔ اس طرح ظہر کے وقت تک بھوک کا کچھ سامان ہوا۔ ظہر کے بعد اپنے اسباق کے لئے چلے گئے۔ ماں باپ اور بیٹے نے اسی فقر وفاقہ میں وقت گذارا مگر تعلیم میں فرق نہ آنے دیا"[9]۔

مولانا محمد یٰسین کے مختصر احوال بیان کرتے ہوئے حافظ اکبر شاہ بخاری رقم طراز ہیں:

"انھیں دار العلوم کے ابتدائی دور کے ممتاز علماء کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، جن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، ملا محمود دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مہتمم دار العلوم حضرت مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ ان کے ہم سبق رہے۔ حصول تعلیم کے بعد وہ دار العلوم سے ہی بحیثیت استاد وابستہ ہو گئے تھے اور تقریبا چالیس سال تک تعلیم وتدریس میں مشغول رہے۔ بہت سے جلیل القدر علماء اور محدثین ان کے شاگردوں میں شامل ہیں جن میں حضرت مولانا سید اصغر حسین محدث رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد یٰسین شیر کوٹی رحمۃ اللہ علیہ، امام اہل حدیث مولانا ثناء اللہ امر تسری رحمۃ اللہ علیہ خصوصا قابل ذکر ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے دار العلوم کا وہ دور دیکھا ہے کہ جب اس کے مہتمم سے لے کر دربان تک سب ہی صاحب نسبت ولی اللہ تھے[10]۔

بیعتِ سلوک:

جیسا کہ گذشتہ تحریر میں تذکرہ ہو چکا کہ آپ کو بچپن ہی سے صحبت اہل اللہ نصیب ہوئی جس کی وجہ سے آپ کا قلبی لگاؤ اس وقت کے اہل اللہ کے ساتھ تھا اور زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ سلوک کے منازل طے کرنے لگے تھے، اس کے متعلق مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "میرے والد ماجد اوران کے مجرب عملیات" میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب کو زمانہ طالب علمی ہی سے فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے خاص محبت وعقیدت تھی۔ درس نظامی سے فراغت کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور سلوک کی منازل طے کرنے لگے، یہ میری پیدائش سے تقریباً چودہ سال پہلے کا واقعہ ہے"[11]۔

آپ کا درس اور تلامذہ:

تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے تھے، آپ کی تدریسی زندگی کے بارے میں مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ فارسی میں صدر مدرس تھے مگر خارجی اوقات میں کچھ عربی کے اسباق بھی آخر حیات تک جاری رہے، فارسی درس کی انتہائی کتابیں نہایت شوق اور کامل تحقیق سے پڑھاتے تھے۔ان کے یہ درس اتنے مقبول تھے کہ ان میں بعض فارغ التحصیل علماء بھی شریک ہوتے تھے''[12]۔

آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے جناب محمد اکبر شاہ بخاری رقم طراز ہیں:

''آپ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ طالب علم کے قلب میں ابتداًء ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس انبیاء علیہم السلام کی محبت اور بزرگانِ دین کی عقیدت جاگزیں ہو جاتی تھی، تدریس کا یہ سلسلہ چالیس برس سے زیادہ جاری رہا، دیوبند میں تعلیم یافتہ حضرات میں ایسے بہت کم لوگ تھے جو آپ کے حلقہ درس کے فیض یافتہ نہ ہوں اور بعض خاندان میں تو باپ بیٹا اور پوتا سب آپ کے شاگرد تھے، دور دراز ممالک سے آنے والے بہت سے طالب علم بھی تعلیم فارسی یا عربی میں آپ کے تلامذہ میں داخل ہیں۔

آپ کے ممتاز شاگردوں میں صاحب کشف و کرامات ولی اللہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا یٰسین صاحب شیر کوٹی رحمۃ اللہ علیہ اور اہل حدیث کے مشہور عالم دین مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں''[13]۔

تصانیف:

آپ نے اپنی تدریسی مصروفیات اور مطالعہ و کتب بینی کے باوجود اپنا تعلق کسی نہ کسی درجے میں تصنیف و تالیف سے بھی قائم رکھا اور اس سلسلے میں کچھ مفید رسائل تحریر فرمائے، جن کا ذکر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے "میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات" میں کیا ہے:

''(۱) مفید نامہ جدید۔ (۲) جدید صفوۃ المصادر۔ (۳) مفید اصاغر و اکابر۔ (۴) رسالہ نادر۔ (۵) شرح صفوۃ المصادر۔ (۶) انشاء فارغ''[14]۔

نیز مفتی محمد رفیع صاحب ان تصانیف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''یہ سب کتابیں فارسی کے طلباء کے لئے نہایت مفید ہیں، بار بار طبع ہوئیں اور دار العلوم دیوبند سمیت متعدد مدارس میں داخل نصاب رہیں''[15]۔

مرض وفات:

آپ کے مرض وفات اور وفات کے احوال کا ذکر کرتے ہوئے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

مرض وفات میں دو ماہ تک ورم جگر اور کثرت اسہال کی شدید تکلیف اور بخار میں مبتلا رہے مگر لاٹھی کے سہارے مسجد میں پہنچتے رہے، جب اس کی بھی سکت نہ رہی تو مجبوراً ۵۶ دن کی نمازیں گھر ہی پر ادا کرنی پڑیں۔ اپنے لائق فرزند (حضرت مفتی صاحب) سے ایک روز فرمانے لگے ''شفیع'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں انھی دستوں میں ختم ہو جاؤں گا، مگر کچھ غم نہیں کیونکہ حدیث میں اس کو بھی شہادت فرمایا گیا ہے[16][17]۔

نیز آپ کی تاریخ وفات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

آپ کی وفات دیوبند میں ۹/صفر المظفر ۱۳۵۵ھ کی صبح کو بروز جمعہ ہوئی، کل عمر تہتر سال ہوئی۔۔۔ جدامجد کی وفات پر حضرت مفتی شفیع صاحب نے ایک مرثیہ عربی اور ایک اردو میں کہا تھا، جو ''کشکول''[18] میں شائع ہو چکا ہے[19]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ:

مفتی محمد شفیع صاحب کی والدہ محترمہ بہت نیک اور عبادت گذار خاتون تھیں، آپ کے پوتے مفتی محمد رفیع صاحب اپنے مضمون "حضرت مفتی اعظم کے آباءواجداد" میں آپ کے مختصر احوال ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ سادات میں سے تھیں اور غالباً وہ بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھیں، بیوہ ہو جانے کے بعد تاحیات اپنے سعادت مند بیٹے کے ساتھ رہیں، لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں مگر نماز روزہ اور عبادت کا بڑا اہتمام فرماتی تھیں، ضروری کاموں سے فراغت کے بعد بیشتر وقت ذکر اور نماز کے انتظار

میں گزرتا تھا، سامنے گھڑی رکھی رہتی اور ان کی نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھتی رہتی تھیں جب بینائی بہت کمزور ہو گئی تو جو بھی سامنے سے گزرتا اس سے پوچھتی رہتیں، "بیٹے کیا بجا ہے؟" اذان میں کتنی دیر ہے؟

کثرت ذکر کی وجہ سے آخر حیات میں یہ حال ہو گیا تھا کہ باتیں کر رہی ہوں یا خاموش لیٹی ہوں، ہر سانس کے ساتھ اندر سے خود بخود "اللہ اللہ" کی آواز آتی رہتی تھی، جس کا احساس انھیں ہو یا نہ ہو، مگر سب اہل خانہ ہمیشہ اس کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔

سب بچوں کو بزرگوں کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں سنایا کرتی تھیں، پاکستان تشریف لانے کے بعد بھی تقریباً گیارہ سال حیات رہیں، ۱۳۸۱ھ میں انتقال ہوا۔ تاریخ وفات "مادر علامہ مفتی شفیع" نکالی گئی اور دارالعلوم کراچی کورنگی قبرستان میں سب سے پہلی قبر انھی کی بنی"[20]۔

فصل دوم: آبائی وطن، پیدائش و بچپن

۲

فصلِ دوم

آبائی وطن، پیدائش و بچپن

فصلِ دوم: آبائی وطن، پیدائش و بچپن

آبائی وطن:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی وطن دیوبند ہے جو ضلع سہارنپور — یوپی میں برصغیر کا مشہور ترین قصبہ ہے۔

دیوبند کیا ہے؟ اس کے متعلق خود مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "نقوش و تاثرات" میں تحریر فرماتے ہیں:

"دیوبند کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا قصبہ سہارنپور کا جس کو نہ جغرافیائی اور عمرانی حیثیت سے کوئی خاص شہرت حاصل ہے، نہ تجارتی یا صنعتی اعتبار سے۔ ہاں اس خوش نصیب خطہ میں علومِ اسلامیہ کا ایک عظیم دار العلوم ہے جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد علوم اسلامیہ کو اپنی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لئے ایک گوشۂ خمول کی حیثیت میں قائم کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حسن قبول عطا فرمایا، اور مرکزِ علوم بنا دیا اور اس سے پیدا ہونے والے رجال اللہ اس آخری صدی کے مجدد ثابت ہوئے۔ اسی طرح دیوبند اس دورِ انحطاط میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ بن گیا۔

دیوبند کا نام اس دار العلوم سے چمکا، اور دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا، یہ ادارہ دن میں علوم اسلامیہ کی ایک درس گاہ تھی اور رات میں ذاکر و شاغل حضرات کی خانقاہ"(21)۔

ولادتِ باسعادت اور بچپن:

مفتی محمد شفیعؒ نے برصغیر کے ایک علمی خاندان میں آنکھ کھولی، ان کے والد ماجد مولانا محمد یاسینؒ ہندوستان کے بڑے ناموں میں سے ایک تھے، مفتی محمد رفیع عثمانی اپنے والد ماجد کے ابتدائی حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا آبائی وطن دیوبند ہے، جو ضلع سہارنپور، یوپی میں برصغیر کا مشہور ترین قصبہ ہے، یہیں آپ کی ولادت 1314ھ میں شعبان کی تقریباً 20 تاریخ کو ہوئی، شمسی حساب سے یہ جنوری 1897ء تھا''[22]۔

مفتی محمد شفیعؒ کے نام کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی رقم طراز ہیں:

"آپ کے دادا نے نام "محمد مبین" رکھا تھا، لیکن آپ کے والد بزرگوار نے والد کی اطلاع کا خط اپنے شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو لکھا تو حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں نام "محمد شفیع" تجویز فرمایا"[23]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بچپن کے بارے میں مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بزرگان دین کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں پائی تھی، کھیل کود کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ آپ کی عادت تھی کہ جب بھی موقع ملتا، اپنے والد بزرگوار کے ساتھ اکابر علماء و صلحاء کی بابرکت مجلسوں میں جا بیٹھتے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کی مجلس میں حاضری اکثر ہوا کرتی تھی''[24]۔

ابتدائی تعلیم:

آپ کی ابتدائی تعلیم کے حوالے سے آپ کے تذکرہ نگار حافظ محمد اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

''آپ کے والد بزرگوار کی خواہش تھی کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کرائیں، کچھ پارے حفظ کر بھی لئے تھے، مگر جسمانی طور پر بچپن سے کمزور تھے، حفظ کی محنت برداشت نہ ہو سکی، مگر چند پارے جو اس وقت حفظ کر لئے تھے عمر بھر ان کو یاد رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ یہ پارے اکثر نفلوں اور تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔

قرآن کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دار العلوم ہی میں خط و املاء کی مشق اور فارسی کی تمام مروجہ کتابوں کی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی، حساب اور فنون ریاضی اقلیدس وغیرہ اپنے چچا جناب منشی منظور احمد صاحب مدرس دار العلوم دیوبند سے پڑھے اور فن تجوید اپنے عربی علوم کے رفیق درس جناب قاری محمد یوسف صاحب میرٹھی سے (جو عرصہ دراز تک آل انڈیا ریڈیو سے تلاوت قرآن فرماتے رہے) حاصل کیا''[25]۔

نیز آپ کے فرزندِ مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"عربی نحو وصرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی ''فصول اکبری''، ''ہدایۃ النحو''، اور '' منیۃ المصلی'' تک اپنے والد موصوف سے فارسی تعلیم کے ساتھ ہی پڑھ لی تھی، اس طرح تعلیم قرآن کے بعد تقریباً پانچ سال فارسی، ریاضی وغیرہ کی پوری تعلیم اور عربی کی ابتدائی کتب میں صرف ہوئے"[26]۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق آپ کے علمی جانشین مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''والد ماجد کم سنی ہی میں دار العلوم میں داخل ہو چکے تھے اور ابھی آپ کی عمر دس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ تعلیم و تعلم کا باقاعدہ مشغلہ اپناتے ہوئے اپنے وقت کے ان اکابر علماء و عبقری شخصیات سے علم دین حاصل کرنا شروع کر دیا تھا، جن کی فراست و بصیرت کا ڈنکا پورے ہندوستان و اطراف میں سنائی دیتا تھا''[27]۔

فصل سوم: تعیم وتربیت

۳

فصلِ سوم

تعلیم وتربیت

فصل سوم: تعلیم و تربیت

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق فصل دوم میں مختصر اتذکرہ ہو چکا ہے، آپ کی باقاعدہ درس نظامی کی تعلیم کے بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن کریم پڑھنے کے بعد ۱۳۲۵ھ میں دار العلوم دیوبند داخل ہوئے اس وقت یہ ادارہ پورے ہندوستان میں علوم دینیہ اور معارف اسلامیہ کی نشر واشاعت کا سب سے بڑا دینی جامعہ تھا، جس نے مغربی استعمار کے باعث دین کے مٹتے ہوئے نقوش کو ایک بار پھر زندہ کیا اور انھیں جلا بخشی، اللہ تبارک وتعالی نے اس کی بنیادوں میں شامل اکابر علماء دیوبند کے اخلاص اور للّٰہیت اور اپنے جذبہ قربانی سے کفر وضلال کے اس غبار آلود ماحول میں فضائے بدر پیدا کی، جس کے نتیجے میں اس خطے میں علم اور نور کا ایسا سیلاب آیا جس کے بعد بدعات و خرافات اور جہالت و گمراہی تنکوں کی طرح بہہ گئے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کم سنی ہی میں دار العلوم میں داخل ہو چکے تھے اور ابھی آپ کی عمر دس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ تعلیم و تعلم کا باقاعدہ مشغلہ اپناتے ہوئے اپنے وقت کے ان اکابر علماء وعبقری شخصیات سے علم دین حاصل کرنا شروع کر دیا تھا، جس کی فراست وبصیرت کا ڈنکا پورے ہندوستان واطراف میں سنائی دیتا تھا''[28]۔

درس نظامی اور آپ کے چند مشہور اساتذہ:

دار العلوم دیوبند میں آپ کی درس نظامی کی تعلیم کے متعلق مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

"۱۳۳۰ھ میں جب آپ کی عمر سولہ سال تھی،اصول فقہ اور ادب وغیرہ کی متوسط کتابیں دار العلوم دیوبند کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخل ہو کر شروع فرمائیں۔

آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں ہر طرف علم و عرفان اور زہد و تقویٰ کے وہ بے مثل پہاڑ تھے جن کی رگ رگ سے علوم و معارف کے بے شمار چشمے نکل کر عالم اسلام کو سیراب کر رہے تھے،اس روح افزا ماحول میں آپ نے جن یکتائے روزگار اساتذہ سے استفادہ کیا،ان کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کا جنید، کرخی،ابن حجر،رازی اور غزالی بنایا تھا آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

''اگر ہم اپنے بزرگوں کے تجرِ علمی اور باطنی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کرتے تو ہمیں اپنے قدیم اسلاف،تابعین، تبع تابعین کے حیرت ناک دینی کمالات کا مشاہداتی علم نہ ہو سکتا''[29]۔

طلب علم میں انہماک:

مفتی محمد شفیع صاحب نے زمانۂ طالبعلمی میں جس محنت اور جانفشانی سے وقت صرف کیا وہ اپنی مثال آپ ہے،اس کا ذکر مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے اپنی کتاب ''حیاتِ مفتی اعظم'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"علمی ذوق آپ کی زندگی کے ہر شعبہ پر ہمیشہ غالب رہا،زمانہ طالب علمی میں آپ جس انہماک اور جانفشانی سے اپنے اسباق کی طرف ہمہ تن متوجہ رہے اس کی مثالیں دور حاضر میں نایاب ہیں۔

عربی تعلیم باقاعدہ شروع فرمانے کے وقت سے دار العلوم ہی گویا آپ کا گھر تھا،اسباق سے فارغ ہو کر اپنے ہم سبقوں کو روزانہ کے اسباق کا اس طرح تکرار (اعادہ) کراتے تھے کہ استاذ کی تقریر کا پورا چربہ اتر جاتا تھا،آپ کا تکرار طلبہ میں بہت مقبول تھا"[30]۔

آپ کا طلباء سے مذاکرہ و تکرار کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"طلباء اتنی اہمیت سے اس تکرار میں شریک ہوتے کہ مستقل ایک درس کی سی صورت بن جاتی، حضرت نے ایک مرتبہ طلبہ دارالعلوم کراچی کو جن میں راقم الحروف [مفتی رفیع عثمانی مدظلہ] بھی موجود تھا، تکرار کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

''میں مقامات کے تکرار میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی پوری تقریر کا اعادہ اسی ترتیب سے کیا کرتا تھا جس طرح استاذ محترم نے بیان کی تھی، بعض اوقات استاذ محترم میری لاعلمی میں میرا تکرار سنتے اور مجھے بعد میں پتہ چلتا کہ وہ سن کر بہت خوش ہوئے ہیں''۔

اکثر صبح کو دارالعلوم جا کر رات ہی کو واپسی ہوتی اور بعض اوقات رات کو بھی وہیں مولسری کے درخت کے نیچے کھلے فرش پر سو جاتے۔ تکرار عموماً رات کو ہوتا تھا اور جب گھر واپسی ہوتی تو کبھی رات کا ایک بج جاتا کبھی دو۔ حضرت نے دارالعلوم کراچی کے طلبہ کو ایک مرتبہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''رات کو والدہ میرا انتظار کرتی تھیں کہ کھانا گرم کر کے دیں، ان کے انتظار میں مجھے تکلیف ہوتی تھی، بڑی منت سماجت سے اس پر راضی کیا کہ میرا کھانا ایک جگہ رکھ دیا کریں، سردیوں کی راتوں میں شوربہ اوپر سے بالکل جم جاتا اور نیچے سے صرف پانی رہ جاتا، میں وہی کھا کر سو جایا کرتا''(31)۔

زمانۂ طالبعلمی کے بعض رفقاء:

زمانۂ طالبعلمی میں آپ کے دوستانہ تعلقات اور اعزہ واقارب سے میل جول کے بارے میں محمد اویس سرور صاحب رقم طراز ہیں:

''دیوبند آپ کا وطن تھا اور تمام اعزہ وا قارب کے گھر یہیں تھے لیکن طالب علمی میں ان کے یہاں جانے کا وقت بھی نہ ملتا، نہ محلے کے ہم عصر لڑکوں سے دوستانہ تعلقات کی نوبت آئی، حتیٰ کہ آپ کو دیوبند کے جواب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے تمام راستے بھی بخوبی معلوم نہ تھے''(32)۔

علمی ذوق و شوق اور ذہانت:

آپ کے علمی ذوق و شوق اور اساتذہ کرام کی آپ پر شفقت کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''تعلیمی انہماک کے باعث کسی اور کام کی فرصت ہی نہ تھی، جب کچھ وقت ملتا حضرت شیخ الہند کی خدمت میں جا بیٹھتے، آپ کی ذہانت علمی ذوق و شوق اور صلاح و تقویٰ کے باعث آپ کے اساتذہ کی مشفقانہ توجہ ہمیشہ آپ پر مرکوز رہی۔

ایک مرتبہ حضرت نانوتوی کے مخصوص شاگرد و مرید اور مدرسہ عبد الرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبد العلی صاحب دار العلوم تشریف لائے۔ معزز مہمان اور دوسرے اساتذہ کرام کے ساتھ دار العلوم کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کھڑے تھے۔ قریب سے حضرت والد صاحب بغل میں کتابیں دبائے گذرنے لگے تو مہتمم صاحب نے بلالیا اور معزز مہمان سے فرمایا:

''یہ دار العلوم کا ایسا طالب علم ہے کہ اسے اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں، نہ اپنے کپڑے کی خبر ہے، نہ جان کی، کتاب کا کوئی سوال پوچھو تو محققانہ جواب دے گا''۔

مولانا عبد العلی صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا:

''یہ تو مولوی محمد یٰسین صاحب کا لڑکا معلوم ہوتا ہے''۔

مولانا کا قیافہ مشہور تھا''(33)۔

مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب آپ کی ذہانت کے حوالے سے ایک اور واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ شرح جامی کا امتحان شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے پاس تھا، اس وقت تک آپ نے کوئی کتاب مولانا سے نہیں پڑھی تھی، تحریر سے نہ پہچان سکے، آپ کا نہایت ممتاز اور محققانہ پرچہ دیکھ کر حیرت و مسرت ضبط نہ کر سکے، پرچہ لے کر فوراً مہتمم صاحب کے پاس آئے اور پوچھا یہ کون طالب علم ہے اس نے تو اس کتاب کی شرح تصنیف کر دی ہے۔ یہ سنتے ہی مہتمم صاحب فرط مسرت سے امتحان گاہ تشریف لائے، حضرت والد صاحب اس وقت کسی اور امتحان کا پرچہ لکھ رہے تھے۔ آپ کو بلا کر تمام طلبہ کے سامنے کھڑا کیا اور آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پرچہ کی غیر معمولی خوبی کا اعلان فرمایا''[34]۔

مشہور اساتذۂ کرام:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے وقت کے جن جید علماء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل کی، ان سب کا ذکر کرنا تو یہاں مشکل ہے، البتہ محمد اویس سرور صاحب نے مختصراً چند اساتذہ کرام کے نام ان الفاظ میں ذکر کئے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنے کمال علم اور پختگی کردار سے قرون اولیٰ کی وہ داستانیں تازہ کر دی تھیں جن پر تاریخ انسانی ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، آپ کے اساتذہ کرام میں یہ حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

(۱) فخر المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) مفتی مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (صاحبِ ''عزیز الفتاویٰ'')۔

(۳) سابق مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد احمد صاحب بن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) عارف باللہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۶) شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس اللہ سرہ۔

(۷) جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا رسول خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۸) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ ''(35)۔

فصل چہارم: بیعت و سلوک

٤

فصلِ چہارم

بیعت و سلوک

فصل چہارم: بیعت و سلوک

اخلاق و عادات کی درستگی کے لئے شیخِ کامل کی صحبت:

چونکہ یہ بات واضح ہے کہ معاملات اور معاشرت کی درستی کے لئے صرف کتابی علم کافی نہیں اور نہ کوئی نظری فلسفہ معاون ہو سکتا ہے، اس کا ظاہری اسباب میں ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان ایک عرصہ کسی متبع سنت اور صاحب بصیرت شیخ کامل کی صحبت میں رہ کر ان معاملات کی تربیت لے، اس کے متعلق مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا ارشاد یہ ہے:

''صرف ایسے شیخ کامل کی صحبت میں جا بیٹھنا، اس کے ملفوظات و مواعظ سن لینا اور اس کے بتائے ہوئے اوراد و اشغال پر عمل کر لینا بھی اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان طرز معاشرت اور درستی معاملات کا انداز سیکھنے کی نیت سے اپنے شیخ کے طرز عمل کا بغور مشاہدہ کرے، اور خود اپنی زندگی کے معاملات اس کے سامنے پیش کر کے اس سے ہدایت حاصل کرے، تب جا کر اس معاملے میں ایسا مذاق پیدا ہوتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکے''(36)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الہند:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بزرگوں اور اولیا کی گہری عقیدت و محبت اپنے والد ماجد سے وراثت میں پائی تھی، جو بزرگوں کے شیدائی اور ان کا زندہ تذکرہ تھے، چنانچہ "مکاتیب حکیم الامت" میں ہے:

''حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کو آپ پر بے حد شفقت تھی، اگر کسی روز حاضر نہ ہوتے تو

دریافت فرماتے تھے،ایک مرتبہ آپ کو بخار ہوا،دوروز تک حاضر نہ ہوسکے،تیسرے روز جب پہنچے تو دیکھا حضرت کہیں جانے کے لیے کھڑے ہیں،معلوم ہوا آپ ہی کے گھر جانے کا قصد فرمایا تھا،اسی عرصے میں آپ نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ حضرت مجھے بیعت فرمالیجیے،ہمیشہ یہی فرمایا کہ طالب علمی سے فارغ ہو جاؤ تو کریں گے ''[37]۔

سید قاسم محمود مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ بیعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ابتدا میں باطنی تعلق شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے قائم رہا،ان کی وفات کے بعد 1346ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے،1349ھ میں مجازِ بیعت قرار پائے،مفتی محمد شفیعؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علمی،روحانی اور سیاسی جانشین تھے''[38]۔

اسی سلسلے میں مفتی رفیع عثمانی لکھتے ہیں:

"1337ھ میں درس نظامی کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو حضرت شیخ الہندؒ مالٹا جیل میں تھے،ان کی مفارقت آپ پر پہلے ہی بہت شاق تھی،اوراب تو انتہائی صبر آزما بن گئی،حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری بھی اس وقت ہندوستان میں تشریف نہ رکھتے تھے،دو بزرگوں پر نظر جاتی تھی،ایک حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ آپ کے والد ماجد کی رائے میں ترجیح اس کو ہوئی کہ حضرت تھانویؒ کی جانب رجوع کیا جائے،کیونکہ سابقہ حاضری اور تعلیم سے ایک مناسبت قائم ہو چکی ہے"[39]۔

اسی بابت جناب احمد سعید کہتے ہیں:

"مفتی صاحب زمانہ طالب علمی سے ہی حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضری کا شرف رکھتے تھے اور حضرت بھی نہایت شفقت فرماتے تھے، اسارت مالٹا سے پہلے دور مضان آپ کے ساتھ تمام تراویح میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی تھی، مگر اس وقت طالب علمی کی وجہ سے حضرت نے بیعت کرنا پسند نہ فرمایا تھا، حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ کی جانب رجوع کیا اور آپ کے دست مبارک پر تجدید بیعت کی"[40]۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس دور میں آنکھ کھولی اُس دور میں مجددِ ملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے سلوک و تربیت کا چرچا تھا، آفاقِ عالم سے تشنگانِ علم سلوک آپ کے پاس آکر راہِ سلوک کی منزلیں طے کر رہے تھے، آپ کا طریقہ کار اور مطمح نظر کیا تھا، اس کے متعلق حافظ اکبر شاہ بخاری صاحب لکھتے ہیں:

"حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے سلوک و طریقت میں جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا، اس کا ایک اہم حصہ معاملات اور معاشرت کی تعلیم و تربیت تھی۔ اس حقیقت سے کسی بھی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معاملات اور معاشرت دین کا اہم جزء ہیں، چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی جو تربیت فرمائی اس میں عقائد، عبادات اور اخلاق وغیرہ کے علاوہ معاملات و معاشرت کی مفصل تربیت بھی شامل ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں اور اس کے بعد بھی بیعت وارشاد کے سلسلے میں صرف اوراد و اشغال کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مسترشد کو اتباع سنت کی تربیت کا اہتمام ہوتا تھا جس میں معاملات و معاشرت کی تربیت بھی داخل تھی، پھر رفتہ رفتہ اس پہلو پر زور کم ہوتا گیا، یہاں تک کے لوگ دین کو

صرف عبادات اور تصوف کو صرف اوراد و اشغال میں منحصر سمجھنے لگے اور آخر زمانے میں یہ حالت ہو گئی کہ مسترشد کو ذکر و شغل کے چند مراحل طے کرانے اور مصنوعی ذرائع سے قلب و نظر میں کچھ کیفیات پیدا کرانے کے بعد یہ باور کرایا جانے لگا کہ سلوک و طریقت کا مقصد حاصل ہو گیا، خواہ اس کے معاملات کتنے فاسد، اخلاق کتنے خراب اور معاشرت کتنی مردم آزار ہو"(41)۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلوک و تربیت میں تجدیدی کارنامے:

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارناموں کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

"حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس طریق میں تجدیدی کارنامہ انجام دیا کہ جو لوگ آپ سے اصلاح کا تعلق قائم کرتے انھیں دین کے تمام شعبوں کی متوازن تربیت دیتے، اور چونکہ معاملات و معاشرت کو لوگوں نے دین سے بالکل ہی خارج سمجھ لیا تھا اس لئے ان کی اصلاح پر زیادہ توجہ مرکوز فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت کے متوسلین میں معاملات کی صفائی اور حسن معاشرت کا وصف ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے"(42)۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلوک و تربیت کا مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر اثر:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی تعلق کی کئی جہتیں تھیں، اس کے متعلق سید قاسم محمود صاحب رقم طراز ہیں:

"ابتداء میں باطنی تعلق شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے قائم رہا، ان کی وفات کے بعد ۱۳۴۶ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ ۱۳۴۹ھ میں مجاز بیعت قرار پائے، مفتی محمد شفیع مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، روحانی اور سیاسی جانشین تھے"(43)۔

نیز مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''یوں تو جتنے حضرات خانقاہ تھانہ بھون سے فیض یاب ہوئے ان سب نے اپنے شیخ کا یہ رنگ اپنے ظرف کے مطابق اپنایا، لیکن اس سلسلے میں حضرت والد قدس سرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اول تو آپ کو حضرت کے ساتھ معاملات بہت پیش آئے، جوہر شناس شیخ نے اپنے گوہر قابل کو ہر لحاظ سے جلا بخشنے کے لئے اس سے ہر طرح کے کام لئے، اور اپنی گوناں گوں مصروفیات میں سے تقریباً ہر ایک میں شریک یا کم از کم اس سے باخبر رکھا مسلمانوں کے اجتمائی مسائل ہوں یا مخالفین کے ساتھ برتاؤ حکومت وسیاست کے ساتھ معاملات ہوں، یا کتابوں کی نشرواشاعت وغیرہ کے قصے، علمی مسائل کی تحقیق ہو یا تصنیف وتالیف، گھریلو معاملات ہوں یا رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ تعلق کے مسائل، حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ان تمام چیزوں میں آپ کو اپنے مشوروں میں شریک رکھا جن کا اصل مقصد ان تمام معاملات کی تربیت تھی۔

دوسری طرف حضرت والد صاحب نے اپنے شیخ کو جو مکاتیب لکھے ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ والد صاحب کی زندگی کا کوئی قابل ذکر معاملہ ایسا نہیں تھا جو آپ نے حضرت کی خدمت میں پیش کرکے آپ سے ہدایت طلب نہ فرمائی ہو، بلکہ ان مکاتیب میں اذکار واشغال کی تلقین اور باطنی کیفیات کے مقابلے میں معاملات ومعاشرت سے متعلق سوالات کہیں زیادہ ہیں اور ان سوالات کے جواب میں حضرت کی طرف سے مفصل ہدایت موجود ہیں۔ ''اشرف المکاتیب'' یا ''مکاتیب حکیم الامت'' کے نام سے جو خطوط البلاغ میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں، وہ اصل مکاتیب کا نصف سے بھی کم حصہ ہیں، اور وجہ یہی ہے کہ نصف سے زائد مکاتیب گھریلو معاملات، مختلف اشخاص کے ساتھ طرز عمل اور اس قسم کے نجی امور پر مشتمل ہیں جن کی اشاعت مناسب نہ تھی، یہ غیر شائع شدہ خطوط زیادہ تر معاملات ہی سے متعلق ہیں۔

تیسرے خود حضرت والد صاحب کو اس طرف خصوصی توجہ تھی کہ مسلمانوں کے اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی معاملات، دوست، دشمن کے ساتھ برتاؤ، تنازعات کے تصفیے، میل جول کے انداز، مخالفت وموافقت کی حدود، نرمی و سختی کے مواقع اور ان جیسے دوسرے امور میں اپنے شیخ کے طرز فکر و عمل کا بغور مشاہدہ کر کے اس سے اپنی زندگی میں سبق لیں۔ حضرت والد صاحب خود تواضعاً فرمایا کرتے تھے کہ:

''میں تھانہ بھون میں کثرت عبادت اور ذکر وشغل کی اس نعمت سے تو خاطر خواہ حصہ نہ لے سکا جس سے دوسرے حضرات فیض یاب ہوئے، لیکن بفضلہ تعالیٰ حضرت کے انداز معاملات ومعاشرت کو اس طرح بغور پڑھنے کا موقع ملا ہے کہ وہ انداز دل و نگاہ میں سما گیا ہے۔''

ان تمام باتوں کا نتیجہ تھا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے خصوصی مشرب و مذاق کے اس پہلو کو آپ نے جس طرح جذب فرمایا وہ حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں آپ کا ایک انفرادی امتیاز ہے"[44]۔

فصل پنجم: سیرت، کردار اور عملی زندگی

۵

فصل پنجم

سیرت، کردار اور عملی زندگی

فصل پنجم: سیرت، کردار اور عملی زندگی

حقیقتِ علم:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص چاہے کتنی علمی استعداد کا مالک ہو اس کی شخصیت میں رعب، جاذبیت، عبقریت اس کی سیرت، کردار اور عملی زندگی سے آتی ہے، عمل کی وجہ سے ہی بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے کوئی نمونہ بن سکتا ہے، علمی استعداد کا مالک اگر عمل سے تہی دامن ہو تو وہ در حقیقت کھوکھلا شخص ہے؛ کیونکہ علم کا اثر عمل ہے، اور جس علم کا اثر خود اس کی ذات میں نہ ہو تو وہ دوسروں کی ذات میں کیسے آسکتا ہے۔

آپ کی شخصیت کے اندر علم کی حقیقت کتنی حد تک تھی، اس بارے میں آپ کے سوانح نگار جناب اکبر شاہ بخاری تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ کی شخصیت بنیادی طور پر ایک عملی شخصیت تھی، آپ کی ساری عمر درس وتدریس اور تصنیف وافتاء جیسے کاموں میں بسر ہوئی۔ کتب بینی کے شوق اور ذوق مطالعہ کے بارے میں اس دور میں ان کی نظیریں کم ہی ملیں گی، لیکن اس زبردست علمی انہماک کے باوجود یہ حقیقت ہر آن آپ کے ذہن میں مستحضر رہتی تھی کہ یہ کتابی علم اور وسعت مطالعہ محض ایک خول ہی خول ہے، اور جب تک اس میں عمل اور خشیت اللہ کی روح پیدا نہ ہو، اس وقت تک انسان خواہ کتنا بڑا عالم اور محقق بن جائے، اس کی ساری علمی تحقیقات بے وزن اور بے جان رہتی ہیں۔
>
> حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:

"اگر صرف علم کسی شخص کی عظمت کے لئے کافی ہوتا تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہوتا، اور وہ مستشرقین جو دن رات علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں، وہ بھی بہت سے مسلمان اہل علم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ایسے علم کی قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے جو انسان کو ایمان کی دولت نہ بخش سکے، اسی طرح جو علم انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز نہ ہو وہ بیکار ہے"(45)۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی جانشین مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ:

"میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ تنہا علم فضیلت کا معیار ہوتا تو ابلیس سب سے افضل ہوتا؛ کیونکہ اس کے پاس علم بہت تھا، لیکن وہ علم بھی کس کام کا جو اللہ کی نافرمانی اور معصیت کے ساتھ حاصل ہو، لہذا علم وہی ہے جو اللہ کی فرمانبرداری کے ساتھ حاصل کیا جائے"(46)۔

انانیت اور خود نمائی سے نفرت:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ باوجود ایک علمی شخصیت ہونے کے خود نمائی سے نفرت کرتے تھے اور آپ کے اقوال وافعال سے یہ بات سامنے والے کو واضح طور پر محسوس ہوتی تھی کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ انتہائی عاجزانہ شخصیت کے مالک ہیں، آپ کی اس خوبی کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"کہنے کو یہ بات کہتے ہیں کہ "عمل کے بغیر علم بیکار ہے"، لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی زندگی میں یہ بات پیوست ہو چکی ہو، حضرت والد صاحب کی ادا ادا میں یہ حقیقت جلوہ گر نظر آتی تھی، علم و تحقیق کے کام سے اس درجہ وابستگی کے باوجود آپ کو اس علم و تحقیق سے نفرت تھی جو انانیت اور خود بینی پیدا کرے"(47)۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

''لوگ مدرسہ میں پڑھانے کے لئے مشاہیر محققین تلاش کرتے ہیں، لیکن مجھے ایسے متواضع اللہ والے چاہییں جو علمی تکبر، خود رائی اور خود پسندی سے پاک ہوں اور اپنے شاگردوں کو مسلمان بنا سکیں، خواہ علم و تحقیق میں ان کا پایہ کسی قدر کم کیوں نہ ہو''(48)۔

اسی سلسلہ میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''خود آپ کا یہ حال یہ تھا کہ علم و تحقیق کے اس مقام بلند کے باوجود جو اس دور میں خال خال ہی کسی کو حاصل ہوا ہے، آپ کے اپنے کسی علمی کارنامے پر کوئی ناز پیدا ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا، اپنی بڑی سے بڑی خدمت کو ہیچ سمجھتے رہے، انسان کو عام طور سے اپنی تحریروں اور اپنے لکھے ہوئے مضامین سے ایک اُنس پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ مصنفین میں عام طور سے یہ شوق پایا جاتا ہے کہ ان کی تالیفات کا تذکرہ کیا جائے، انھیں سراہا جائے، بہت سے مصنفین کی محفلیں اپنی تصانیف ہی کے ذکر اور ان کی تعریفوں سے لبریز ہوتی ہیں۔

بعض لوگ جابجا اپنی تالیفات کے حوالے دے کر ان کے اقتباسات لوگوں کو سناتے رہتے ہیں، کبھی کسی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کرنے کا اصل کام وہی تھا جو اس نے سرانجام دے دیا، حضرت والد صاحب قدس سرہ کے یہاں اس قسم کی باتوں کا نہ صرف یہ کہ کوئی سوال نہیں تھا، بلکہ آپ کو اس قسم کے ہر طرز عمل سے سخت کراہیت تھی، آپ بڑے سے بڑا تالیفی کام کر گزرنے کے باوجود اسی فکر میں رہتے کہ نہ جانے اس کا حق ادا ہوا یا نہیں؟ محض لوگوں کی تعریف سے آپ کو خوشی حاصل نہ ہوتی، ہاں! اگر کسی جگہ سے یہ اطلاع ملتی کہ فلاں کتاب سے فلاں شخص کو کوئی عملی فائدہ پہنچا ہے، اس کی زندگی میں تبدیلی آئی ہے، یا اس کے نظریات بدلے ہیں تو آپ بہت خوش ہوتے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، اور خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی دعا فرماتے''(49)۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

''اگر ہم خیال لوگوں سے کچھ داد وصول ہو جائے تو کیا فائدہ؟ اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی تھی اسے فائدہ پہنچا یا نہیں؟''(50)۔

اخلاق وعادات اور معاملات:

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق وعادات کے متعلق مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج مذاق کے بیان میں اخلاق وعادات اور معاملات ومعاشرت ایسے موضوع ہیں جن پر کچھ لکھنا مجھے ہمیشہ بہت مشکل نظر آیا ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کے مزاج ومذاق کو کماحقہ بیان کرنے سے میں اپنے آپ کو بالکل عاجز پاتا ہوں، یہاں ''معاملات'' سے میری مراد صرف بیع وشراء وغیرہ کے معاملات، یا مالی امور نہیں ہیں، بلکہ ہر وہ کام ہے جس میں انسان کو کسی دوسرے سے واسطہ پڑتا ہو، حقوق العباد کی ادائیگی، دوست دشمن کے ساتھ تعلقات کی نوعیت، مخالف وحمایت کی حدود، مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں طرز عمل، نرمی سختی کے مواقع، مختلف حقوق وفرائض میں توازن اور ان کی حدود کی رعایت، یہ ساری باتیں ''معاملات'' میں داخل ہیں۔

اس وسیع مفہوم کے تحت خوش اخلاقی ''معاملات کی سلامتی'' اور ''معاشرت کی خوبی'' کہنے کو تو بہت مختصر اور آسان الفاظ ہیں، لیکن جب انسان فکر وبصیرت کے ساتھ اُن الفاظ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عام تعلقات میں داخل ہوتا ہے، اور اس کے جزوی واقعات سامنے آکر متعارض تقاضے ابھرتے ہیں تو جگر، خون پتہ پانی ہوتا ہے''(51)۔

عبادات:

دوسری صفات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی نے حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو عبادات کا خاص ذوق عطافرمایا تھا، اگرچہ آپ کی زندگی تدریس، فتوی، تصنیف، وعظ و تقریر اور سیاست سے پر تھی، مگر اس کے باوجود نفلی عبادات کا آپ کے ہاں خاص اہتمام تھا، اس بات کی گواہی آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے دی ہے، چنانچہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی رقمطراز ہیں:

"اگرچہ آپ کی ساری زندگی تلاطم خیز تھی کہ صبح سے شام تک کے تمام اوقات مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے تھے، سیاست، انتظامی بکھیڑے، وعظ و تقریر، تدریس اور فتویٰ، تصنیف وتالیف، خدمت خلق، غرض دینی خدمات کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا، جس پر آپ کا مؤثر حصہ نہ ہو اور ان میں سے ہر شعبہ شب و روز کے تمام اوقات اسی پر وقف کر دینے کا متقاضی تھا، آپ فجر کے بعد سے جو کام میں لگتے تو رات کے بارہ بارہ بلکہ ایک ایک بجے تک انتھک مصروف رہتے تھے، عصر کے بعد جب لوگ ذہنی سکون کی خاطر کسی تفریح میں لگتے یا گھر ہی میں فراغت کے ساتھ بیٹھتے تو آپ کا قلم اس وقت بھی چلتا رہتا، کبھی ڈاک لکھی جا رہی ہے، کبھی فتوؤں کا جواب دیا جا رہا ہے، کبھی امانتوں کا حساب و کتاب در پیش ہے، غرض جب آپ سونے کے لئے لیٹتے تو جسم تھکن سے چور اور ذہن منتشر افکار کی آماجگاہ ہوتا تھا۔

اس لئے اس ذہنی انتشار کی حالت میں یکسوئی کے ساتھ عبادت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کے باوجود تہجد، اشراق چاشت، صلاۃ الاوابین، تلاوت قرآن، مناجات مقبول اور کم از کم ایک گھنٹے کے اور اد و وظائف کا معمول التزاماً پورا فرمایا کرتے تھے۔

دیو بند کے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ حضرت والد صاحب نے عبادت ہی کے لیے مختص فرمایا ہوا تھا۔ جسے سب اہل خانہ حجرہ کہتے تھے اور آخر شب میں وہاں تہجد کے بعد تک ذکر کا معمول تھا۔ اس کے علاوہ اشغال جب نسبتاً کم ہوتے تو ان معمولات میں اضافہ ہو جاتا اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ذکر اس کے علاوہ تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہمیشہ آپ کو اپنی عبادت کی کمی پر حسرت ہی کرتے دیکھا، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے نام آپ جو مکاتیب اپنے حالات کے سلسلے میں تحریر فرماتے، ان میں بھی بار بار اس حسرت کا اظہار ہے کہ مجھے دوسرے مشاغل کی بنا پر اکثار ذکر و عبادت کا موقع ہی نہیں ملتا، یہاں تک حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اسی قسم کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا:

''اکثار ذکر سے جو مقصود ہے وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کو تقلیل میں بھی حاصل ہے[52]۔''

ذکر واذکار:

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر واذکار کا اجمالی تذکرہ پچھلے اقتباسات میں ہو چکا، آپ کے ذکر واذکار میں کثرت کا سلسلہ عمر کے آخری حصہ میں بھی جاری رہا۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

''عمر کے آخری حصے میں جب ضعف انتہا کو پہنچ چکا تھا اور بینائی جواب دے گئی تھی تو دوسرے مشاغل سے یکسو ہو کر ذکر میں مشغول رہنے کی آرزو اللہ تعالیٰ نے پوری فرما دی تھی۔ چنانچہ ان دنوں آپ کا بیشتر وقت ذکر اللہ ہی میں صرف ہوتا تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک روز حضرت والد صاحب نے اپنے معالج ڈاکٹر صغیر ہاشمی صاحب سے فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب! اس ضعیفی کی بناء پر دوسرے مشاغل سے تو بیکار ہو ہی گیا تھا، البتہ ذکر و تسبیح کا موقع مل جاتا تھا، مگر کچھ روز سے ضعف ایسا ہے کہ زبان کی حرکت سے بھی ضعف بڑھ جاتا ہے، اس کا بڑا افسوس ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''حضرت! آپ کو زبان کی حرکت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ قلب سے ذکر فرمالیا کریں''، اس پر حضرت والد صاحب نے فرمایا:

''بحمد اللہ اس کی تو توفیق ہو جاتی ہے، مگر ذکر لسانی کو بھی دل چاہتا ہے''[53]۔

نماز:

تمام عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے، جس شخص کی نماز اہتمام کے ساتھ، آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا ہوتی ہو، اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ہاں باقی عبادات کا بھی اسی طرح اہتمام ہوتا ہوگا، حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی نماز اسلاف کی نماز کا نمونہ تھی، جس طرح کی نماز کا تذکرہ اکابر کی کتب میں مذکور ہے آپ کی نماز اسی کا ایک عملی نمونہ تھی، چنانچہ ''میرے والد میرے شیخ'' میں مذکور ہے:

''نماز سے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو خاص شغف تھا، اور جن لوگوں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ نماز کے دوران آپ پر عجز و نیاز، خضوع و خشوع اور خشیت و انابت کی ایسی عجیب کیفیت طاری رہتی تھی جو شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم جیسے کور ذوق حواس باختہ لوگوں کو تو اس کا ادنی ادراک بھی مشکل ہے آپ نے خود اپنے شیخ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''آخر شب کے نوافل میں بحمد اللہ اکثر شوق و رغبت اور سکون و طمانیت نصیب ہوتا ہے اور بعض اوقات کیفیت گریہ حالت اضطرار کو پہنچ جاتی تھی لیکن چونکہ یہ حالت مستمر نہ رہتی تھی اس لئے میں اس کو خمود ہی سے تعبیر کرتا تھا، آج دفعتاً خیال ہوا کہ مبادا یہ ناشکری میں داخل ہو، اس لئے اصل حقیقت عرض کر دی۔ آخر شب میں طول قیام اور طول سجود میں ایک خاص لذت پاتا ہوں اور جس رکن کو شروع کرتا ہوں، جب تک تھک نہ جاؤں اس سے منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا''[54]۔

نماز سے خصوصی تعلق کا اندازہ حضرت کے ایک لطیف ارشاد سے کیا جاسکتا ہے، عام لوگوں کی عادت ہے کہ اکثر جب کوئی اہم کام سامنے ہوتا تو یہ جملہ کہہ دیتے ہیں کہ "ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں پھر وہ کام کریں گے" ایک روز حضرت مفتی صاحب نے یہ جملہ سنا تو فرمایا:

"ارے بھائی، نماز کوئی فارغ ہونے والی چیز نہیں ہے، اس سے فراغت حاصل کرنے کی فکر نہیں چاہیے بلکہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے"[55]۔

اس کے بعد آپ نے قرآن کریم کی اسی آیت کی طرف متوجہ فرمایا جو ہم شب روز پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس کی حقیقت کی طرف کبھی دھیان نہیں ہوتا، فرمایا کہ قرآن کریم نے حضور سرور دو عالم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۝٧ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَب ۝٨﴾[56]۔

ترجمہ: "پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو (اللہ کی عبادت میں) تھکو اور اپنے پروردگار کی طرف رغبت کا اظہار کرو"۔

فرمایا کہ اس آیت میں حضور ﷺ سے خطاب ہو رہا ہے کہ آپ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر عبادت الہیٰ میں اپنے آپ کو تھکائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اصلی یہ عبادت ہے اور اس سے جلد از جلد فارغ ہو کر دوسرے کاموں میں لگنے کی نیت ٹھیک نہیں اس کے بجائے نیت یہ ہونی چاہیے کہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر نماز اور عبادت کی طرف متوجہ ہوں[57]۔

استغفار، شکر، دعا اور تعلق مع اللہ:

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ میں یہ تمام صفات موجود تھیں، آپ کے اعزاء و اقارب ہی ان باتوں کو محسوس کرتے تھے، چنانچہ آپ کے صاحبزادے لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان چار عبادتوں نے آپ کی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہوا تھا اور ذرا ذرا سی باتوں پر استغفار، شکر اور استعاذے کے کلمات آپ کی وردِ زبان رہتے تھے۔ خاص طور سے جب ادائے شکر کی نوبت آتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کے انعامات کے تصور سے آپ پر بے خودی سی طاری ہو گئی ہے۔ اور آپ کا پورا وجود عجز و نیاز کے ساتھ ادائے شکر میں مصروف ہے آپ ناگوار واقعات میں بھی قابل شکر پہلوؤں کو مستحضر رکھنے بلکہ ان کی کثرت سے ذکر کے عادی تھے۔ تکلیف دہ واقعات کی شکایت کا تو دستور ہی نہ تھا"(58)۔

استخارہ:

دو راستوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب ایک مشکل امر ہے، مگر ہر انسان کسی نہ کسی طریقے سے اس کو سر انجام دے ہی دیتا ہے، مگر کمال یہ ہے کہ کوئی شخص باوجود اپنی علمی برتری کے خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر بسجود ہو کر اپنی بے کسی کا اظہار کرے اور اس سے ہدایت طلب کرے، حضرت مفتی اعظم اس میدان کے بھی شہ سوار تھے، چنانچہ آپ کے تذکرہ نگار فرماتے ہیں:

"جب کبھی آپ کو کسی معاملے میں تردد ہوتا اور یہ فیصلہ کرنے کا مرحلہ آتا، کہ دو راستوں میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے تو چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر کے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا

کر کے ہدایت طلب فرماتے ،اس کے بعد کوئی فیصلہ کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے اور کرتے رہنے کا معمول تھا''(59)۔

عبادات میں ایذائے مسلم سے اجتناب:

حقیقت میں عبادت اس وقت عبادت کہلاتی ہے، جب اس عبادت سے کسی دوسرے مسلمان کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس شب بیداری سے رات کا سونا افضل ہے جس میں سوئے ہوئے لوگوں کی نیند خراب ہو، حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی اس کا خوب اہتمام تھا کہ عبادات میں کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو، ذیل میں اس کے متعلق آپ کے برخوردار کی کتاب "میرے والد میرے شیخ" سے ایک طویل اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''عبادات میں آپ کو اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ اپنی کسی عبادت کی وجہ سے دوسروں کو کوئی ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، خاص طور سے غیر واجب عبادات میں اس بات کا پورا لحاظ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ عبادت واجب نہیں، لیکن کسی مسلمان کو ایذا سے بچانا فرض ہے لہٰذا ایک غیر واجب کی ادائیگی کے لئے فرض کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے، چنانچہ آپ تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اس بات کا اہتمام کرتے کہ کسی دوسرے کی نیند خراب نہ ہو، عموماً قرآءت بھی آہستہ فرماتے۔

البتہ رمضان المبارک کی راتوں میں سحری سے پہلے جو نفلیں پڑھتے ان میں عموماً بلند آواز میں قراءت کا معمول تھا اور اب خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان کے عشرہ اخیر میں آپ اپنے گھر والوں کو بھی جگانے کا اہتمام فرماتے تھے۔

آپ اس بات سے بھی حتی الوسع پرہیز فرماتے تھے کہ آپ کی وجہ سے کسی مسجد میں نماز کو اپنے مقررہ وقت سے مؤخر کیا جائے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اہل مسجد کی طرف سے آپ کو یہ پیشکش کی گئی مگر آپ نے اسے کبھی پسند

نہیں فرمایا، اور اگر مقررہ وقت میں مسجد پہنچنے میں کوئی عذر ہوا تو مسجد کے بجائے اپنی جماعت الگ کر لینے کو ترجیح دی۔

دارالعلوم کی مسجد میں نماز ظہر کا جو وقت مقرر تھا وہ آپ کے معمولات کے لحاظ سے مناسب نہ تھا۔ آپ عموماً ایک بجے تک دارالعلوم کے دفتر میں بیٹھے کام کرتے رہتے تھے اور اس سے پہلے اٹھنا آپ کے لئے ممکن نہ تھا اور ایک بجے کے بعد تھکن اتنی ہو جاتی تھی کہ مزید بیٹھنا مشکل ہوتا تھا، چنانچہ آپ ایک اور ڈیڑھ بجے سے دو یا ڈھائی بجے تک نماز کا انتظار آپ کے لئے بہت دشوار ہوتا تھا۔ اور اس دوران کھانا آپ کے لئے مضر صحت تھا۔

اس بناء پر ہم لوگوں نے بھی اور دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ و منتظمین نے بھی بارہا عرض کیا کہ نماز کا وقت مقدم کر کے ڈیڑھ بجے کر دیا جائے، تاکہ آپ دفتر سے اٹھتے ہی نماز پڑھ سکیں۔ یہ صورت آپ کے لئے بے حد سہولت کا باعث ہوتی لیکن آپ نے کبھی یہ منظور نہیں فرمایا۔ اور ہمیشہ اس بناء پر انکار فرما دیا کہ عام اساتذہ طلبہ کی سہولت کا وقت وہی ہے کیونکہ وہ بارہ بجے چھٹی ہونے پر کھانا کھا کر آرام کرتے ہیں اور اٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، نماز کو مقدم کرنے سے ان کے آرام میں خلل واقع ہو گا۔ چنانچہ سالہا سال آپ نے اس مشقت کو برداشت کیا کہ دو ڈھائی بجے تک نماز کا انتظار کر کے نماز کے بعد کھانا کھاتے۔

اور آخر عمر میں جب دل کی تکلیف کی وجہ سے اس مشقت کو برداشت کرنا ممکن ہی نہ رہا تو آپ نے عذر کی بناء پر انفراداً نماز پڑھنے کو ترجیح دی اور وقت بدلنا کسی قیمت پر گوارا نہ فرمایا اور وقت بدلنے کی پیشکش کو ہمیشہ یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ:

"محض اپنے عمل بالعزیمہ کی خاطر میں پورے مدرسے کو تکلیف میں نہیں ڈال سکتا، میں کمزور ہوں اور اللہ تعالیٰ نے جو رخصت عطا فرمائی ہے اس پر عمل کرنا میرے لئے اہون ہے"[60]۔

رخصت وعزیمت پر عمل:

رخصت وعزیمت دونوں ہی شریعت ہیں، مگر کبھی کسی انسان کے لئے یہ بات باعث امتحان بن جاتی ہیں کہ اس موقع پر رخصت حاصل ہے یا نہیں؟ وہ خوب تحقیق کئے بغیر ہی رخصت پر عمل کر بیٹھتے ہیں حالانکہ انھیں رخصت حاصل نہیں ہوتی، حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ نگاروں نے اس باب میں بھی حضرت کا مذاق واضح کیا ہے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

''عزیمت ورخصت کے باب میں بھی حضرت والد صاحب کا مذاق یہ تھا کہ اس بات کی پوری تحقیق اور اطمینان فرمالیتے تھے کہ اس حالت میں شرعاً رخصت حاصل ہے یہ نہیں؟

لیکن جب کسی وقت رخصت کا اطمینان ہو جاتا تو رخصت پر بھی اسی انشراح کے ساتھ عمل فرماتے۔ جس انشراح کے ساتھ عزیمت پر عمل فرماتے تھے۔ حدیث نبوی ہے کہ:

"إن الله يُحبّ أن تُؤتىٰ رُخَصه كما يُحبّ أن تؤتىٰ عزائمه"[61].

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کو رخصتوں پر عمل بھی اسی طرح پسند ہے جس طرح عزیمت پر''۔

اس حدیث پر آپکا پورا عمل تھا، دوسروں کو نصیحت فرماتے ہوئے آپ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے۔

چوں کی بر میخت بہ بندو، بستہ باش

چوں کشاید، چابک و برجستہ باش

لیکن اس بات کا اطمینان کرتے وقت کہ شرعاً رخصت حاصل ہے یا نہیں؟ آپ انتہائی باریک بینی سے کام لیتے اور جب تک آپ کو مکمل اطمینان نہ ہو جاتا، رخصت پر عمل نہ فرماتے۔ بیماری کے دوران اگر ذرا سا بھی شبہ ہوتا کا تیمم جائز ہے یا نہیں؟ آپ وضو ہی فرماتے، خواہ اس کے لئے کتنی مشقت اٹھانی پڑے۔

آخر عمر میں معالجین اس بات پر متفق تھے کہ روزہ رکھنا آپ کے لئے مضر ہے لیکن ہر رمضان میں اس بات پر اصرار فرماتے کہ میں کم از کم ایک روزہ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس سے مرض میں کوئی اشتداد پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس غرض کے لئے آپ نے چپکے چپکے سحری بھی کھالی، جب ہمیں علم ہوا اور ہم نے احتجاج کیا تو فرمایا کہ: ''مجھے روزہ رکھ کر دیکھنے تو دو'' ہم نے عرض کیا کہ ''آپ تو دوسروں کو ''إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَىٰ رُخَصُهُ''[62] والی حدیث اکثر سنایا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں اسی بات کا تو اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ رخصت واقعةً حاصل ہے یا نہیں؟ جب یہ اطمینان ہو جائے گا تو وعدہ کرتا ہوں کہ پھر روزہ رکھنے پر اصرار نہیں کروں گا۔ چنانچہ سحری ہی میں ڈاکٹر صاحب کو فون کیا گیا، ان سے والد صاحب نے وہی بات فرمائی کہ میں تجربتہً روزہ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ یہ تجربہ آپ کے لئے سخت مضر ہو سکتا ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی مضرت پہنچ گئی تو پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ بات سننے کے بعد آپ نے ہتھیار ڈال دیئے اور پھر اصرار نہیں فرمایا''[63]۔

دعوت و تبلیغ اور اس کے متعلق آپ کے خاص نظریات:

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی کے بیشتر شعبے دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت ہی سے متعلق تھے، جن میں عوام و خواص دونوں کو تبلیغ حق کے کام شامل تھے۔ اور تبلیغ دعوت کے اصولوں کے بارے میں آپ کا ایک سوچا سمجھا نظریہ تھا، جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

''پیغمبرانہ دعوت کے چند اصول:

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص یہ ہیں:

(۱)امت کی فکر:

"انبیاء علیہم السلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو اپنی امت کی اصلاح کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ لگ جاتی ہے کہ وہ طبعی تقاضوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ جب پیغمبر اس فکر میں گھلنے لگتے ہیں تو اللہ تعالی کی طرف سے تسلی کا سامان کیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝٣﴾ (64)۔

ترجمہ: ''شاید آپ اس غم میں اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں کہ یہ لوگ مومن کیوں نہیں بنتے''۔

لہذا داعیٔ اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کو اس پیغمبرانہ فکر کا کوئی حصہ نصیب ہو۔ چنانچہ اسلاف امت میں سے جن جن کو اس فکر کا جتنا حصہ ملا، اللہ تعالی نے ان کی دعوت میں اتنی برکت عطا فرمائی اور اتنے ہی بہتر ثمرات پیدا فرمائے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت و تبلیغ کا ایسا تقاضہ ہوتا تھا جیسا بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے کا تقاضا ہوتا ہے، جس طرح انسان ان طبعی تقاضوں سے صبر نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ دعوت کے مواقع پر دعوت سے صبر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں تاثیر بھی ایسی عطا فرمائی کہ ان کے ایک ایک وعظ سے سینکڑوں انسان بیک وقت تائب ہوتے تھے"[65]۔

(۲) دعوت کی لگن:

"انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا دوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر دعوت میں لگاتار مشغول رہتے ہیں اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر کہے چلے جاتے ہیں، جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو اچھی بات پہنچانے کا کوئی موقع مل جائے وہ اسے غنیمت سمجھ کر اپنی بات پہنچا ہی دیتے ہیں۔

حضرت والد صاحب اس کی مثال میں فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھیے کہ وہ مدت سے عزیز مصر کی قید میں محبوس ہیں، گرد و پیش میں کوئی ہم نوا نہیں، اس حالت میں جیل کے دو ساتھی خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آتے ہیں، سوال کا کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں ہے لیکن ان کے جواب میں پہلے تو انھیں مطمئن فرما دیتے ہیں کہ تمھارے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے اور میں تمھیں بتا بھی دوں گا مگر پہلے ایک بظاہر قطعی غیر متعلق بات شروع کر دیتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ:

﴿ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَهُم بِٱلْـَٔاخِرَةِ هُمْ كَـٰفِرُونَ ۝٣٧

وَٱتَّبَعْتُ مِلَّةَ ءَابَآءِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ ﴾[66]۔

ترجمہ: ''بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے آباء واجداد میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) کے دین کی پیروی کی ہے''[67]۔

اور:

﴿ يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ ﴾[68]۔

ترجمہ: ''اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق پروردگار (ماننا) بہتر ہے یا وہ اللہ جو ایک ہے اور قہار ہے''۔

اور اس طرح خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے اپنا پیغام انھیں پہنچادیا۔

دعوت کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بات پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہے جب جتنا موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھائے اور دعوت سے کسی مرحلے پر تھکنے یا اکتانے کا نام نہ لے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کا داروغہ بن کر ان کے پیچھے نہ پڑے، بلکہ اپنی بات مؤثر سے مؤثر انداز میں کہہ کر فارغ ہو جائے، پھر جب دیکھے کہ اس پر عمل نہیں ہوا تو موقع دیکھ کر پھر کہہ دے لیکن نہ مسلط ہونے کا طریقہ اختیار کرے اور نہ مایوس ہو کر بیٹھے"[69]۔

(۳) مخاطب کی شفقت:

"پیغمبرانہ دعوت کا تیسرا اہم عنصر ''مخاطب کی شفقت'' ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا داعیہ شفقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنی برتری جتلانے یا دوسرے کی تحقیر کا ان کے یہاں شائبہ تک نہیں، حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نے بیشتر مواقع پر تبلیغ ودعوت کو لفظ ''اِنذار'' سے تعبیر فرمایا ہے جس کا لفظی ترجمہ لوگ صرف ''ڈرانا'' کرتے ہیں لیکن درحقیقت عربی زبان میں ''انذار'' اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا محرک

دوسرے پر شفقت ہو، جیسے باپ بیٹے کو آگ سے ڈراتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک ظالم حکمران اپنے کسی محکوم کو کسی سزا سے ڈرائے تو اس کو ''انذار'' نہیں کہا جائے گا۔

لہٰذا اس لفظ کے انتخاب سے اسی طرف متوجہ کرنا ہے کہ داعی حق کو نصیحت کرنا ہے، ان سے نفرت یا ان کی حقارت اس کے دل میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا محرک شفقت ہی شفقت ہوتا ہے، جس طرح ایک طبیب کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی بیمار سے نفرت کرے اور جو طبیب نفرت کا مرتکب ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، اسی طرح داعی کو بھی بدتر سے بدتر کافر یا فاسق وفاجر سے نفرت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کے افعال سے نفرت کرنے کے بجائے اس پر رحم کرنا چاہیے اور اس کی دعوت میں اس رحم اور شفقت کی جھلک محسوس ہونی چاہیے''(70)۔

(۴) حکمت:

''پیغمبرانہ دعوت کی چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے ایسا موقع اور ایسا ماحول تلاش کرتے ہیں جس سے ان کی بات زیادہ سے زیادہ موثر ہو سکے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اس کی بہت سی مثالیں دیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ:

'' حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بے تکلف دوست تھے جو آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ وضع قطع میں کسی طرح حضرت مولانا کے دوست قرار پانے کے اہل معلوم نہیں ہوتے تھے، اسی زمانے میں ڈاڑھی چڑھانے کا فیشن تھا، وہ اس فیشن پر بھی عمل کرنے کے عادی تھے کپڑے بھی علماء وصلحاء کی وضع کے خلاف پہنتے تھے۔ بعض لوگ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پر تعجب بھی کرتے تھے کہ ایسے صاحب کو حضرت نے دوست کیسے بنا لیا؟ اور کبھی لوگ پوچھتے بھی تھے کہ آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں؟ لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ طرح دے جاتے اور ان کے ساتھ اسی طرح دوستانہ بے تکلفی سے پیش آتے، اسی طرح بہت دن گزر گئے۔

ایک روز وہ صاحب آئے ہوئے تھے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا: ''بھائی ہمیں بھی اپنے جیسے کپڑے سلوادو۔'' انہوں نے پوچھا: ''کیوں؟ فرمایا: ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی جیسا لباس پہنا کریں، دوستوں کے درمیان لباس کی مغایرت اچھی معلوم نہیں ہوتی، اور یہ لو، میری ڈاڑھی موجود ہے، اس کو اپنی ڈاڑھی کی طرح چڑھادو۔''

یہ سن کر وہ صاحب پانی پانی ہو گئے، اور عرض کیا کہ: ''حضرت! آپ کو اپنی وضع بدلنے کی ضرورت نہیں، آج سے انشاءاللہ میرا لباس اور تراش خراش آپ کے طرز کے مطابق ہوگی"۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس واقعے کو نقل کرکے فرمایا کرتے تھے کہ جب داعیٔ حق کے دل میں جذبہ، لگن للٰہیت ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر حکمت القاء فرماتے ہیں، اور اسے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی بات کہنے کے لیے کون سا موقع مناسب ہوگا؟"[71]

(۵) موعظہ حسنہ:

"پیغمبرانہ دعوت کا پانچواں اہم اصول یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے انداز بیان اور اسلوب ایسا اختیار فرماتے ہیں جو نرمی، ہمدردی اور دلسوزی کا آئینہ دار ہو۔ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ:

﴿فَقُولَا لَهُۥ قَوۡلٗا لَّيِّنٗا لَّعَلَّهُۥ يَتَذَكَّرُ أَوۡ يَخۡشَىٰ ۝٤٤﴾[72]۔

ترجمہ: ''تم دونوں اس سے نرم بات کہنا''۔

اب کوئی شخص فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا مصلح اور داعی نہیں ہو سکتا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے داعی کو فرعون جیسے گمراہ سے بھی نرم بات کہنے کا حکم دیا جارہا ہے تو ہمہ شما کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز دعوت و تبلیغ حتی الامکان انھی اصولوں کے مطابق ہوتا ہے، ایک مرتبہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کسی سفر پر ریل میں جارہے تھے، ساتھ ہی ماڈرن قسم کے افسر بھی سفر کر رہے تھے ، شروع میں وہ اجنبیت کی بناء پر کھینچے کھینچے سے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں مانوس ہو کر گفتگو کرنے لگے، مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ حضرت والد صاحب سفر میں اپنے رفقاء کو راحت پہنچانے کے لیے ایثار و خدمت کے عادی تھے، چنانچہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، یہاں تک کہ کسی نماز کا وقت آگیا، حضرت والد صاحب اس موقع پر چپکے سے اٹھے اور نماز پڑھ کر آگئے۔ اس وقت ان صاحب نے کہا: ''مولانا! جب آپ نماز کے لیے اٹھنے والے تھے تو مجھے یہ خیال ہو رہا تھا کہ آپ شاید مجھے بھی نماز کے لیے کہیں گے لیکن چونکہ میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اگر آپ اس بارے میں کچھ فرماتے تو مجھ پر بار بھی ہوتا اور شاید میں عذر بھی کر دیتا، لیکن آپ کے اس طرز عمل نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ اب میں ذہنی طور پر بالکل تیار ہوں اور آئندہ آپ کے ساتھ میں بھی نماز پڑھا کروں گا''(73)۔

فرقِ باطلہ اور فرقِ ضالہ کی تردید:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ صلاح پسند طبیعت کے مالک تھے، نفرت انگیز افکار و تقاریر سے کوسوں دور تھے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غلط افکار و غلط نظریات کے سامنے جھک جاتے تھے، بلکہ اس باب میں آپ کا ایک خاص طرز تھا، جس کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے تقریباً تمام فرقوں کی تردید میں کتابیں یا مقالے تحریر فرمائے اور ابتدائی زمانے میں متعدد معرکے کے مناظرے بھی کیے لیکن اس بارے میں بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ تھا کہ یہ تردید و تنقید قرآن کریم کی اصطلاح میں

﴿وَجَٰدِلۡهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ﴾[74]

کی حدود سے متجاوز نہ ہو۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ باطل فرقوں کی تردید بھی درحقیقت دعوت و تبلیغ ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا اس میں بھی حکمت، موعظۂ حسنہ اور ''مجادلہ بالتی ہی احسن'' کے اصولوں پر عمل ضروری ہے۔

آج کل دوسروں کی تردید میں طعن و تشنیع، طنز و تعریض اور فقرے کسنے کا جو انداز عام ہو گیا ہے، حضرت والد صاحب اس کے سخت مخالف تھے اور فرماتے تھے کہ اس سے اپنے ہم خیال لوگوں سے داد تو وصول ہو جاتی ہے لیکن اس سے مخالفین کے دل میں ضد اور عناد پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کا ذہن بدلنے میں مدد نہیں ملتی''[75]۔

طرز معیشت میں انتظام اور قناعت:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی آمدنی بہت کم، رہن سہن، قطع وضع میں نہایت سادگی اور قناعت تھی، آپ کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب کا طرز معیشت ہمیشہ انتہائی سادہ رہا، ساری عمر ایک ہی لباس اور ایک ہی سی وضع قطع کے پابند رہے، طرز بود و ماند میں ہمیشہ تواضع، سادگی اور مسکنت کی جھلک نمایاں رہی، آمدنی کے لحاظ سے آپ پر مختلف قسم کے دور گزرے، دار العلوم دیوبند میں پندرہ روپے سے لے کر پینسٹھ روپے ماہانہ تک آپ کی تنخواہ

رہی، اس کے بعد مدت تک کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ پاکستان آنے کے ابتدائی زمانے بہت عسرت میں بسر ہوا۔

پھر وہ دور بھی آیا کہ "بورڈ آف تعلیمات اسلام" کی رکنیت کے زمانے ایک ہزار روپے ماہانہ الاؤنس ملنے لگا، لیکن اس تمام اتار چڑھاؤ کے مختلف زمانوں میں آپ کا طرز معیشت یکساں ہی رہا، نہ عسرت کے زمانے میں کبھی بخل سے کام لیا، نہ فراخی کے دور میں کبھی اسراف سے، البتہ آمد و خرچ ہمیشہ انتظام کے ساتھ فرماتے۔

ہر قسم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں، جتنی آمدنی ہوتی، ضرورت کے لحاظ سے مختلف مدوں میں تقسیم ہو جاتی اور جس مد میں جتنے پیسے ہوتے اسی لحاظ سے خرچ بھی فرماتے، زمانہ دراز تک یہ معمول رہا کہ ماہانہ اخراجات کا تحریری حساب رکھتے، وہ کاپیاں اب تک محفوظ ہیں جن میں آپ نے چھوٹے چھوٹے اخراجات بھی لکھ کر رکھے ہوئے ہیں اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تھوڑی آمدنی میں کام چلانے کے لئے بخل کی نہیں، انتظام اور قناعت کی ضرورت ہے، اگر انسان اپنی آمدنی کو انتظام کے ساتھ خرچ کرے تو تھوڑی رقم میں بھی کام بن جاتا ہے اور بد نظمی سے کرے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہو۔

مزید فرماتے ہیں کہ لوگ معاشی تنگی کو دور کرنے کے لئے آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں، حالانکہ آمدنی کا بڑھنا غیر اختیاری عمل ہے، اور جو کام اپنے اختیار میں ہے، اسے پہلے کرنا چاہیے، یعنی یہ اخراجات کم کئے جائیں، اور قناعت اختیار کی جائے، جتنی آمدنی جائز ذرائع سے بس میں ہو، اخراجات کا معیار اسی کے مطابق رکھا جائے،،(76)۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرزِ معیشت کے حوالہ سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''بورڈ آف تعلیمات اسلام کا الاؤنس بھی صرف چند سال جاری رہا، اور وہ بھی اس شان استغناء سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ اپنی زندگی کے کسی کام کا مدار اس پر نہیں رکھا تا کہ دینی ضرورت داعی ہو تو استعفاء دینے میں کوئی معاشی مسئلہ کبھی رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس کے بعد پھر وہی کیفیت تھی کہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا، دار العلوم کراچی کی بنیاد پڑ چکی تھی، مگر اس سے آپ نے تنخواہ لینا پسند نہیں فرمایا۔

جب تنگی زیادہ ہوئی اور قرضوں کا بار بڑھ گیا تو دار العلوم کی مجلس منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے ماہوار لینا منظور فرمالیا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب اللہ تعالیٰ فراخی عطا فرمائیں گے تو یہ رقم واپس کر دی جائے گی، کچھ دنوں کے بعد ترقی معکوس فرمائی، اور پانچ سو کے بجائے تین سو روپے ماہانہ لینے شروع کر دیئے، اور کچھ دنوں کے بعد کچھ لینے کا سلسلہ بالکل بند کر دیا، جتنی رقم اس وقت تک دار العلوم سے لی تھی، اس کا پورا حساب اپنے پاس محفوظ رکھا، اور اس کی واپسی کی فکر میں رہے، یہاں تک کہ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جتنی تنخواہ اس عبوری دور میں دار العلوم سے لی تھی، اس کی پائی پائی واپس کر دی۔

جس زمانے میں معاشی طور پر آپ کا ہاتھ تنگ رہا، اس دور میں بھی یہ بات اولاد تک پر ظاہر نہیں ہونے دی، ہم لوگوں کی صرف ضروریات ہی نہیں، جائز اور معتدل شوق بھی پورے فرماتے رہے، لیکن ساتھ ہی فضول خرچی سے اجتناب کی بھی عادت ڈالی، اور اس بات پر ہمیشہ نگاہ رکھی کہ دنیا طلبی ہی زندگی کا مقصد ہو کر نہ رہ جائے، اپنی اولاد سے خطاب کرتے ہوئے بارہا ارشاد فرمایا کہ ''میں تم لوگوں کے لئے ہمیشہ یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ معاشی پریشانی و بدحالی سے تو محفوظ رکھے، لیکن بہت زیادہ مالدار بھی نہ بنائے، کیونکہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے[77]۔''

ذرائع معاش :

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حضرات انبیاء عظام، اولیاء کرام دنیا کے تمام کاروبار عام انسانوں کی طرح انجام دیتے ہیں اور دنیا کے کام سرانجام دینے کے باوجود دنیا کی محبت ان کے دل میں نہیں ہوتی، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس بات کی عملی تفسیر تھی، آپ کو اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کے لیے تجارت، زراعت اور اجارہ تینوں سنتوں پر عمل کی توفیق بخشی، جس کی تفصیل مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

تجارت:

''تجارت اس طرح کی کہ صرف پانچ روپے کے سرمائے سے دار الاشاعت کا کام شروع کیا، جو کتابوں کی نشر واشاعت کی شکل اختیار کر گیا''(78)۔

(۲)زراعت:

''زراعت اس طرح فرمائی کہ دیوبند میں باغ لگایا''(79)۔

(۳)کتابت اور جلد سازی ودیگر کام:

''اس کے علاوہ کتابت اور جلد سازی کا بھی کام کیا اور تنگ دستی سے لے کر وسعت وفراخی تک ہر قسم کے سرد و گرم حالات چکھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی محبت آپ کو چھو کر بھی نہیں گئی۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ دیوبند میں عمر کا بیشتر حصہ آپ نے ایک تنگ کمرے میں گذارا''(80)۔

(۴) شجر کاری:

آخر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی، تو خود اپنے شوق سے ایک کشادہ مکان بنوایا، اس کی ایک ایک اینٹ پر محنت خرچ کی، یہاں تک کہ وہ آپ کی راحت کا بہترین سامان بن گیا، آپ کو شجر کاری کا بھی شوق تھا، اور فرمایا کرتے تھے کہ:

"اگر بہ نیت صحیح درخت لگانا بھی ایک صدقہ جاریہ ہے، جب تک وہ درخت قائم رہے گا، اس سے جتنے آدمی فائدہ اٹھائیں گے، درخت لگانے والے کو ثواب ملے گا"[81]۔

چنانچہ دیوبند ہی میں ایک باغ لگایا جس میں بڑے شوق اور محنت سے مختلف پھلوں، بالخصوص آم کے درخت جمع کیے، لیکن اس اثناء میں پاکستان بن گیا، اور ہجرت کا مرحلہ اس وقت آیا جب اس باغ پر پہلا پہلا پھل آرہا تھا، آپ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے اور اکثر تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ:

" بفضلہ تعالیٰ جس روز میں نے اس گھر اور اس باغ سے قدم نکالا ہے، وہ گھر اور باغ میرے دل سے نکل گئے، اور اب مجھے بعض اوقات سوچ کر بھی اس گھر کے بعض حصوں کا نقشہ یاد نہیں آتا[82]۔"

چنانچہ ساری عمر کبھی ایک مرتبہ آپ کو اس گھر یا باغ کا حسرت سے تذکرہ کرتے نہیں دیکھا۔

"اسی طرح کراچی آنے کے سات سال بعد اللہ تعالیٰ نے لسبیلہ ہاؤس میں وسیع اور آرام دہ مکان عطا فرمایا لیکن چند سال اس میں مقیم رہنے کے بعد دارالعلوم کی ضرورت داعی ہوئی کہ اپنا قیام یہاں منتقل فرمالیں، چنانچہ اس کشادہ اور آرام دہ مکان کو چھوڑ کر یہاں تشریف لے آئے، اور ایک ایسے تنگ مکان میں سال ہا سال گزارہ کیا جس کی چھتیں ناپختہ تھیں، اور برسات کے موسم میں کمرہ بری طرح ٹپکتا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد لسبیلہ کے مکان کے راحت و آرام کو یاد کرتے کبھی نہیں دیکھا"[83]۔

غرض دنیا کی کسی بڑی سی بڑی منفعت کے ہاتھ سے نکل جانے پر کبھی حسرت کرتے آپ کو نہیں پایا، اور بہادر شاہ ظفر مرحوم کا یہ شعر جو آپ ایسے مواقع پر اکثر پڑھا کرتے تھے، آپ کے قلب کی کیفیت کی تصویر تھا:

یہ کہاں کا فسانۂ سود و زیاں، جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا

کہو دل سے کہ فرصتِ عمر ہے کم، جو دِلا تو خدا ہی کی یاد دلا (84)

خدا کی نعمتوں کی قدر:

اللہ تعالی نے آپ کو دین و دنیا کی جن نعمتوں سے نوازا تھا حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی قدر کرنا بھی خوب جانتے تھے، آپ کے تذکرہ نگاروں نے اس حوالے سے آپ کے دسیوں واقعات سپردِ قلم کئے ہیں، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس کا خلاصہ درج ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

"ایک طرف دنیا کی بے وقعتی کا یہ استحضار تھا، لیکن دوسری طرف یہ پہلو کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہوا کہ دنیا میں جو چیز جائز اور حلال طریقے سے میسر آجائے، وہ اللہ تعالی کی عطا ہے اور اس کا یہ حق ہے کہ اس کی ناقدری نہ کی جائے، چنانچہ آپ اپنی مملوک اشیاء کو حفاظت کے ساتھ رکھتے، اور اس بات کی کوشش کرتے کہ کوئی چیز ضائع نہ ہونے پائے، بلکہ کسی نہ کسی کے کام آجائے، کاغذوں کے جو ٹکڑے تحریر سے بچ رہتے، انھیں احتیاط سے جمع کرتے رہتے ان کی ایک جگہ مقرر تھی، اور گھر میں جب کبھی کسی کو کوئی مختصر پرچہ لکھنا ہوتا، وہاں پہنچ جاتا، وہاں ہر سائز کے کاغذ کے پرزے مل جاتے تھے۔ جو پیکٹ ڈاک میں آتے ان کی ستلی کو ضائع کرنے کے بجائے ایک مخصوص جگہ پر رکھوادیتے اور گھر کا ہر فرد ضرورت کے وقت وہاں سے ستلی لے کر استعمال کرتا۔

دعوتوں کے جو کارڈ آیا کرتے، کبھی ان کی پشت پر کوئی کلمہ حکمت اور کبھی کوئی شعر وغیرہ لکھ کر اسے کہیں لٹکا دیتے، یا کسی کو دے دیتے۔ اگر کوئی چیز کبھی گم ہو جاتی تو اسے اجمالی طور پر تلاش ضرور کرتے، خواہ وہ ایک پائی ہی کیوں نہ ہو، اور فرماتے تھے کہ یہ بڑی ناقدری کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اس عطا سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر اسے تلاش ہی نہ کرے(85)۔

انفاق فی سبیل اللہ:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا بڑا ذوق تھا اور مصارف خیر کی شاید ہی کوئی صورت ایسی بچی ہو جس پر آپ نے عمل نہ فرمایا ہو، خرچ کرنے کا یہ معمول تنگی فراخی دونوں حالتوں میں جاری رہتا اور اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا تھا وہ بڑا سبق آموز اور لائق تقلید ہے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''آپ کا یہ معمول تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس جب بھی کوئی رقم آتی تو اس کا ایک معین حصہ فوراً مصارف خیر میں خرچ کرنے کے لئے علیحدہ فرما لیتے تھے، اور طے یہ کیا ہوا تھا کہ آمدنی اگر محنت سے حاصل ہوئی ہے تو اس کا بیسواں حصہ (پانچ فیصد) اور اگر کسی محنت کے بغیر حاصل ہوئی ہے، (مثلاً انعام، ہدیہ، تحفہ وغیرہ) تو اس کا دسواں حصہ فوراً علیحدہ نکال لیا جائے(86)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، آپ کے پاس ہمیشہ ہر قسم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں، ایک صندوقچی میں مختلف تھیلے یا لفافے رکھے رہتے تھے، جن پر اس مد کا نام درج ہوتا تھا مثلاً ''خانگی اخراجات''، ''آمد روفت کے اخراجات'' وغیرہ اسی صندوقچی میں ایک تھیلا آپ کے پاس ہمیشہ رہتا تھا جس پر ''صدقات ومبرات'' لکھا رہتا تھا۔ تنگ دستی کا زمانہ ہو یا فراخی کا آمدنی کا مذکورہ حصہ آپ فوراً اس

تھیلے میں رکھ دیتے تھے اور جب تک یہ حصہ "صدقات ومبرات" کے تھیلی میں نہ چلا جاتا، اس وقت تک اس آمدنی کو استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اگر دس روپے بھی کہیں سے آئے ہیں تو فوراً اس سے چھوٹے نوٹ بدلوا کر ایک روپیہ اس تھیلے میں رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ اس طریق کار کی برکت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی خیرات کا مصرف سامنے آتا ہے تو اس وقت سوچنا نہیں پڑتا کہ اس میں رقم کہاں سے دی جائے؟ بلکہ یہ صدقات ومبرات کا تھیلہ ہر وقت یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف تلاش کیا جائے۔ دوسری طرف آپ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے، لیکن ضرورت مند ہیں، اور اس قسم کے افراد کی ایک فہرست ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے۔ آمدنی کا دسواں اور بیسواں حصہ تو ایک معین مقدار تھے، اس کے علاوہ بھی جب موقع ملتا اس تھیلے میں مزید رقمیں شامل فرمادیتے، اس طرح ہم نے کبھی اس تھیلے کو خالی نہیں دیکھا، اس کے ذریعے کتنے انسانوں کی حاجت روائی ہوئی، اور کتنے مصارف خیر جاری ہوئے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، نہ جانے کتنوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا، کتنے افراد کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرا کر معاشی ترقی کے راستے پر لگادیا، اور کتنے افراد کی رہائش کا انتظام فرمادیا، اور کتنے ہی افراد کی کسی دوسری طرح ضرورت پوری کرنے میں مدد دی(87)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس سلسلہ میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ:

"زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ روپیہ اپنے پاس سے نکال دیا جائے، بلکہ اس کو صحیح مصرف تک پہنچانا بھی انسان کی اپنی ذمہ داری ہے، اسی لئے حکم یہ نہیں ہے کہ "زکوۃ نکالو" بلکہ حکم یہ ہے کہ "زکوۃ ادا کرو۔" لہٰذا لوگوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ زکوۃ نکال کر جس کو چاہا پکڑادی" اس سے ذمہ داری

پوری نہیں ہوتی، بلکہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسے مستحقین کی ایک فہرست نگاہ میں رکھے جو کسی سے مانگتے نہیں، لیکن ضرورت مند ہیں۔

بازار میں جو بھکاری عام طور پر مانگتے پھرتے ہیں، ان کے ساتھ بھی والد صاحب کا عجیب طرز عمل تھا، عام طور پر جو کوئی سائل آتا، آپ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے، ایک مرتبہ احقر موٹر میں آپ کے ساتھ تھا، کسی جگہ گاڑی رکی، اور ایک سائل آدھمکا، آپ نے اپنی جیب میں سے کچھ نکال کر اسے دے دیا، احقر نے پوچھا کہ " اباجی" اس قسم کے سائل عام طور سے مستحق نہیں ہوتے، ان کو دینا چاہیے یا نہیں؟ اس کا جو عجیب و غریب جواب آپ نے دیا، وہ آج تک لوح دل پر نقش ہے، فرمایا: "ہاں میاں بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ سوچو کہ اگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے استحقاق ہی کی بنیاد پر ملنے لگے تو ہمارا کیا بنے گا"؟

حضرت کے اس جواب سے واقعتہ رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور اندازہ ہوا کہ اللہ والوں کی نظریں کہاں پہنچی ہیں؟ مگر ساتھ ہی یہ شبہ رہا کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حلال نہیں، فقہاء کرام نے اسے دینے کو بھی منع کیا ہے، چنانچہ کچھ وقفے کے بعد احقر نے فقہاء کے اس قول کے حوالے سے دوبارہ مسئلہ پوچھا تو اس پر فرمایا:

"جس شخص کے بارے میں یقین سے معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس اتنے پیسے موجود ہیں کہ اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں، یہ حکم اس کے لئے ہے کہ اسے نہ دیا جائے، اور یہ حکم بھی اس لئے نہیں کہ وہ مستحق نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی عادت خراب ہو گی، لیکن سڑک پر جو اجنبی سائل سامنے آجاتے ہیں، ان کے بارے میں یقین سے یہ بات کہاں معلوم ہوتی ہے؟ محض بدگمانی کی بناء پر کسی سائل کو رد کرنا ٹھیک نہیں، ہاں جس جگہ یقین ہو جائے کہ یہ دھوکہ کر رہا ہے اور اس کے لئے مانگنا جائز نہیں تو وہاں بے شک نہیں دینا چاہیے"[88]۔"

مزید لکھتے ہیں:

"حضرت والد صاحب کے اس جواب سے ایک بہت بڑی الجھن رفع ہو گئی، اور راہ عمل واضح ہو گئی۔

غرباء کی امداد کے علاوہ آپ کو صدقہ جاریہ کا خاص ذوق تھا، جب کسی مسجد کی تعمیر کی خبر سنتے تو اس میں کچھ نہ کچھ حصہ لینے کی کوشش فرماتے۔ دارالعلوم میں دو کمرے اس مقصد کے لئے اپنے خرچ سے تعمیر کرائے اور انھیں مسجد پر وقف کر دیا، اپنے والد کے لئے متعدد صدقات جاریہ میں رقمیں لگائیں، دارالعلوم کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں وقف فرمائیں، یہاں تک کہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی وقف فرما گئے، جو کم از کم ایک لاکھ روپے کی مالیت کی کتابوں پر مشتمل ہو گا''[89]۔

معاملات کی صفائی:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ معاملات کی صفائی میں حد درجہ کی احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت والد صاحب کو معاملات کی صفائی کا بے حد اہتمام تھا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ بددیانتی سے کسی کے حق کو غصب کر لینا تو گناہ عظیم ہے ہی، حسابات و معاملات کو مجمل، مبہم یا مشتبہ رکھنا بھی بہت خطرناک غلطی ہے جس کا نتیجہ بعض اوقات بددیانتی ہی کی شکل میں نکلتا ہے۔ بعض لوگوں کی نیت بددیانتی کی نہیں ہوتی، لیکن معاملات کے گڈمڈ ہونے کی وجہ سے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر باپ بیٹوں، بہن بھائیوں، استاد شاگرد شیخ و مرید اور بے تکلف تعلقات میں اس قسم کی صورتیں بکثرت پیش آتی ہیں، مثلاً باپ بیٹوں نے مل جل کر ایک مکان بنوایا، اور حساب کچھ نہ رکھا کہ کس نے کتنی رقم خرچ کی ہے، اور یہ بات بھی واضح نہ کی کہ مکان کس کی ملکیت ہو گا اس طرح معاملات کو مبہم رکھ کر مکان میں رہتے بستے رہے، شروع میں تو بظاہر اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی لیکن آگے چل کر جب مکان کی تقسیم یا وراثت کا سوال آتا ہے تو آپس میں شدید جھگڑے اٹھتے ہیں اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچتی ہے۔

حضرت والد صاحب کا معمول ساری عمر یہ رہا کہ معاملہ بیٹے سے ہو یا بھائی سے، دوست سے ہو یا رشتہ دار سے، شاگرد سے ہو یا مرید سے ہمیشہ واضح غیر مشتبہ اور عموماً تحریری شکل میں فرماتے تھے۔ اور آخر تک کی بات پہلے ہی طے فرما لیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اگر اپنے بیٹوں سے کوئی لین دین ہوتا تو اس کی حیثیت بھی عام طور پر لکھ کر متعین فرما دیتے، ایک مرتبہ آپ نے کچھ کتابیں ہمارے مرحوم بھائی مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم کو فروخت کیں، انہوں نے رقم بھیجی جو شاید چند سو روپے تھی تو آپ نے باقاعدہ اس کی تحریری رسید الگ کاغذ پر بنا کر بھیجی کہ اتنے روپے فلاں کتابوں کے عوض میں مولوی محمد ذکی سلمہ سے وصول پائے، غرض حدیث میں جو ارشاد ہے کہ:

"تعاشروا كالإخوان وتعاملوا كالأجانب"[(90)].

''رہو بھائیوں کی طرح، مگر معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔''

اس ارشاد گرامی پر جس اہتمام کے ساتھ حضرت والد صاحب کو عمل کرتے دیکھا، اس کی نظیر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔

آپ اپنے روپے کے حسابات ہر وقت بالکل مکمل اور تازہ ترین صورت حال کے مطابق رکھتے تھے، آپ کی صندوقچی میں بہت سی امانتیں رہتی تھیں اور ذاتی رقوم کی بھی مختلف مدات تھے، لیکن ہر مد بالکل واضح اور اس پر لکھی ہوئی ہدایت قطعی طور پر غیر مشتبہ ہوتی تھیں۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ بحمد اللہ میرے تمام معاملات ہر وقت اتنے واضح رہتے ہیں کہ اگر ابھی دنیا سے اٹھ جاؤں تو کسی ایسے معاملے کا دل پر بوجھ نہیں ہوگا جو لکھا ہوا نہ ہو، اور کسی بھی شخص کو اس کے سمجھنے میں دشواری

پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ آپ کی وفات کے بعد صندوقچی میں دسیوں قسم کے مدات، امانتیں اور حسابات، برآمد ہوئے، لیکن ہر ایک اتنا واضح کہ ہم لوگوں کو انھیں حق دار تک پہنچانے میں ادنی دشواری نہیں ہوئی[91]۔

وصیت نامے کا اہتمام:

معاملات کی صفائی اور شفافیت میں وصیت نامے کو بڑا دخل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے عمر کے ہر مرحلہ میں وصیت نامے کا اہتمام فرمایا، جیسا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھاہے کہ :

"آپ نے اپنا وصیت نامہ اس وقت سے لکھنا شروع کر دیا تھا جب آپ کی عمر کل تیس سال تھی اور اس میں اپنی تمام املاک اور امانتوں کے بارے میں وضاحت کے ساتھ پوری تفصیل درج فرمادی تھی، اور پھر جوں جوں املاک اور امانتوں میں تغیر آتا رہتا، اس وصیت نامے کو بدلتے رہتے یہاں تک وہ ایک ضخیم رجسٹر بن گیا، اور آخر عمر میں سابقہ تمام وصیت ناموں کو منسوخ فرما کر نیا وصیت نامہ تحریر فرمایا جس میں اپنی ایک ایک ملکیت کی پوری حقیقت واضح فرمادی۔

آپ نے جو ذاتی مکان تعمیر فرمایا تھا، اسے تو خود اپنی زندگی ہی میں اپنے ہونے والے ورثاء کے درمیان تقسیم کر کے ہر ایک کے نام ہبہ نامے الگ الگ رجسٹری کرادیئے تھے، اور ہر ایک کو اس کا حصہ حوالہ کر کے فارغ ہو گئے تھے۔ لیکن دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ہر بات وصیت نامے میں واضح فرمادی تھی، اور اس میں یہاں تک تحریر فرمادیا تھا کہ گھر کے سامان میں کتنا حصہ ان کی ملکیت ہے جو ترکے میں شامل ہو کر تقسیم ہوگا، اور کتنا والدہ صاحبہ مدظلہا کی ملکیت ہے جو ان کے تصرف میں رہے گا۔

آخر عمر میں جب صاحب فراش ہو گئے تھے تو دار العلوم کے انتظامی امور بھی چارپائی پر ہی انجام دیتے تھے، لیکن اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ دارالعلوم کی کوئی چیز کمرے میں نہ رہنے پائے، فرنیچر اور برتنوں سے لے کر قلم، دوات، کاغذ اور آل پن تک کوئی مدرسے کی چیز کمرے میں نہ آنے دیتے، اور اگر کبھی کوئی چیز آجاتی تو فوراً اسے واپس بھیجنے کا انتظام فرماتے۔

وجہ یہ تھی کہ وصیت نامے میں آپ نے لکھ دیا تھا کہ اس کمرے کا جتنا سامان ہے وہ میری ملکیت ہے، ادھر ہر وقت آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوے کے انتظار میں تھے، اس لئے یہ خطرہ تھا کہ اگر انتقال کے وقت مدرسے کوئی چیز کمرے میں پڑی رہ گئی تو اسے ذاتی ملکیت سمجھ کر ترکے میں شامل نہ کر لیا جائے بلکہ اس بات کا اہتمام بھی فرماتے تھے کہ والدہ صاحبہ مد ظلہا یا ہمارے کمروں میں سے کسی کی کوئی چیز یہاں نہ پڑی رہے، جو چیز وقتی طور پر آتی، اسے فوراً واپس بھیج دیتے، شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو کہ وصیت نامے کے مطابق صرف آپ کے دو کمروں کا سامان آپ کی ملکیت میں تھا، باقی گھریلو سامان آپ والدہ صاحبہ کو ہبہ فرما چکے تھے"[92]۔

دوسروں کے جذبات کی رعایت:

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے جذبات کی رعایت کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ہر ایک شخص سے اس کے مزاج و مذاق اور اس کی ضروریات کے مطابق معاملہ فرماتے، اور اپنی ہر نقل و حرکت میں اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی دوسرے کو آپ کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"کسی کے یہاں جانا ہوتا تو پہلے سے معلوم فرماتے کہ کون سے وقت اس کے لئے ملاقات آسان ہو گی، اگر کھانے کا وقت قریب ہوتا اور وہاں کھانے کا ارادہ نہ ہوتا تو جاتے ہی مناسب انداز میں اس پر واضح فرما دیتے کہ اس کے یہاں کھانے کا ارادہ نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ کھانے کا انتظام کرے اور بعد میں

تکلیف ہو، کسی کے یہاں کھانے کا ارادہ ہوتا تو اتنا پہلے اسے باخبر فرماتے کہ وہ بآسانی انتظام کر سکے۔ کسی کو ٹیلیفون کرتے وقت اس بات کی رعایت فرماتے کہ اس کے لئے اس وقت فون پر آنا مشکل نہ ہو۔

کسی شخص پر اس کے مزاج کے خلاف اصرار کرنے اور دباؤ ڈالنے کا تو دستور ہی نہ تھا کسی کی سفارش کرنے سے پہلے بار بار سوچتے تھے کہ جس شخص سے سفارش کی جارہی ہے اس کی طبیعت پر بار تو نہیں ہوگا اور سفارش کرتے وقت بھی اس پر دباؤ ڈالنے کے بجائے یہ فرماتے کہ اگر قواعد وضوابط میں گنجائش ہو اور آپ کی وسعت میں ہو تو فلاں کام کر دیجیئے۔

فرمایا کرتے تھے کہ کسی ایک شخص کی حاجت برآری کے لئے دوسرے شخص کو ناجائز کام پر آمادہ کرنا یا اس کو اصول توڑنے پر مجبور کرنا یا اسکی طبیعت پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا مجھے گوارا نھیں۔

جتنا کام آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے کرنا ممکن ہوتا، عموماً اس کے لئے دوسرے شخص کو تکلیف نہیں دیتے تھے، بارہا اپنے کمرے کی خود جھاڑو دے لیتے، کبھی کبھی کپڑے بھی خود دھو لیتے، درختوں کو اپنے ہاتھ سے پانی دے لیتے، مہمانوں کے لئے خود کھانا لے آتے، غرض اپنے کسی کام سے نہ صرف یہ کہ کوئی اعراض نہیں تھا، بلکہ اتباع سنت کی نیت سے اس قسم کے کاموں کا شوق تھا، اور جب تک صحت رہی معمول یہی رہا کہ اگر ہم لوگوں کو کسی اور کام میں مشغول دیکھا تو ہمیں بلانے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے یہ کام انجام دے لئے۔

یہ عادت اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ مرض وفات میں شدید بیماری کے دوران بھی جتنا کام خود کرنا بس میں ہوتا، ہماری بار بار کی التجاؤں کے باوجود خود ہی کرتے تھے۔

آپ کی تمام ضروریات کی ایک جگہ مقرر تھی، اور کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو جگہ مقرر ہونے کی بنا پر وہ اندھیرے میں بھی مل جاتی، جب کبھی کوئی چیز اسکی جگہ سے اٹھائی، ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً وہیں رکھ دی، اس عادت میں تخلف نہیں ہوتا تھا، ہم لوگ اپنی بد نظمی سے حضرت کو بڑی تکلیف پہنچاتے تھے کہ کوئی چیز اس

کی جگہ سے اٹھائی، اور دوسری جگہ رکھ دی، اس پر کئی بار ہمیں تنبیہ فرمائی، اور ایک دن فرمایا کہ ”لوگوں نے ان آداب معاشرت کو دین سے خارج ہی سمجھ لیا ہے، اور ان باتوں کی پروا نہیں کرتے، حالانکہ مشترک استعمال کی چیزوں کی جو جگہ مقرر ہو اسے وہاں سے بے جگہ لے جانا صرف مروت اور اخلاق ہی کے خلاف نہیں، اس لحاظ سے بڑا گناہ بھی ہے کہ ضرورت کے وقت چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی تو اس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اور کسی مسلمان کو ایذا پہنچانا بہت بڑا گناہ ہے“[93]۔

اپنے ماتحت لوگوں سے برتاؤ:

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس فکر اور احتیاط میں گزری کہ ان کی ذات سے کسی کو ادنی تکلیف بھی نہ پہنچے، ہر آن اپنے ماتحتوں کی راحت رسانی کا اہتمام فرماتے، جیسا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

”ملازموں سے کام لینے میں بھی اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ وہ ان کے لئے زیادہ مشقت کا موجب نہ ہو ، ان کے آرام کے اوقات میں کام بتانے سے پرہیز فرماتے، کسی جگہ رات کو جانا ہوتا تو اس بنا پر جلدی واپس لوٹنے کی کوشش فرماتے کہ ڈرائیور کو رات کے وقت زیادہ جاگنا نہ پڑے۔ ایک ساتھ بہت سے کام بتلا کر ملازم کے ذہن پر بار نہ ڈالتے، بلکہ جب وہ ایک کام سے فارغ ہو جاتا تو دوسرا بتاتے، غرض آپ کی پوری زندگی اس شعر کی عملی تشریح تھی جو آپ اکثر پڑھا کرتے تھے کہ

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

اور اس فکر کی انتہا یہ ہے کہ وفات سے دس روز پہلے جو رمضان کا مہینہ ختم ہوا، اس میں وقتاً فوقتاً آپ کی طبیعت بگڑنے لگتی تھی، دل کی تکلیف بار بار ہونے لگی تھی، جب یہ رمضان المبارک ختم ہو گیا تو ایک دن حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ:

''اس رمضان میں جب میری طبیعت بار بار خراب ہوتی تو بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس مبارک مہینے کی موت کی سعادت عطا فرمادیں، لیکن میرا بھی عجیب حال ہے، اس خیال کے باوجود میں اس بات کی تمنااور دعانہ کرسکا کہ میرا انتقال رمضان میں ہو، کیونکہ مجھے خیال یہ تھا کہ اگر یہ واقعہ رمضان میں پیش آیا تو ''اوپر والوں کو(یعنی تجہیز و تکفین کے منتظمین اور اس میں شرکت کرنے والوں کو) بہت تکلیف ہوگی۔''

میں حضرت کی زبان سے یہ جملے سن رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ''ان کی پرواز فکر ہمارے تخیل و تصور کی ہر سرحد سے کتنی بلند ہے، اللہ اکبر!

اسی مرض وفات کے دوران چونکہ طبیعت بے حد کمزور ہوگئی تھی، اس لئے ذرا مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو طبیعت میں تغیر آجاتا تھا، ادھر غنودگی لانے والی دواؤں کی بناء پر بعض اوقات سوچنے کا انداز اپنی طبعی حالت پر نہیں رہتا تھا، اس لئے اپنی عام عادت کے خلاف لہجے میں تلخی جلد آنے لگی تھی، ایک دن آپ نے احقر سے فرمایا:

''بعض اوقات میں تم لوگوں کو ایسی بات تنبیہ کرتا ہوں جو واقعتہ قابل تنبیہ ہوتی ہے لیکن بعض اوقات لہجے میں تلخی کی وجہ ضعف اور علالت بھی ہوتی ہے، تم لوگوں کو ان دونوں میں امتیاز کرنا چاہیئے، اور اس بات پر رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے کہ لہجے کی تلخی بڑھتی جارہی ہے''۔

کیا ٹھکانہ ہے اعتدال فکر ومزاج اور دوسروں کی رعایت کا! ایسی حالت میں بھی جبکہ طبیعت کا غیر طبعی حالت پر ہونا ہر کس وناکس پر عیاں ہے، خود اپنے انداز گفتگو کا تجزیہ جاری ہے اور دوسروں کی رنجیدگی کا خیال اس حالت میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اعتدال وتوازن میں ڈھلی ہوئی اس زندگی کی مثال اب نگاہوں کو کہاں نصیب ہوگی[94]۔

جھگڑوں سے اجتناب:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو جھگڑوں، تنازعات اور نزاع وجدال سے سخت نفرت تھی، آپ اپنے حق کے لئے بھی کبھی جھگڑوں میں پڑنا پسند نہیں فرماتے تھے، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں آپ ایک حدیث اکثر سنایا کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أَنَا زَعِيْمُ بَيْتٍ فِي وَسَطِ الجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ المِرَاءَ وهو مُحِقٌّ"(أو كما قال ﷺ)(95).

''میں اس شخص کے لئے جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کی ضمانت لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے"۔

اس حدیث پر عمل کی حیرت انگیز مثال یہ واقعہ ہے کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب (جہاں آج کل اسلامیہ کالج ہے) آپ کو دار العلوم کے لئے ایک وسیع قطعۂ زمین مل چکا تھا، لیکن آپ نے جھگڑے سے بچنے کے لئے اسے چھوڑ دیا۔

اس کے علاوہ آپ کے ذاتی معاملات میں نہ جانے کتنے لوگوں نے آپ کو دھوکے دیئے، کتنوں نے آپ پر مقدمات قائم کرنا چاہے، کتنوں نے بدنام کرنے کے لئے اخبار واشتہار کا سہارا لیا، لیکن آپ نے ان تمام باتوں کا وہ جواب نہیں دیا جو آج کی دنیا دیتی ہے، بلکہ اکثر اپنا حق چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

علمی اختلافات ہو یا دوسرے مکاتب فکر سے بحث ومباحثہ، آپ اسے نزاع وجدال کی حد تک پہنچانے سے حتی الوسع روکتے تھے، اور کسی بزرگ (شاید امام زہری) کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے:

"المِرَاءُ يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ"(96).

''یعنی جھگڑوں سے علم کا نور جاتا رہتا ہے(97)۔''

تواضع وفنائیت:

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے، تواضع اور چیز ہے، اور تواضع کا مظاہر بالکل دوسری چیز۔ تواضع کا مظاہر تو ہر شخص اپنی جبلت کے مطابق کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا ہے، لیکن محض اپنے آپ کو خاکسار، نیاز مند، ناچیز، وغیرہ کہہ لینے سے تواضع کی حقیقت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بقول حضرت حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ:

> ''تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ حقیقت میں اپنے آپ کو ''لاشئ'' سمجھے، اور ہیچ سمجھ کر تواضع کرے، اپنے کو رفعت کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے''(98)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی صفت تواضع کے حوالے سے حافظ اکبر شاہ بخاری صاحب رقم طراز ہیں:

> ''ساری عمر آپ کا معاملہ یہ رہا کہ ملاقاتیوں کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا، بلکہ جب کوئی آگیا، خواہ کتنے ضروری کام میں مشغول ہوں، اس سے ملاقات فرمائی، اس طرز کے نتیجے میں آپ کو سخت دشواری اٹھانی پڑتی تھی۔
>
> بعض اوقات تصنیف وتالیف کے وقت لوگ پہنچ جاتے اور کام میں رکاوٹ پڑ جاتی، اور بعض مرتبہ کسی دوسرے اہم کام میں مشغول ہوتے اور کوئی شخص اپنی معمولی ضرورت لے کر آجاتا تو اس کی ضرورت پوری فرمانے کی وجہ سے وہ اہم کام رک جاتا، ہم لوگوں نے بارہا عرض کیا کہ ملاقات کے لیے ایک وقت مخصوص مقرر فرما دیں، تاکہ جس کسی کو ملنا ہو وہ اسی وقت میں آکر مل لیا کرے، اور بے وقت پریشانی نہ ہو، لیکن آپ ہمیشہ اس بات کو ٹال جاتے تھے، جب ہمارا اصرار بہت بڑھا تو ملاقات کا وقت تو مقرر فرما دیا۔
>
> لیکن اگر کوئی شخص دوسرے وقت میں آجاتا تو ملاقات سے انکار پھر بھی نہ فرماتے، جس کے نتیجہ

میں یہ ہوا کہ وقت کا وہ تعین نتیجہ خیز نہ ہو سکا، جب لوگوں کے بے وقت آنے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا تو ہم نے پھر کہنا شروع کیا کہ جب تک آپ کچھ لوگوں سے بے وقت ملاقات سے انکار نہ فرمائیں گے، اس وقت تک تعین وقت کا خاطر خواہ نتیجہ ظاہر نہ ہوگا، ہماری اس بات کے جواب میں آپ ہمیشہ طرح دے جاتے، اور اپنے اس طرز عمل کی کوئی خاص وجہ بھی بیان نہ فرماتے۔

آخر ایک روز میں نے اپنی حماقت سے یہ عرض کر دیا کہ ''اباجی! حضرت تھانوی قدس سرہ کے یہاں تو ہر چیز کا نظام الاوقات مقرر تھا اور کسی کو اس کی مخالفت کی اجازت نہ تھی''۔

احقر (مفتی محمد تقی عثمانی) کی اس بات پر حضرت والد صاحب اس روز پہلی بار کھلے، اور فرمایا:

''ارے بھائی، میں حضرت کے مقام و منصب کی ہوس کروں تو مجھ سے زیادہ احمق کون ہوگا؟ حضرت کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام عطا فرمایا تھا اس کی بناء پر انھیں حق پہنچتا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے نظام الاوقات کا تابع بنائیں، انھیں جن عظیم دینی کاموں کے لئے اللہ نے پیدا فرمایا تھا، وہ اس کے بغیر کیسے انجام پا سکتے تھے، اس کے علاوہ لوگوں کو ان سے انمول فائدہ پہنچتا تھا، اس لئے اگر اس فائدے کے حصول کے لئے انھیں کچھ مشقت اٹھانی پڑی تو کچھ حرج نہ تھا، لیکن میں کیا ہوں؟ اور میرا مقام کیا ہے؟ میں خلق خدا کو کس بنیاد پر آنے سے روکوں؟ میں نے وقت تو تمھارے کہنے سے مقرر کر دیا ہے، تاکہ لوگوں کو سہولت ہو جائے، لیکن جو شخص محنت اٹھا کر پہنچ ہی گیا، اسے واپس کرنے کا تو نہ مجھے حق ہے، نہ میرے بس کی بات ہے۔''

اس روز پہلی بار اس طرز عمل کی اصل وجہ معلوم ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ میری عقل حیران تھی جس شخص نے خدمت دین کا اتنا ہمہ گیر کام انجام دیا ہو، اور جس کا صبح و شام لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہو، اسے نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور نہ ہی اس بات کا اندازہ ہے کہ اس کی ذات سے خلق خدا کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ آپ کے ان جملوں کو محض زبانی بات بھی

نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ اول تو وہاں غلط بیانی کا شائبہ بھی امکان سے باہر تھا، دوسرے یہ بات تنہائی میں اپنے بیٹے سے کہی جارہی ہے جہاں تواضع کے رسمی مظاہرے کا کوئی سوال نہیں لہذا سوائے اس کے کیا کہہ جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو

''اللهم اجعلني فی عینی صغیرا وفی أعین الناس کبیرا''[99]

اور''من تواضع لله رفع الله''[100]

کا مثالی مظہر بنادیا تھا[101]۔

صبر وشکر:

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو''صبر شکر'' کا بھی عجیب وغریب ذوق عطا فرمایا تھا، اس حوالے سے جناب حافظ اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

''آپ کی زبان اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کے شکر سے تر وتازہ رہتی، معمولی معمولی باتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا جزوزندگی بن چکا تھا، کوئی ایسی ملی جلی خبر ملتی جس میں غم اور خوشی کے دونوں پہلو ہوتے تو خوشی کے پہلو پر زور دیتے، اور پہلے اس پر شکر ادا فرمالیتے، اور غم کے پہلو کا یا تو ذکر ہی نہ فرماتے، یا شکر کے بعد غیر اہم انداز میں اس کا تذکرہ کرتے۔

اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں پر آزمائشیں ان کے مقام کے لحاظ سے آتی ہیں، چنانچہ زندگی میں آپ کو بڑے بڑے کٹھن حادثات سے دوچار ہونا پڑا، بیماریاں بھی ایسی تکلیف دہ آئیں کہ ان کی تصور ہی سے

رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، عین عالم شباب ہی سے آپ کو طرح طرح کے عوارض لگ گئے تھے، اور عمر کے آخری آٹھ دس سال تو پیہم مختلف قسم کی بیماریوں کا بار بار حملہ ہوتا رہا، لیکن سخت سے سخت حادثے اور بڑی سے بڑی بیماری پر بھی آپ کو بے صبری کا مظاہرہ کرتے نہیں دیکھا گیا، اس کے برعکس عادت یہ تھی کہ ہر حادثے ہر تکلیف میں قابل شکر پہلوؤں پر غور فرما کر ان پر شکر ادا کرتے تھے۔

محرم ۱۳۹۵ھ میں احقر [مفتی تقی عثمانی] کے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد ذکی کیفی مرحوم نے اچانک داغ مفارقت دے دیا، والد صاحب کو ان سے بے پناہ تعلق تھا، اور نرینہ اولاد میں وہ چونکہ سب سے بڑے تھے، اس لئے زندگی کے ہر مرحلے میں آپ کو ان سے راحت بھی سب سے زیادہ پہنچی، ان کی وفات ایک ایسی رات میں ہوئی جب آپ خود مختلف قسم کی بیماریوں کی بنا پر صاحب فراش تھے، اور ٹانگوں میں ہر پیپر کی اتنی اذیت ناک سوزش تھی کہ عمر بھر ایسی اذیت آپ کو بھی یاد نہیں تھی، اس حالت میں آپ کو ایسے جوان بیٹے کی وفات کا صدمہ پہنچا، ہمارے لئے یہ بات ناقابل تصور تھی کہ اس عالم میں آپ ایسے جانکاہ صدمے کو کیسے برداشت کریں گے! لیکن اس پیکر تسلیم ورضا نے اس روح فرسا حادثے پر جو تبصرہ فرمایا۔ وہ بھائی جان مرحوم کے بچوں کے نام ایک خط سے واضح ہو گا۔ اس خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ اللہ والے کس انداز پر سوچتے ہیں، اور ان کی پرواز فکر کے آگے دنیا کے بڑے سے بڑے حوادث کیا حیثیت رکھتے ہیں:

''میرے عزیز بچو! یہ واقعہ جیسا کرب انگیز، حسرت ناک وجانکاہ ہے اس کا اثر مرحوم ہو جانے والے نوجوان صالح کے ماں باپ، بچوں اور بیوی اور بھائی بہنوں پر درجہ بدرجہ جو کچھ ہونا تھا وہ ایک طبعی اور فطری امر ہے، اور جب تک حدود سے تجاوز نہ ہو، شرعاً مذموم بھی نہیں، لیکن یہ سب کرب انگیزی اور غم وصدمہ کا ایک طرفہ پہلو صرف اس بنیاد پر ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں، اور یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ ایک پچاس سالہ

نوجوان جس کے ساتھ ایک عزیز کی ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں، یکایک ہم سے رخصت ہو گیا۔اس کا اثر ظاہر ہے کہ بے چینی اور شدید ترین صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔

آؤاب واقعات کو ذرا سید ھا پڑھو کہ صبر آئے، بلکہ شکر کا موقع ملے۔

ذرا سمجھو کہ ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان کی عمر کی گھڑیاں اور سانس اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کے دفتر میں لکھے ہوتے ہیں، جانے والا لخت جگر پچاس سال سترہ دن کی زندگی لے کر اس دنیا میں آیا تھا، زمین آسمان اپنی جگہ سے ٹل سکتا تھا، قضاو قدر کے اس فیصلے میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آسکتا تھا۔۔۔۔ لیکن ذرا یہ سوچو کہ اس حادثہ کے جانکاہ کو ہم سب پر آسان کرنے لئے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے کیسے کیسے انعامات فرمائے۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ الحمد للہ! اپنی اولاد کو وہ اس حالت میں چھوڑ گئے جبکہ وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔۔۔۔ذرا سوچو کہ اگر یہ معاملہ اس کے خلاف ہوتا تو یہی ایک مصیبت دس گنی بن جاتی۔

دوسری بات یہ دیکھو کہ مرحوم کو جس قدر گہرا تعلق اپنی بیوی اور اولاد سے تھا، ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھی اس سے کچھ کم نہ تھا۔۔۔۔

اس سال جب اللہ جل شانہ کو اس دنیا سے ان کی جدائی ہمشہ کے لئے منظور ہوئی تو غیر شعوری طور پر چار مرتبہ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان کو بار بار کراچی آنا پڑا اور ایک مرتبہ سب بچوں کے ساتھ آنے کا موقعہ بھی مل گیا۔یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ بار بار کی ملاقات اللہ تعالیٰ کے انعامات اور آئندہ پیش آنے والے صدمے پر تسلی کے سامان تھے۔

تیسری بات یہ دیکھو کہ سب سے بڑا ہونہار بیٹا مولوی محمود سلمہ، تین ماہ پہلے ان سے جدا ہو چکا تھا جس سے ملنے کا اس حادثہ جانکاہ سے پہلے بظاہر کوئی امید نہ تھی، قدرت نے غیبی سامان فرما دیا۔امسال ان کے لئے حج کا سامان

ہو گیا، اور اس طرح وہ حج وزیارت کے فرائض اور حرمین شریفین کے برکات سے بھی بہرہ ور ہوئے، اور سعادتمند بیٹے کو بھی اٹھارہ دن ان کی مکمل خدمت کا موقع مل گیا۔

پھر یہ بھی سوچو کہ عادۃ حج وزیارت میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس خوش نصیب بندے کو صرف اٹھارہ دنوں میں حج وزیارت کے تمام مراحل سے گزار کر ایسے وقت کراچی پہنچادیا جبکہ ان کی وفات میں صرف سترہ دن باقی تھے۔ اگر مواصلاتی نظام میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو مرحوم اپنے بیوی بچوں، ماں باپ، اور اولاد اور بیوی پر کیا گزرتی۔

ان تمام انعامات سے بڑھ کر سب سے بڑا انعام یہ کہ آخری عمر میں ان کو حج وزیارت سے مشرف فرما کر گناہوں سے پاک فرمادیا، اور پاک وصاف اپنی بارگاہ میں بلالیا۔

اب غور کرو، اگر جانے والے مرحوم کو سال بھر پہلے قطعی اطلاع ہو جاتی کہ عاشورہ محرم ۱۳۹۵ھ ان کا آخری دن ہے، اور وہ خود اپنے مرنے کا سامان کرتے تو اس سے بہتر اور مرنے کا کیا سامان ہوتا؟"[102]۔ (مکتوب ختم ہوا)

اس مکتوب میں حضرت والد صاحب کی یہ مزاج پوری طرح جلوہ فگن ہے کہ وہ سخت سے سخت حادثے میں بھی اس کے قابل شکر پہلوؤں کا استحضار فرماتے، ان پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے۔ اور مصائب وآلام کے شکوے کے بجائے راضی برضاء رہنے کو آسان بنادیتے تھے[103]۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنے والد ماجد کے صبر وشکر کے حوالے ایک اور واقعہ یوں سپرد قلم کرتے ہیں:

"ایک اور واقعہ یاد آیا، احقر کی بڑی ہمشیرہ کے دانت خراب ہو گئے تھے، اور یکے بعد دیگرے انھیں کئی دانت نکلوانے پڑے جس پر انہوں نے کافی تکلیف اٹھائی، ایک مرتبہ وہ دانت نکلوا کر حضرت والد

صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ نے ان کا حال احوال پوچھا تو اپنا حال بتاتے ہوئے ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ ''اباجان! یہ دانتوں کا معاملہ بھی عجیب ہے، یہ جب بچپن میں نکلتے ہیں تو اس وقت تکلیف دیتے ہیں۔اور جب ٹوٹنے پر آتے ہیں تو اس وقت بھی تکلیف دیتے ہیں۔''

حضرت والد صاحب نے یہ بات سنی تو قدرے ناگواری کے ساتھ فرمایا: بیٹی! تمہیں ان دانتوں کی بس یہ دو باتیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی تھی اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور ان دونوں واقعات کے درمیان سالہا سال تک تم نے اس خدائی مشین کو استعمال کرکے جو لذت وراحت حاصل کی اس کی طرف کوئی دھیان نہیں؟''۔

اس طرح حضرت والد صاحب باتوں باتوں میں اپنے متعلقین کو بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحضار اور ان پر ادائے شکر کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ ہمشیرہ محترمہ نے اس پر فوراً استغفار کیا اور فرماتی ہیں کہ بحمد اللہ اس کے بعد ایسا سبق مل گیا کہ اب ایسے کلمات زبان پر نہیں آتے جن سے ناشکری مترشح ہوتی ہو''(104)۔

کشف و کرامات:

اہل اللہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب ان کا تعلق اللہ سے مضبوط تر ہو جاتا ہے، وصالِ حق میں وہ جب ایک خاص درجے پر پہنچ جاتے ہیں تو خدائے تعالیٰ ان کے ہاتھ پر کرامات کا ظہور فرماتے ہیں، حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی ان اہل اللہ میں سے تھے، حضرت کے صاحبزادے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات کے متعلق فرماتے ہیں:

''جہاں تک کرامات کا تعلق ہے، سچ پوچھئے تو مجموعی طور سے ان کا پورا اندازِ زندگی مستقل کرامت ہی تھا، حدود کی باریک بینی، متعارض حقوق میں یہ توازن، طرزِ معیشت میں یہ متوکلانہ انداز، دنیا میں رہ کر اور اُسے بھر

پور طریقے سے برت کر بھی قلب وروح کا یہ زہد، دسیوں طرح کی شدید مصروفیات کے عین درمیان اللہ تعالیٰ سے یہ پیہم تعلق ورابطہ، تصنیف وتالیف اور فتویٰ نویسی کی یہ حیرت انگیز رفتار، اِتنے مختلف النوع کاموں کی بیک وقت انجام دہی، اور اس کے باوجود چہرے سے لے کر قلب وروح تک چھایا ہوا یہ سکون، غور سے دیکھئے تو ان میں سے ہر ہر بات ایک کرامت تھی، ایسی کرامت جو ہوا میں اُڑنے اور پانی میں تیرنے سے کہیں زیادہ مطلوب و محمود اور لائق رشک و تقلید ہے"۔

کشف و کرامات کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مذاق وہی تھا جس پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے جابجا زور دیا ہے کہ وہ دین میں مقصود نہیں اور ان کے حصول کے پیچھے پڑنے کے بجائے انسان کو اتباع سنت کی کوشش میں لگنا چاہیے لیکن بہر حال! اس سے کسی اہل حق کو انکار نہیں ہے کہ یہ کمالات اگر اتباع سنت کے ساتھ اور ان کی حقیقت سمجھتے ہوئے کسی کو حاصل ہوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطا ہیں۔۔۔۔ حضرت والد صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے بعض خاص مواقع پر اس عطا سے نوازا، تھانہ بھون میں رہتے ہوئے آپ کو متعدد مکاشفات ہوئے جن کا تذکرہ حضرت حکیم الامت کے نام آپ کے خطوط میں موجود ہے، اور اس کے بعد کئی مواقع پر آپ کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا گیا، لیکن آپ عموماً اس کا تذکرہ نہیں فرمایا کرتے تھے، اس سلسلے کی جو باتیں ہم میں سے بعض لوگوں کو معلوم ہو گئیں وہ بھی آپ نے کسی ضرورت سے بیان فرمادی تھیں، ورنہ آپ اس کے ذکر سے احتراز ہی فرماتے تھے"(105)۔

اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ایک واقعہ ذکر کیا ہے جس میں پوری امت کیلئے ایک عملی پیغام ہے، چنانچہ مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب مدینہ طیبہ جانا ہوتا، اور روضۂ اقدس پر سلام عرض کرنے کے لئے حاضری ہوتی تو عام معمول یہ تھا کہ مواجہہ شریف کی جالیوں سے کافی فاصلے پر ایک ستون کے قریب سراپا ادب بن کر سر جھکائے کھڑے رہتے، اور اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اسی ستون کے قریب کھڑا تھا، دل میں شوق پیدا ہوا کہ آگے بڑھ کر مقدس جالیوں تک پہنچ جاؤں، لیکن ہمت نہ ہوئی، اس پر حسرت سی ہونے لگی کہ لوگ آگے تک چلے جاتے ہیں، اور میں دور کھڑا ہوں، اسی دوران یہ محسوس ہوا کہ روضۂ اقدس سے یہ آواز آ رہی ہے ''کہہ دو کہ جو شخص ہماری سنتوں کا اتباع کرتا ہے، وہ ہم سے قریب ہے، خواہ بظاہر کتنا دور ہو، اور جو شخص ہماری سنت کا متبع نہیں، وہ ہم سے دور نہیں، خواہ وہ ہماری جالیوں سے چمٹ کر کھڑا ہو''۔

حضرت والد صاحب نے اپنا یہ واقعہ اپنا کہہ کر تو گنے چنے چند حضرات ہی کو سنایا، اور خوش قسمتی سے احقر نے بھی براہ راست سنا، لیکن یہ بات بہت سی تقریروں میں بھی کہہ کر سنائی کہ ایک زائر کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اور اسے روضۂ اقدس سے یہ ہدایت ملی۔

یہاں بھی حضرت والد صاحب نے تمام حدود کو محفوظ رکھا، چونکہ جو آواز محسوس فرمائی تھی اس میں الفاظ یہ تھا کہ کہہ دو، جس کا مطلب بظاہر یہی تھا کہ یہ بات دوسروں تک بھی پہنچاؤ، اس لئے آپ نے تقریروں اور عام جلسوں میں یہ بات اہتمام کے ساتھ پہنچائی۔ لیکن چونکہ اسے اپنی طرف منسوب کر کے سنانے میں تواضع اور حجاب مانع رہا، اس لئے اپنی طرف صراحتاً منسوب نہیں فرمایا، اور ساتھ ہی کوئی غلط بیانی بھی نہیں فرمائی، بلکہ اسے ''ایک زائر'' کی طرف منسوب فرما دیا جس سے مراد خود آپ ہی تھے[106]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

ادب و عظمت، اتباع و اطاعت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہمارے اکابر کا شیوہ رہا ہے، ان کے یہی اوصاف عشق ہیں جس کے باعث ان کے تذکرے منور اور ان کی شخصیتیں بلند ہیں۔ حضرت مفتی صاحب بھی ایک سچے عاشق رسول تھے، آپ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا، اس حوالے سے مولانا اظہار الحسن محمود صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''جب مدینہ طیبہ زادھا اللہ شرفاً وفضلاً جاتے تو کبھی روضہ اقدس کی جالی تک پہنچ ہی نہیں پاتے تھے، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ جالیوں کے سامنے ایک ستون ہے اس ستون سے لگ کر کھڑے ہو جاتے بلکہ وہاں اگر کوئی آدمی کھڑا ہوتا تو اس کے پیچھے ہو کے کھڑے ہو جاتے اور ایک دن خود ہی فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید تو بڑا شقی القلب آدمی ہے یہ اللہ کے بندے ہیں جو جالی کے قریب تک پہنچ جاتے ہیں اور قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سرکار عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جتنا بھی قرب حاصل ہو جائے، نعمت ہی نعمت ہے لیکن کیا کروں کہ میرا قدم آگے بڑھتا ہی نہیں''[107]۔

اختلاف رائے کا اسلوب و انداز:

اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ علم و تحقیق کے سفر میں دوسرے عالم سے اختلاف کرنا پڑتا ہے اور بعض مقامات پر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف رائے بھی کرنی پڑتی ہے، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ایک جید عالم تھے اس لئے آپ نے ایسے حالات کا سامنا کیا اور بخوبی کیا، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''آپ نے بعض بڑے مسائل میں بڑے بڑے علماء سے بھی اختلاف کیا، بلکہ اپنے شیخ و مربی حکیم

الامت حضرت تھانوی قدس سرہ سے بھی چند فقہی مسائل میں اختلاف رائے رہا، اور خود حضرت نے آپ سے یہ فرمایا کہ تمھارے دلائل پر مجھے شرح صدر نہیں ہوتا، اور میرے دلائل پر تمھیں شرح صدر نہیں، اس لئے دونوں اپنے موقف پر رہیں تو کچھ حرج نہیں، لیکن ایسے مواقع پر حضرت والد صاحب کا عام معمول یہ تھا کہ جن صاحب سے اختلاف رائے ہوا ہے، نہ صرف یہ کہ ان کے ادب واحترام میں کوئی ادنی فرق نہ آنے دیتے، بلکہ ان کے کلام کا کوئی صحیح عمل بھی تلاش کر کے لکھ دیتے، مثلاً ''اوزان شرعیہ'' میں رائج الوقت اوزان کے لحاظ سے ''درہم'' کی مقدار مقرر کرنے میں آپ نے حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے محقق عالم سے اختلاف فرمایا، لیکن اس کے لئے صرف اپنے دلائل او رحضرت مولانا کے دلائل کی تردید پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ جستجو کر کے وہ وجہ بھی بیان فرمادی جس سے حضرت مولانا کا عذر واضح ہو جاتا ہے۔

بڑوں کے علاوہ جب کبھی اپنے کسی معاصر عالم سے بھی کسی مجتہد فیہ مسئلے میں کوئی اختلاف ہوتا تو آپ اس کے ادب واحترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے، اور کوئی ایسا اقدام نہ فرماتے جس سے اس کے علمی مقام کو ٹھیس پہنچے، یا عوام میں اس کا اعتماد مجروح ہو''(108)۔

غلطیوں پر ٹوکنے کا حکیمانہ انداز:

''امر بالمعروف'' کی طرح ''نہی عن المنکر'' بھی اہم شرعی فریضہ ہے، لیکن اس فریضے کی ادائیگی کے لئے حکمت اور للہیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر اس نازک فریضے کی ادائیگی میں اعتدال وتوازن کی حدود پر قائم رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا معمول قابل تقلید تھا، چنانچہ محمد تقی عثمانی صاحب اپنے والد ماجد کے چند واقعات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نکیر (ملامت) ہمیشہ منکر (بری یا ناجائز بات) پر ہونی

چاہیے اور غیر منکر پر نکیر کرنا خود نکیر ہے۔ لہٰذا بعض لوگ جو مباحات پر یا محض آداب و مستحبات کے ترک پر نکیر شروع کر دیتے ہیں، ان کا طرز عمل درست نہیں ہے، آداب و مستحبات کی تعلیم و تبلیغ تو کرنی چاہیے، ان کی ترغیب بھی دینی چاہیے، اگر کوئی شخص کسی مستحب کو چھوڑ دے تو اسے تنہائی میں نرمی سے متوجہ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن اس پر نکیر و ملامت کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جو حضرات محض کسی ترک مستحب پر مجمع عام میں روک ٹوک یا ناراضگی کا اظہار شروع کر دیتے ہیں ان کے طرز عمل میں دو غلطیاں ہوتی ہیں، ایک تو غیر منکر پر نکیر کرنا، دوسرے جس شخص پر روک ٹوک کی جارہی ہے اسے مجمع عام میں رسوا کرنے کا انداز اختیار کرنا اور اللہ بچائے بعض اوقات اس تمام نکیر و ملامت کے پس پشت عجب و پندار اور نفسانیت بھی کار فرما ہوتی ہے جو ایک مستقل گناہ ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو حضرات اس طرز عمل پر کاربند ہوتے ہیں۔ عام طور سے دیکھا یہ ہے کہ دین کے اہم معاملات سے ان کی نگاہیں اوجھل رہتی ہیں۔ آداب و مستحبات بڑے محبوب اعمال ہیں، ان پر جتنا وسعت میں ہو، عمل کرنا چاہیے، اور دوسروں کو پیار محبت سے ان کی ترغیب بھی دینی چاہیے، لیکن ان کے ترک پر نکیر و ملامت کا انداز اختیار کرنا درست نہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عالم یا دینی مقتداء کے حلقہ میں آپ کا جانا ہوتا، اور وہاں کے عوام میں آپ کوئی ایسی عام غلطی دیکھتے جو اس عالم یا مقتدا کے علم میں رہی ہو تو وہ اس غلطی پر خود کو عوام کے لیے نہیں ٹوکتے بلکہ اس عالم یا مقتدا کو تنہائی میں متوجہ فرما دیتے تھے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف سے مسئلہ بنا کر ان کے عمل کی اصلاح کر دیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ اگر میں براہ راست لوگوں کو مسئلہ بتا دوں تو لوگ شاید میرے علم و فضل کے تو قائل ہو جائیں، لیکن جس عالم یا دینی رہنما سے ان کا دن رات کا سابقہ ہے اس کی طرف سے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو گی کہ ہم اتنے دن

سے ان صاحب کے ساتھ رہتے ہیں، مگر انہوں نے ہمیں کبھی اس غلطی پر متوجہ نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے انھیں دینی فائدہ پہنچ رہا تھا اس پر اعتماد میں کمی آجائے گی جو ان کے دین کے لئے نقصان دہ ہو گی[109]۔

ایک مرتبہ ایک ایسے ہی موقع پر حضرت والد صاحب نے بتایا کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ تو اس معاملے میں اس حد تک احتیاط فرماتے تھے کہ جب کبھی کسی دوسرے شہر میں جانا ہوتا، اور کوئی شخص مسئلہ پوچھنے کے لئے آتا تو عام طور سے خود بتانے کے بجائے اس شہر کے مفتی کا پتہ بتاتے کہ ان سے جا کر معلوم کرو، اور اپنے رفقاء سے فرماتے کہ اگر میں اس شخص کو مسئلہ بتادوں، اور مقامی علماء یا مفتی حضرات کے بتائے مسئلے سے کچھ فرق ہو جائے تو میں تو کل یہاں سے چلا جاؤں گا، اور یہ لوگ مقامی علماء سے بدگمان ہو کر آئندہ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے وقت جھجک محسوس کریں گے۔

اللہ اکبر! اندازہ لگایئے ان حضرات کی حکیمانہ اور دورس نگاہ کا کہ دینی ضرورتوں کے معاملے میں کہاں تک نظر پہنچتی ہے، اور یہ سب کچھ در حقیقت ثمرہ ہے اس اخلاص اور للّٰہیت کا جس کے پیش نظر اپنی بات اونچی کرنا یا اپنی علمیت جتانا نہیں، بلکہ صحیح معنی میں دین کی خدمت اور عوام کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔

مجمع عام میں کسی شخص کو رسوا کن انداز میں ٹوکنے کا تو آپ کے یہاں سوال ہی نہ تھا، عام طور سے تنہائی میں فہمائش فرمایا کرتے تھے، لیکن اس میں بھی طریقہ یہ تھا کہ بات بات پر تنبیہ فرمانے کے بجائے ایک مرتبہ اطمینان سے بٹھا کر تمام ضروری باتوں پر متنبہ فرما دیتے تھے، جس وقت کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو اس وقت کبھی اسے نہیں سمجھاتے تھے، بلکہ ایسے طریقے اختیار فرماتے جس سے اس کے جذبات پہلے ٹھنڈے ہو جائیں، اور جذبات کے معتدل ہو جانے پر فہمائش کرتے تھے۔

اسی طرح جب آپ اپنی اولاد، شاگردوں، یا مرشدین میں سے کسی کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی ضرورت محسوس فرماتے تو عام طور سے ایسی حالت میں اسے نہیں ڈانٹتے تھے جب خود طبعی طور پر غصہ آرہا ہو، اس کے بجائے ایسے وقت کا انتظار فرماتے تھے جب اپنے جذبات معتدل ہو جائیں، چنانچہ جب طبعی غصہ ٹھنڈا ہوتا اور طبیعت پر نشاط ہوتا تو اس وقت اسے بلوا کر تنبیہ کرتے، اور ضرورت ہوتی تو غصے کا اظہار بھی فرماتے، سخت سے سخت بات بھی کہہ دیتے، لیکن یہ سب کچھ خالص تادیب کے لئے ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ طبعی غصے کی حالت میں تنبیہ کرتے ہوئے اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے، اور اس میں اس بات کا فوری خطرہ ہوتا ہے کہ تادیب کے بجائے طبعی جذبات گفتگو میں شامل ہو جائیں اور جتنی سختی کی فی الواقعہ ضرورت ہے اس سے زیادہ سختی ہو جائے جو انصاف کے بھی خلاف ہو اور مقصد کے لئے بھی مضر ہے۔

فرمایا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ کی نصیحت یہی تھی کہ جب کبھی بچوں کو ڈانٹنے یا سزا دینے کی ضرورت ہو تو غصے کی حالت میں کبھی نہ دو۔

معتدل حالت میں جتنی سختی ضروری ہو اتنی کرو، خواہ اس کے لئے مصنوعی غصہ پیدا کرنا پڑے، ورنہ طبعی غصے میں جو تنبیہ ہوتی ہے اس میں تادیب کا پہلو پیچھے چلا جاتا ہے اور محض غصہ نکالنا رہ جاتا ہے۔

پھر حضرت والد صاحب کا معمول یہ بھی تھا کہ جب کبھی اپنے کسی چھوٹے یا ماتحت پر غصہ کا اظہار فرماتے یا ضرورۃً اس پر سختی فرماتے تو کسی دوسرے وقت اس کی اس طرح دلداری بھی ضرور فرما دیتے تھے جس سے دل شکنی کا اثر تو زائل ہو جائے، لیکن تادیب کا اثر زائل نہ ہو، کبھی س کی کوئی مالی مدد فرمادی، کبھی اس کے کسی اچھے کام کا انعام بھی دے دیا، کبھی مجمع عام میں اس کی کسی خوبی کی تعریف فرما

دی، غرض کسی مناسب طریقے سے اس کی ہمت افزائی کا سامان بھی فرما دیتے تھے۔

حضرت والد صاحب کے عمل میں بارہا اس بات کا مشاہدہ ہوا کہ عین غصے کی حالت میں جب آپ کسی کو ڈانٹ رہے ہوں، اگر خود یا کسی کے متوجہ کرنے سے اپنی کسی غلطی کا احساس ہو جاتا تو عین غصے میں بھی اس کا اعتراف فرما لیتے، اور اس پر استغفار بھی فرماتے، یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے، عمل میں اتنی ہی مشکل ہے، اور جب تک کسی شخص نے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے برسوں کسی شیخ کامل کی زیر نگرانی ریاضت نہ کی ہو، اس پر عمل بے حد دشوار ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحب کا یہ طرز عمل در حقیقت اپنے شیخ کے عمل سے مستنیر تھا[110]۔

عقیدہ کی حدود:

انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اور بزرگان سلف کی عقیدت و محبت کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے، اس عقیدت و محبت میں کمی ہو تو انسان کے دین و ایمان میں نقص آ جاتا ہے اور حد سے زیادتی ہو جائے تو وہی بدعت، بلکہ بعض صورتوں میں شرک بن جاتی ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بزرگان دین سے بہت عقیدت و محبت تھی، خاص کر اپنے اساتذہ و مشائخ اور اکابر علمائے دیوبند کے تذکرے میں تو آپ بے خود سے ہو جاتے تھے، اس حوالے سے آپ کے سوانح نگار مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

"آپ کو اپنی زندگی میں جس قدر عقیدت و محبت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے تھی، روئے زمین پر اتنی عقیدت و محبت کسی سے نہیں ہوئی، حضرت کا اسم گرامی زبان پر آتے ہی آپ کے چہرے پر عجیب بشاشت پیدا ہو جاتی، اور بار بار اس قسم کے جملے ارشاد فرماتے کہ:

"ہمارے حضرت کا معاملہ عجیب تھا، ہمارے حضرت کے یہاں تو ہر چیز عجیب تھی، حضرت کی تو

شان ہی عجیب تھی'' اس کے باوجود ان کے ساتھ اظہار عقیدت میں حدود کی جو رعایت دیکھنے میں آئی، کم از کم احقر نے اس کی نظیر نہیں دیکھی۔ دو واقعات سے اس کا کچھ اندازہ ہو گا۔

۱۳۹۴ھ جب حضرت والد صاحب کو پہلی بار دل کا شدید دورہ ہوا، اور اس کی وجہ سے آپ تین ہفتے ہسپتال میں رہے تو آپ نے اپنے شیخ کے طرز عمل کے مطابق ایک مضمون شائع کرایا جس میں اپنے احباب اور ملنے جلنے والوں سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ اگر انھیں آپ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو اسے للہ فی اللہ معاف فرما دیں، اور اگر کوئی مالی حق کسی کے ذمے رہ گیا ہو تو وہ وصول کر لیں یہ مضمون ''کچھ تلافی مافات'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

جب حضرت والد صاحب کے دل میں اس مضمون کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا تو آپ نے احقر کو اس کا مفہوم بتلا کر اسے تحریری شکل میں مرتب کرنے کا حکم دیا، اور یہ ہدایت فرمائی کہ پہلے حضرت تھانوی قدس سرہ کے رسالے ''العذور والنذر'' کو پڑھ لینا، اور مضمون کی تمہید میں حضرت کے اس رسالے کا تعارف کرانے کے بعد اسی کے طرز پر اسے مرتب کر دینا۔

احقر کو جب کبھی حضرت والد صاحب کی طرف سے کوئی تحریر لکھنی ہوتی تھی تو اس کا بڑا بوجھ ہوتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا محض کرم تھا کہ کئی مرتبہ آپ کی مختلف تنبیہات سے سرفراز ہونے کے بعد احقر کی تحریر والد صاحب کے لئے قابل برداشت ہو گئی تھی اور آپ کبھی ہمت افزائی کے لئے یہ بھی فرما دیتے تھے کہ ''بحمد اللہ'' اب مجھے تمھاری تحریر میں عموماً قلم لگانا نہیں پڑتا''۔

اس کے باوجود اس تحریر کا مجھ پر بہت بوجھ تھا، معاملہ نازک سا تھا، جس میں بہت سے پہلوؤں کی رعایت کرنی تھی، اور سب سے بڑھ کر ایک جذباتی رکاوٹ تھی، اور وہ یہ کہ والد صاحب اس مضمون کے آغاز میں اس مفہوم کے جملے لکھوانا چاہتے تھے کہ ''اب میرا وقت قریب معلوم ہوتا ہے کسی بھی وقت

بلاوا آسکتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ، اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہ باتیں حقیقت ہیں مجھے اس ماحول میں اپنے قلم سے اس قسم کے جملے لکھنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے زیادہ صبر آزما معلوم ہوتا تھا۔ اور اس زمانے میں اباجی کی طبیعت بہت کمزور، نازک اور حساس ہو گئی تھی، مزاج کے خلاف ذرا سی بات سے طبیعت میں تغیر پیدا ہو جاتا جو بعض اوقات صحت کے لئے سخت مضر ہوتا تھا، اس کے علاوہ طبعی پریشانی ہسپتال کے انتظامات اور وہاں کے ماحول کی وجہ سے کسی تحریری کام کے لئے ذہنی سکون یکسوئی بھی میسر نہ تھی، اس لئے یہ چار صفحات کی تحریر میرے لئے ایک پہاڑ بن گئی۔

بہر کیف! اللہ تعالیٰ سے دعا کی، خدا جانے کس طرح میں نے چار صفحے لکھے، اور حضرت والد صاحب کو سنانے شروع کئے، یہ تو انھی کی عادت و توجہ و برکت تھی کہ بآلاخر انہوں نے اسے پسند فرمالیا، لیکن ابتداء میں جب میں نے لرزتی ہوئی آوز میں یہ مضمون سنانا شروع کیا اور اس میں اس قسم کا جملہ آیا کہ ''حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اس مقصد کے لئے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا'' تو میں نے دیکھا کہ حضرت کے چہرے پر قدرے تکدر کے سے آثار نمودار ہوئے اور فرمایا:

''جاؤ میاں! تمھیں اب تک حضرت کا نام بھی لکھنا نہ آیا، اور حضرت کا تذکرہ اس طرح کر دیا جیسے کسی اجنبی عالم کا ذکر کر دیا جاتا ہے، خدا کے بندے! تم یہ تحریر میری طرف سے لکھ رہے ہو، اور اس حالت میں لکھ رہے ہو تو حضرت کے ساتھ میرے تعلق کو بھی تو ملحوظ رکھو، وہ امت کے تو حکیم تھے، مگر یہ بھی بتاؤ کہ میرے لئے کیا تھے؟ تمھیں الفاظ کا بخل بھی یہیں کرنا تھا، ارے یوں لکھو کہ میرے شیخ و مرشد، میرے آقا اور مربی، سیدی وسندی، مولائی و مرشدی۔۔۔ الخ''، اور ان کے آخری الفاظ پر آپ کی آواز بھرا گئی، آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، اور شدت جذبات میں سر تکیے پر ڈھلک گیا[111]۔

حمایت و مخالفت میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا فکری و عملی نقطۂ نگاہ:

اس بات کو تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں کہ کسی شخص یا جماعت کی حمایت و مخالفت میں جب نفسانیت ایک سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے، جب نفسانیت کی وجہ سے نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے نہ مخالفت، ہمارے معاشرے میں حمایت و مخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہو چکے ہیں، بلکہ بسااوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظور نظر ہوا تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف و توصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا، اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیر عتاب آگیا تو اس کی ساری خوبیاں ملیامیٹ ہو گئیں اور اس میں نا قابل اصلاح کیڑے پڑ گئے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس باب میں بہت عمدہ اور قابل ستائش نظریہ تھا اور آپ نے اپنی زندگی میں اس پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں سے بھی عمل کروایا، چنانچہ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''حضرت والد صاحب اس طرز فکر کے سخت مخالف تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اول تو یہ طریقہ حق و انصاف کے خلاف ہے، اس کے علاوہ اس حد گزری ہوئی حمایت و مخالفت کے نتیجے میں بسااوقات انسان کو دنیا ہی میں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے، اور اس سلسلے میں آپ ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے جو آپ سے اتنی بار سنی ہے کہ اس کے الفاظ آپ ہی کے لہجے میں یاد ہو گئے ہیں:

"احبب حبيبك هونًا ما؛ عسىٰ أن يكون بغيضك يومًا ما، وابغض بغيضك هونًا ما؛ عسىٰ أن يكون حبيبك يومًا ما"(112).

ترجمہ: اپنے محبوب سے اعتدال کے ساتھ محبت کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا مبغوض بن جائے اور جو شخص تمھیں پسند ہو اس کے ساتھ ناپسندیدگی کا اظہار بھی اعتدال کے ساتھ کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمھارا محبوب بن جائے،،(113)۔

دین کی طلب کا حیرت انگیز مقام:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح زمانۂ طالبعلمی میں ذوق وشوق سے علم حاصل کیا، اسی طرح مسند نشینی کے بعد بھی آپ کے علم کی پیاس نہ بجھی، بلکہ بڑھتی چلی گئی، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طلب دین کا عالم یہ تھا کہ علم وفضل میں مرجع خلائق ہونے کے باوجود دین کی کوئی بات جہاں سے ملتی، اسے ذوق شوق کے ساتھ حاصل کرنے کی فکر میں رہتے، آپ کو اپنے معاصرین، بلکہ چھوٹوں سے بھی استفادے میں نہ صرف یہ کہ کبھی عار محسوس نہیں ہوئی، بلکہ بعض اوقات دوسروں پر اس کا اظہار بھی فرمادیتے تھے کہ یہ بات مجھے فلاں شخص سے معلوم ہوئی۔

اللہ تعالی جنہیں دین کی تڑپ اور طلب علم کا ذوق عطا فرماتا ہے، وہ ہر اس ذریعے کی تلاش میں رہتے ہیں جس سے دین کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔ لیکن اس معاملے میں حضرت والد صاحب کے مقام بلند کا اندازہ آپ کے ایک عظیم ارشاد سے ہوگا۔ ایک روز آپ نے بر سبیل تذکرہ ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی واعظ کسی جگہ وعظ کہتا ہوا نظر آتا ہے، اور میرے پاس وقت ہوتا ہے تو میں وقت اور موقع کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ دیر کے لئے وعظ ضرور سنتا ہوں، خواہ واعظ مجھ سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ میں اسے پہنچانتا ہوں یا نہ پہنچانتا ہوں، چنانچہ اگر راستے پر جاتے ہوئے مجھے کوئی مجلس وعظ نظر آتی ہے تو کچھ دیر رک کر اس کی بات ضرور سن لیتا ہوں۔ اس لئے کہ بعض اوقات تو کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے، اور اگر پرانی ہی بات ہو تو بعض اوقات کہنے والے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ دل پر اثر کر جاتا ہے، اور اس سے بعض ایسی باتوں کی طرف عملاً توجہ ہو جاتی ہے جو پہلے معلوم تو تھیں، مگر عمل میں نہ آئی تھیں، اور اس سے ہمہ دانی کا پندار بھی ٹوٹتا ہے''[(114)]۔

وقت کی قدر شناسی:

وقت کے متعلق ایک مشہور مقولہ ہے کہ:

«الوقت كالسيف إن لم تقطعه: قطعك»[115].

ترجمہ: وقت تلوار کی مانند ہے اگر تم اسے (درست طور پر صرف کرکے) نہیں کاٹو گے، تو وقت تمھیں کاٹ ڈالے گا، (یعنی تمھارا لحاظ کئے بغیر گذر جائے گا اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے)۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو گویا ہر لمحہ اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ وقت گذر رہا ہے، اس لئے آپ اسے قیمتی مصرف میں صرف کرنے کوشش کرتے، چنانچہ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب کو وقت کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا، اور آپ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے تھے، اور حتی الامکان کوئی لمحہ فضول جانے نہیں دیتے تھے، آپ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ آپ کے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہ چلا جائے آپ سنت کے مطابق گھر والوں کے ساتھ نرمی، اور بسا اوقات تفریحی گفتگو کے لئے بھی وقت نکالتے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے دل میں کوئی الارم لگا ہوا ہے جو ایک مخصوص حد تک پہنچنے کے بعد آپ کو کسی اور کام کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، چنانچہ گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد آپ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے، سفر ہو یا حضر، آپکا قلم چلتا ہی رہتا، ریل گاڑی میں تو آپ ایسی روانی سے لکھتے تھے جیسے ہموار زمین پر بیٹھے ہوں، اور تحریر میں کوئی خاص بگاڑ بھی عموماً پیدا نہیں ہوتا تھا، حد یہ ہے کہ احقر نے آپ کو موٹر کار، بلکہ موٹر رکشہ تک میں بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ کار اور رکشہ کے جھٹکوں میں کچھ لکھنا دشوار ہوتا ہے، مگر ہلکے پھلکے خطوط اس میں لکھ لیتے تھے، یہاں تحریر کے طرز میں کچھ تبدیلی پیدا ہوتی

ہے، لیکن خط پھر بھی آرام سے پڑھا لیا جاتا ہے۔

آپ وقت کی وسعت کے لحاظ سے مختلف کاموں کی ایک ترتیب ہمیشہ ذہن میں رکھتے، اور جتنا وقت ملتا اس کے لحاظ سے وہ کام کر لیتے جو اتنے وقت میں ممکن ہو، مثلاً اگر گھر میں آنے کے بعد کھانے کے انتظار میں چند منٹ مل گئے ہیں تو ان میں ایک خط لکھ لیا، یا کسی سے فون پر کوئی مختصر بات کرنی ہو تو وہ کر لی، گھر کی کوئی چیز بے ترتیب یا بے جگہ ہے تو اسے صحیح جگہ رکھ دیا، کوئی مختصر سی چیز مرمت طلب پڑی ہے ، تو اپنے ہاتھ سے اس کی مرمت کر لی۔

غرض جہاں آپ کو طویل کاموں کے درمیان کوئی مختصر وقفہ ملا ہے، آپ نے پہلے سے سوچے ہوئے مختلف کاموں میں سے کوئی کام انجام دے لیا۔

ایک روز ہم لوگوں کو وقت کی قدر پہچاننے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمانے لگے، کہ ہے تو بظاہر نا قابل ذکر سی بات، لیکن تمھیں نصیحت دلانے کے لئے کہتا ہوں کہ مجھے بے کار وقت گزارنا انتہائی شاق معلوم ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ جب میں قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء جاتا ہوں تو وہاں بھی خالی وقت گزارنا مشکل ہوتا ہے، چنانچہ جتنی دیر بیٹھنا ہوتا ہے، اتنے اور کوئی کام تو ہو نہیں سکتا، اگر لوٹا میلا کچیلا ہو تو اسے دھو لیتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب حضرت والد صاحب نے مجھے پہلے پہل ہاتھ کی گھڑی حجاز سے لا کر دی تو ساتھ ہی فرمایا کہ: ''یہ گھڑی اس نیت سے اپنے پاس رکھو کہ اس کے ذریعے اوقات نماز کی پابندی کر سکو گے، اور وقت کو پہچان سکو گے، میں بھی گھڑی اس لئے اپنے پاس رکھتا ہوں کہ وقت کو تول تول کر خرچ کر سکوں۔'' اللہ تعالیٰ انھیں قرب خاص میں ابدی راحتیں عطا فرمائے، وہ اسی طرح زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں زاویہ نظر درست فرما کر عبادت بنا دینے کی فکر میں رہتے تھے"[116]۔

مرض وفات اور وفات:

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ایک طویل عرصہ سے دل کی بیماری میں مبتلا تھے اور آپ کے انتقال سے قبل بھی آپکو دل کے کئی دورے پڑ چکے تھے لیکن 5 ،اکتوبر 1976ء کو منگل کی دوپہر پونے دو بجے آپ کے دل میں سخت تکلیف ہوئی ،شام کو ادارہ انسداد امراض قلب کے ماہر ڈاکٹر اسلم نے آپ کا معائنہ کیا اور پھر اپنے ساتھ ہی جناح اسپتال لے گئے جہاں ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باوجود رات کو بارہ بجکر چوبیس منٹ پر آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔آپ کی جدائی سے جو خلا پیدا ہوا تھا شاید وہ کبھی پر نہ ہو سکے گا۔آپ نے تقریباً تمام عمر دین کی خدمت میں بسر کی۔

وفات کے حوالہ سے جناب حافظ اکبر شاہ بخاری صاحب لکھتے ہیں:

> ''آپ حد سے زیادہ منکسر المزاج اور بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھے جو کسی ایک شخصیت میں کم ہی جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن بھی تھے اور ملک و قوم کے سچے بہی خواہ بھی۔آپ جیسے یگانہ روز گار لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں،آپ ایک منفرد حیثیت اور مقام کے مالک تھے،آپ کے ہزاروں معتقدین نے آپ کی نماز جنازہ حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ کی امامت میں دار العلوم کورنگی کراچی میں ادا کی پھر آپ کو دار العلوم کی چار دیواری میں واقع قدیم قبرستان لے جایا گیا جہاں ہزاروں اشکبار آنکھوں نے آپ کو بڑے رنج و غم کے ساتھ آپکی آخری آرام گاہ میں اتارا اور پھر یوں اس صدی کے عظیم اسلامی رہنما کی تدفین کی گئی،اس موقع پر دار العلوم کورنگی کی وسیع و عریض مسجد اور میدان میں حد نگاہ تک لوگ ہی لوگ نظر آرہے تھے جس سے اندازہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحب عام لوگوں میں کس قدر چاہے جاتے تھے۔
> بہر حال اسلامی دنیا کی یہ قابل فخر اور قابل تقلید مذہبی شخصیت 6،اکتوبر 1976 ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئی اور یوں عالم اسلام ایک بہت بڑے عالم دین سے محروم ہو گیا'' (117)۔

فصلِ ششم: پسماندگان وجانشین

٦

فصلِ ششم

پسماندگان وجانشین

فصل ششم: پسماندگان وجانشین

حضرت کی اولاد صالحہ:

حضرت کے پسماندگان اور جانشین کے حوالے سے جناب حافظ اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

"اولاد میں آپ کے پانچ فرزند، مولانا محمد ذکی مرحوم، مولانا محمد رضی، مولانا محمد ولی رازی ایم۔اے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مہتمم دارالعلوم کراچی اور مولانا محمد تقی عثمانی ایم۔اے، ایل ایل بی، استاذ دارالعلوم کراچی ومدیر ماہنامہ ''البلاغ'' اور چار صاحبزادیاں ہیں، سب سے بڑی صاحبزادی محترمہ نعیمہ خاتون مرحومہ ۳۷ سال کی عمر میں وفات پاگئی تھیں جن کا مرثیہ حضرت نے کہا ہے اور وہ ''کشکول'' میں شائع بھی ہو چکا ہے، ان کے علاوہ محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ اور محترمہ حسیبہ خاتون کراچی میں اور محترمہ رقیہ خاتون صاحبہ لاہور میں مقیم ہیں"(118)۔

مولانا محمد ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے فرزند تھے، نام، محمد ذکی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تجویز فرمودہ ہے اور "کیفی" تخلص تھا۔

جناب اکبر شاہ بخاری صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''بچپن ہی سے ذہانت وذکاوت اور حاضر جوابی میں مشہور تھے ایک مرتبہ اپنے والد اور دادا صاحب کے ساتھ دہلی جانا ہوا، فتح پور کی مسجد میں نماز کے لیے گئے۔ وہاں سے واپسی میں آپ نے اپنے والد صاحب کے جوتے اٹھا لیے مگر دادا صاحب کے جوتے نہیں اٹھائے، دادا صاحب نے از راہِ تفنن

پوچھا" کیوں بھائی، یہ کیا؟ تم نے میرے جوتے کیوں نہیں اٹھائے؟ آپ نے اپنے والد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برجستہ جواب دیا" آپ کے جوتے یہ اٹھائیں گے۔"

ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں شروع کی، اور فارسی وریاضی کی تکمیل کے بعد درس نظامی شروع کیا، مگر بعض حالات کی بناء پر چوتھے سال کے بعد درس نظامی کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اس کے باوجود بزرگوں کی صحبت اور وسیع مطالعہ نے آپ کو علم وعمل کی وہ دولت نصیب فرمائی جو بسااوقات اچھے اچھے فضلاء میں نظر نہیں آتی کتاب سے آپ کو عشق تھا اور نئی کتاب کو دیکھ کر اسے پڑھے بغیر چھوڑ دینا آپ کے لیے ممکن ہی نہ تھا خاص طور سے تاریخ وتصوف پر آپ کا مطالعہ قابل رشک تھا"(119)۔

مولانا ناذ کی کیفی رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری:

مولانا ناذ کی کیفی کو شعر وسخن کا شوق بچپن ہی سے تھا، آپ اپنے نو مشقی کے اس دور میں اس انداز کے شعر کہتے تھے:

"تیرے نثار، مشق ستم میں کمی نہ کرے — اتنے تو داغ ہوں کہ گلستان کہیں جسے
آلام روزگار سے اکتا گیا ہے دل — وہ درد دے کہ درد کا درماں کہیں جسے
ہم ہیں قتیل اک بت نازک خیال کے — آلام روزگار ذرا دیکھ بھال کے
نظام عالم ہے یونہی قائم یہی ادائے فلک رہی ہے — جہاں پہ گل ہیں فنا پہ مائل وہیں کلی بھی چٹک رہی ہے"(120)

آپ کی خواب میں کہی گئی ایک غزل کا ایک شعر یوں ہے:

اف تصور کی تیرے رعنائی

تجھ سے بھی کچھ سوا حسیں نکلا[121]

مشہور شاعر جگر مراد آبادی سے آپ کے بڑے اچھے تعلقات تھے، وہ بھی آپ کی شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ جناب اکبر شاہ بخاری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جگر مراد آبادی کو جب پہلی بار اپنی غزل کا یہ مطلع سنایا کہ:

ہم ہیں قتیل اک بت نازک خیال کے

آلام روزگار ذرا، دیکھ بھال کے

تو جگر مرحوم چونک اٹھے، بڑی داد دی اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ مشق سخن ضرور جاری رکھیں، اس کے بعد آپ کے ذوق شعر گوئی نے بڑی ترقی کی ملک کے تمام نامور شعراء آپ کی غزلوں کے نہایت مداح تھے۔ آپ بلاشبہ اپنے فکر وفن کے لحاظ سے دور حاضر کے گنے چنے شعراء میں سے تھے آپ نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور اس میدان میں پامال راہوں سے ہٹ کر نئے نئے راستے تلاش کئے، اس کے باوجود عوامی مشاعروں میں شریک ہونے سے کتراتے البتہ شعر وسخن کی مخصوص نشستوں میں بکثرت شریک ہوتے تھے۔

آپ نے فارسی اور اردو شاعری کا انتہائی وسیع مطالعہ کیا تھا، فارسی اور اردو کے بلا مبالغہ ہزار ہا اشعار

یاد تھے اور جب سنانے پہ آتے تو گھنٹوں سناتے رہتے تھے۔اور فارسی میں حافظ اور سعدی کے علاوہ نظیری اور عرفی کے بڑے مداح تھے۔اردو کے قدیم شعراء میں داغؔ،میرؔ اور غالبؔ سے اور زمانہ مابعد کے شعراء میں فانیؔ،حسرتؔ،اصغرؔ، جگر اور اقبال سے بہت متاثر تھے[122]۔

آپ کی شاعری کامیدان اور مجموعۂ کلام:

آپ کی شاعری غزل، نظم اور نعت گوئی پر مشتمل تھی،جناب اکبر شاہ بخاری ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کی شاعری کا اصل میدان غزل تھا لیکن متعدد نظمیں بھی آپ نے بڑے معرکے کی کہی ہیں،ان میں ''دار العلوم کراچی'' پر آپ کی نظم ایک شاہکار ہے،اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء کے جہاد پاکستان کے موقع پر آپ نے دسیوں ولولہ انگیز نظمیں کہی ہیں وصال سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے غزل کہنی چھوڑ دی تھی اور مسلسل نعتیں کہہ رہے تھے۔آپ کی تمنا تھی کہ اب شاعری نعت کے لیے مخصوص ہو جائے۔اس کا اظہار آپ کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

یارب محمد سے دعا ہے مری کیفی

ہو نعتِ محمد مرے اشعار کی دنیا

روزنامہ وفاق لاہور میں قطعہ حالات حاضرہ پر لکھنے کا بھی معمول تھا۔

آپ کا مکمل مجموعہ کلام ''کیفیات'' کے نام سے ادارہ اسلامیات انار کلی لاہور پیش کر رہا ہے جو حسان دانش،ماہر القادری اور مولانا تقی عثمانی کے پیش لفظ اور تقاریظ سے مزین ہے"[123]۔

اولاد:

آپکے تین فرزند اور اتنی ہی دختران ہیں اور سب بحمد اللہ صوم وصلوۃ کے پابند اور دینی ماحول کے پروردہ ہیں بڑے فرزند مولوی محمود اشرف حافظ، قاری اور جامعہ اشرفیہ سے فارغ التحصیل عالم ہیں اور دار العلوم کراچی میں ایک سال فتویٰ کی تربیت حاصل کر چکے ہیں اور اب تقریباً تین سال سے مدینہ طیبہ کے جامعہ اسلامیہ میں زیر تعلیم ہیں، دوسرے مسعود اشرف انٹر کام کر چکے ہیں، سعد نوجوان ہیں اور اپنے والد کے صحیح معنی میں دست وبازو رہے ہیں۔ تیسرے فرزند سعود اشرف میٹرک کے بعد سال دوم میں زیر تعلیم میں، ذہانت وفطانت میں اپنے والد کی یادگار ہیں[124]۔

جناب احسان دانش مولانا ذکی کیفی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ مفتی محمد شفیع کے بڑے صاحبزادے تھے، مفتی صاحب کے دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی زیور علم سے آراستہ تھے، لاہور میں ادارہ اسلامیات کے مالک و مہتمم تھے جو دینی کتابوں کا بڑا ادارہ ہے۔ کیفی نہایت اچھے اور نغمہ گو شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں پر انھیں عبور تھا اور دونوں یکساں رفتار تین چار سال سے ان کا کلام ایسا شستہ اور منجھا ہوا آرہا تھا کہ بعض اوقات سب حیران رہ جاتے تھے کہ ذکی صاحب نے بڑی ترقی کرلی ہے جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے وہ اس رفتار سے چل رہے تھے کہ اگر زندگی وفا کرتی تو اس دور کے بڑے شاعر ہوتے مگر شاید قدرت کو منظور نہ تھا، چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ''چٹ پٹ'' ہوگئے اور ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اب ادارہ اسلامیات کو ان کے بچے سنبھالے ہوئے ہیں۔ خدا انھیں کامیاب کرے اور صحت عطا فرمائے آمین''[125]۔

مولانا محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ:

جناب حافظ اکبر شاہ بخاری تحریر کرتے ہیں:

''آپ کی ولادت ۱۳۵۰ھ کو دیوبند میں ہوئی جس دن آپ کی پیدائش ہوئی اس دن آپ کے والد ماجد حضرت مفتی صاحب جب درس دے رہے تھے تو اس میں ''واجعله ربِّ رضیّاً '' دیکھ کر نام محمد رضی ذہن میں آیا، پھر مادہ تاریخی ''بِكَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيّاً ''قرار پایا خود لکھتے ہیں:

''گھر میں جب آنکھ کھولی تو اس وقت احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب اور مشائخ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا سید اصغر صاحب کا خصوصاً تمام علمائے دیوبند کا عموماً تذکرہ کانوں میں پڑتا رہا اور خدا اور اس کے رسول کا نام ہر وقت رہتا تھا، بس گھر میں ہر وقت یہی چرچے تھے۔ بچپن میں جب رات کو آنکھ کھلی حضرت والد صاحب کو ذکر مناجات اور تہجد میں مشغول پایا ابتدائی قرآن مجید کی تعلیم محلہ کے مکتب میں اور پھر دار العلوم دیوبند میں ہوئی مگر تکمیل نہ کر نہ سکے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور ۱۹۴۸ء میں آپ والد صاحب کے ہمراہ کراچی آ گئے، یہاں والد صاحب نے آپ کو پڑھانا شروع کیا مگر ان دنوں حضرت مفتی صاحب اسلامی نظام کے سلسلہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی معیت میں اس قدر مصروف تھے کہ آپ کی تعلیم مکمل نہ کرا سکے۔ ایسے ماحول میں ناچار ہو کر دینی کتب کے نشر واشاعت کی طرف مائل ہوئے اور ادارہ دار الاشاعت کراچی وجود میں آیا جس کے زیر اہتمام اب تک تقریباً دو سو چھوٹی موٹی کتابوں کی اشاعت ہو چکی ہے۔

نومبر ۱۹۵۴ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ اس وقت ایک فرزند اور دو بچیاں ہیں''(126)۔

محمد ولی رازی ایم۔اے:

۱۱شوال ۱۳۵۳ھ، جنوری ۱۹۳۵ء کو دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، نام حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا تجویز فرمودہ ہے۔ گھٹی مولانا میاں اصغر حسین نے دی تاریخی نام صغیر احمد ہے ۱۳۵۳ھ۔

جناب اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

''ابتدائی تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند کے شعبہ قرآن مجید میں داخلہ لیا پہلے حافظ محمد کامل سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ پھر انھی سے ۲۱واں پارہ حفظ کر رہے تھے کہ حضرت والد مولانا مفتی محمد شفیع کے ساتھ پاکستان آگئے پاکستان میں آکر قاری وقاءاللہ پانی پتی مدرس جامع مسجد جیکب لائنز کراچی سے تکمیل کی۔ ایک محراب میں حضرت مفتی صاحب کے ارشاد پر ۲۲ پارے سنائے اور حضرت موصوف خود سنتے تھے۔ مولانا حافظ نور احمد صاحب سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر اپنے والد گرامی سے گلستان سعدی اور بوستان سعدی پڑھیں۔ اسی دوران اردو شاعری سے لگاؤ ہوا اور جمعرات کو گھر پہ ہی مجلس جمتی ،بھائی محمد ذکی کیفی مصرعہ دے دیتے اور آپ مکمل کرتے تھے۔

۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ''منشی فاضل'' کا امتحان اعلیٰ سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۵۴ء میں میٹرک صرف انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پریس میں شرکت کی۔ کچھ عرصہ بیمار رہے، ۱۹۵۸ء میں شادی ہوئی۔ اس موقع پر بعض عزیزوں نے ٹیپ پر بھائی ذکی کیفی صاحب مرحوم کا لکھا ہوا سہرا پڑھنا شروع کیا کہ ''جشن طرب مناؤ کہ شادی ولی کی ہے''حضرت مفتی صاحب نے اس پر فی البدیہہ سہرا اسی مجلس میں کہا اور اس مجلس کو مجلس ذکر بنادیا شرعی خوشی مناؤ کہ شادی ولی کی ہے۔ اسی سال گورنمنٹ ہائی سکول جہانگیر روڈ اورنٹ یل ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

۱۹۴۰ء میں جامعہ پنجاب سے انٹر (انگریزی) اور ۱۹۶۳ء میں بی۔اے کیا ۱۹۴۰ء میں ریڈیو پاکستان کی دعوت پر مذہبی نشریات کے شعبہ کے انچارج کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے اسلامک سٹڈیز کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پاس کیا، ۱۹۶۸ء تک ریڈیو پاکستان سے متعلق رہے۔ مختلف موضوعات پر ۱۵۰ کے قریب آپ کی تقاریر نشر ہوئیں۔

۱۹۶۸ء کے اواخر میں قائد ملت کالج میں بحیثیت لیکچرار اسلامک سٹڈیز آپکا تقرر ہوا، ۱۹۷۰ء تک تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

۴/جون ۱۹۷۱ء کو گرامر اسکول کراچی میں اردو اسلامیات کے لیکچرار چلے آرہے ہیں، تصانیف میں قرآن مجید کے عنوانات کا ایک انڈکس ۱۷۵ صفحات میں آپ نے تیار کیا، سیرت پر آپ نے بغیر نقطوں کی کتاب ''ہادی عالم'' تالیف کی جس پر صدارتی ایوارڈ ملا، بی ایڈ اسلامیات کا نصاب لکھا جو قومی تعلیم ،(سالنامہ) میں شائع ہوا اور دلچسپی سے پڑھا گیا۔

''قادیانیت عدالت میں''، '' تالیف علمائے وزعماء اسلام ''انگریزی ترجمہ آپ کے قلم سے ہے''۔(127)

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی:

آپ مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہ کے قابل فرزند رشید ہیں، اس وقت دارالعلوم کراچی کے مہتمم، استاذ حدیث، مفتی اور خطیب ہیں، ایک جید عالم دین، محدث، محقق، مدبر اور متعدد مفید علمی کتب ورسائل کے مؤلف ومصنف ہیں، دارالعلوم کراچی کے ممتاز ترین فضلا میں سے ہیں، فتاویٰ نویسی میں خاص مہارت اور امتیاز رکھتے ہیں، اور اس میں حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہیں۔

جناب اکبر شاہ بخاری آپ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ شب جمعہ ۲ یا ۳، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ میں بمقام دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی۔انڈیا) میں پیدا ہوئے، خوبی قسمت سے حضرت حکیم الامت تھانوی نے ایک مجمع میں آپ کا نام ''محمد رفیع'' تجویز فرمایا۔ زجملہ خلائق محمد رفیع حسن اتفاق سے حضرت مفتی اعظم کا سجع بروز قیامت محمد شفیع'' ہے، دونوں سجعوں کا وزن اور قافیہ برابر ہونے کی بناء پر شعر مکمل ہو گیا جو آپ کے حق میں فال نیک ہے۔

زجملہ خلائق محمد رفیع   بروز قیامت محمد شفیع

اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب سے قاعدہ بغدادی پڑھ کر پانچ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے شعبہ حفظ میں داخل ہوئے۔ پندرہ پارے حفظ کئے تھے کہ پاکستان آنا پڑ گیا، چنانچہ حفظ کی تکمیل کراچی میں ہوئی ختم قرآن مفتی اعظم فلسطین شیر امین الحسینی نے کروایا، پھر دارالعلوم کراچی میں اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں درس نظامی کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا، اور اپنے وقت کے ممتاز علماء و محدثین سے کسب علم کرنے کے بعد ۱۳۷۹ھ بمطابق ۱۹۵۹ء میں فراغت حاصل کی، زمانہ طالب علمی ہی میں ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا، آپ کو حضرت مفتی اعظم سے مندرجہ ذیل کتب درساً پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، موطاء امام مالک، شمائل ترمذی، در مختار، شرح عقود رسم المفتی، نیز فراغت کے بعد حضرت مفتی اعظم قدس سرہ سے فتاویٰ نویسی کی مشق بھی کی اور آپ کی نگرانی میں ہزار سے زائد فتاویٰ تحریر فرمائے۔ آپ کو حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کے علاوہ شیخ الاسلام علامہ محمد ظفر احمد عثمانی، شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی حکیم الاسلام مولانا قاری طیب قاسمی، شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی اور شیخ محمد حسن بن المشاط مالکی جیسے

اجلہ علماء محدثین سے بھی اجازت روایت حدیث حاصل ہے۔

دارالعلوم کراچی میں حضرت مفتی اعظم کے علاوہ آپ کو ذیل کے ممتاز علماء سے کسب فیض کا موقع ملا، حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی بانی و مہتمم مدرسہ اشرف المدارس کراچی، مولانا سلیم اللہ خان بانی و مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی، مولانا اکبر علی سہارنپوری، سابق استاذ الحدیث وتفسیر دار العلوم کراچی، مظاہر العلوم سہارنپور مولانا سحبان محمود صاحب، شیخ الحدیث وناظم دارالعلوم کورنگی، مولانا شمس الحق صاحب استاذالحدیث دارالعلوم کراچی، ۱۳۹۴ھ میں حضرت مفتی اعظم قدس سرہ نے آپ کو باقاعدہ سند افتاء عطا فرمائی۔ درس نظامی سے فراغت کے بعد آپ نے دارالعلوم ہی میں تدریسی سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا اب تقریباً دس بارہ سال سے آپ کو دورہ حدیث کے اسباق پڑھانے کی سعادت حاصل ہے اور بفضلہ تعالیٰ آپ کے تلامذہ بھی استاذالاستاذ ہو چکے ہیں۔

جمادی الاول ۱۳۹۵ھ میں نائب مفتی کے ساتھ دارالعلوم کراچی کے نائب صدر نامزد کئے گئے۔ اور اب حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی وفات کے بعد سے دارالعلوم کراچی کے اہتمام کی تمام ذمہ داریاں آپکے سپرد ہیں اور آپ ان ذمہ داریوں کو بطریق احسن حضرت کے نقش قدم کو آپ نے اپنے لئے مشعل راہ بنا رکھا ہے۔ واللہ الموفق والمبین"(128)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی:

آپ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فرزند ارجمند ہیں، اور نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء میں سے ہیں، آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، آپ کے متعلق حافظ اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

"آپ ۵ شوال المکرم ۱۳۶۳ھ بمطابق ۱۹۴۳ء بروز شنبہ، دیو بند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے

تعلیم کی بسم اللہ وہیں ہوئی پھر رجب ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء کو والد محترم کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی،جب ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں آپ کے والد مکرم نے دار العلوم کراچی کی بنیاد رکھی تو آپ نے اسی دار العلوم میں پورے درس نظامی کی تکمیل کی،اور شعبان ۱۳۷۹ھ میں بعمر سترہ سال دورہ حدیث سے فراغت ہوئی،دورہ حدیث میں آپ اول آئے۔

آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب حضرت مولانا رشید احمد لدھیانوی صاحب حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب، حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب، حضرت مولانا اکبر علی صاحب اور حضرت مولانا سبحان محمود صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔سولہ سال کی عمر میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پہلی پوزیشن سے پاس کر لیا، پھر اسی دار العلوم کراچی ہی کے شعبہ تخصص فی الافتاء میں داخلہ لے کر باقاعدہ دو سال میں فتویٰ کی تربیت حاصل کی، پھر پنجاب بورڈ سے میٹرک، جامعہ کراچی سے بی۔اے سندھ مسلم کالج کراچی سے ایل ایل بی اور پنجاب سے ایم اے عربی کے امتحانات امتیاز سے پاس کئے۔لاء کے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

شوال۔۱۳۷۹ھ سترہ سال کی عمر میں دار العلوم کراچی میں ابتدائی عربی کتب کی تدریس شروع کی ۱۵ برس کی مدت میں مختلف علوم وفنون کی تقریباً ساری کتب زیر درس رہیں،اور اس وقت ترمذی زیر درس ہے فقہ وتفسیر وحدیث آپ کا شب وروز کا مشغلہ ہے۔

آپ نے تدریس کے ساتھ تصنیف کا بھی زبردست کام کیا،اور متعدد تصانیف آپ کے قلم فیض رقم سے منصۂ شہود پر آئی ہیں، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے دار العلوم کراچی کے ترجمان ''ماہنامہ البلاغ کراچی'' کے آپ ۱۹۶۲ھ سے مدیر اعلیٰ چلے آرہے ہیں، حضرت مفتی صاحب کی رحلت کے بعد آپ کے برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دار العلوم کے مہتمم

اور آپ نائب مہتمم کے عہدہ پر فائز ہیں، دار العلوم کے شعبہ تصنیف و تالیف کے نگران اعلیٰ بھی آپ ہی ہیں اور غالباً ۱۹۷۸ء سے شریعت بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان کے آپ جج بھی ہیں۔ علاوہ ازیں عالم اسلام کی متعدد دینی تنظیموں کے معزز رکن اور پاکستان کے کئی بڑے دینی مدارس کی شوریٰ کے رکن اعلیٰ بھی ہیں، حق تعالیٰ آپ سے علم دین کا کام لے رہے ہیں، ہزاروں افراد آپ کے فیض علمی و روحانی سے سیراب و شاداب ہو چکے ہیں۔

آپ کا روحانی سلسلہ حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی سے منسلک ہے اور انھی سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل ہوا اور ان کے بعد آپ نے حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحب سے رجوع کیا اور انہوں نے آپ کو اجازت و خلافت سے نوازا، اس وقت آپ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ ایک جید ترین عالم و محقق مفسر و مدبر، محدث و فقیہ اور بہترین متکلم اور شیخ کامل ہیں، حق تعالیٰ نے بہت سے اوصاف و کمالات سے نوازا ہے، اور صحیح معنوں میں اپنے اکابر و اسلاف کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں، اور اپنے علم و عمل میں ان کی عظیم یادگار ہیں،،(129)۔

خلفاو تلامذہ:

جناب اکبر شاہ بخاری نے آپ کے مشہور خلفاء کا مفصل تعارف پیش کیا ہے، ذیل میں اس کی فہرست تحریر کی جاتی ہے:

"(۱) حضرت مولانا مفتی عبدالحکیم سکھروی۔

(۲) حضرت مولانا میر امام الدین ہاشمی حیدر آبادی۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محی الدین بنگالی۔

(۴) حضرت مولانا حکیم امداد اللہ احمد ذکی ایم اے۔

(۵)حضرت صوفی محمد اقبال قریشی ہارون آبادی۔

(۶)حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب۔

(۷)حضرت مولانا محمد طفیل فیصل آبادی۔

(۸)حضرت شاہ سلیمان کراچوی۔

(۹)حضرت مولانا محمود حسن مدراسی۔

(۱۰)حضرت الحاج محمد عثمان صاحب میمن۔

(۱۱)حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی۔

(۱۲)حضرت مولانا مفتی محمد وجیہہ صاحب حیدرآبادی۔

(۱۳)حضرت مولانا سید محمود حسن صاحب سنبھلی۔

(۱۴)حضرت الحاج محمد احمد کراچوی"[130]۔

مفتی اعظم کے مشہور تلامذہ:

آپ کے ناموراور مشہور تلامذہ حسبِ ذیل ہیں:

"شیخ الحدیث علامہ محمد یوسف بنوری۔

مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب۔

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب۔

شیخ القراء مولانا قاری فتح محمد پانی پتی۔

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب۔

خطیب پاکستان مولانا احتشام الحق تھانوی۔

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔

حضرت مولانا محمد انوار الحسن شیر کوٹی۔

حضرت مولانا سید حسن صاحب۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی۔

حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب۔

حضرت مولانا سید بادشاہ گل صاحب۔

حضرت مولانا لطافت الرحمٰن سواتی صاحب۔

حضرت مولانا سید نور الحسن بخاری۔

حضرت مولانا قاری عبد العزیز شوقی انبالوی۔

حضرت مولانا قاضی مقدر الدین شاکر پشاوری۔

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی۔

حضرت مولانا قاضی عبد الکریم کلاچوی۔

حضرت مولانا قاری رعایت اللہ شاہجان پوری۔

حضرت مولانا غلام محمد کراچوی۔

حضرت مولانا حافظ نذیر احمد صاحب۔

حضرت مولانا مفتی محمد عبد المتین کشمیری۔

حضرت مولانا مفتی عبد الطیف صاحب۔

حضرت مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب سواتی۔

حضرت مولانا مفتی بشیر احمد کشمیری۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی۔

حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔

حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کراچوی۔

حضرت مولانا شریف جالندھری۔

حضرت مولانا قاری عبید اللہ امرتسری۔

حضرت مولانا مفتی محمد خلیل صاحب گوجرنوالہ۔

حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ لاہوری۔

حضرت مولانا معراج الحق قاسمی۔

حضرت مولانا مفتی عبد اللہ ملتانی۔

حضرت مولانا سید احمد شاہ بخاری۔

حضرت مولانا عبد الودود قریشی۔

حضرت مولانا فضل محمد فقیر والی۔

حضرت مولانا عرض محمد صاحب کوئٹہ۔

حضرت مولانا قاری حبیب اللہ لدھیانوی۔

حضرت مولانا صدیق احمد چاٹگامی۔

حضرت مولانا سید حبیب اللہ شاہ بنوری۔

حضرت مولانا امیر الزماں خان کشمیری۔

حضرت مولانا عبید اللہ انور لاہوری۔

حضرت مولانا قاری محمد سالم قاسمی۔

حضرت مولانا عبد الحلیم قاسمی۔

حضرت مولانا محمد متین ہاشمی۔

حضرت مولانا نور احمد کراچوی۔

حضرت مولانا سبحان محمود صاحب کراچی۔

حضرت مولانا عبد الطیف صاحب۔

حضرت مولانا سید آفتاب عالم مہاجر مدنی۔

حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب۔

حضرت مولانا محمد ضیاء الحق صاحب اٹکی۔

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین چکوالی۔

حضرت مولانا نذیر احمد فیصل آبادی۔

حضرت مولانا سید احمد میاں صاحب۔

حضرت مولانا محمد عبد الستار تونسوی۔

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی۔

حضرت مولانا سید محمد ایوب جان بنوری۔

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود (پی، ایچ، ڈی) لندن۔

استاذ القراء حضرت مولانا قاری رحیم بخش پانی پتی۔

حضرت مولانا نیاز محمد ختنی بہاولنگری۔

حضرت مولانا عبدالحکیم ہزاروی۔

حضرت مولانا حافظ عبدالقدوس صاحب پشاوری۔

حضرت مولانا ڈاکٹر سید غلام محمد شاہ بلوچستانی۔

محقق عصر حضرت مولانا شمس الحق جلال آبادی۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب۔

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد عبدالحیٔ جاپوری۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا حسن جان مدنی شہید۔

حضرت مولانا محمد علی کاندھلوی۔

حضرت مولانا علی احمد بنگالی۔

حضرت مولانا مفتی زین العابدین فیصل آبادی۔

حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی۔

حضرت مولانا مفتی شریف حسن دیوبندی۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی۔

حضرت مولانا محمد احمد بہاولپوری۔

حضرت مولانا عبدالرشید ربانی"[131]۔

خلاصۃ الباب

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور یوپی کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کے آباءواجداد جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں، دیوبند کے ممتاز اہل علم تھے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت 1314ھ میں شعبان کی تقریباً 20تاریخ بمطابق جنوری 1897ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد اور چچا سے حاصل کی، ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند داخل ہوئے، 1337ھ میں درس نظامی کی تعلیم سے فراغت ہوئی، ابتدا میں باطنی تعلق شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے قائم رہا، ان کی وفات کے بعد 1346ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، 1349ھ میں مجازِ بیعت قرار پائے، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، روحانی اور سیاسی جانشین تھے۔

آپ کی شخصیت بنیادی طور پر ایک عملی شخصیت تھی، آپ کی ساری عمر درس وتدریس اور تصنیف وافتاء جیسے کاموں میں بسر ہوئی۔ کتب بینی کے شوق اور ذوق مطالعہ کے بارے میں اس دور میں ان کی نظیریں کم ہی ملیں گی، آپ خود نمائی سے نفرت کرتے تھے اور آپ کے اقوال وافعال سے یہ بات سامنے والے کو واضح طور پر محسوس ہوتی تھی کہ مفتی صاحب انتہائی عاجزانہ شخصیت کے مالک ہیں۔

دوسری صفات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی نے حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو عبادات کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، اگرچہ آپ کی زندگی تدریس، فتوی، تصنیف، وعظ وتقریر اور سیاست سے پر تھی، مگر اس کے باوجود نفلی عبادات کا آپ کے ہاں خاص اہتمام تھا، اس

بات کی گواہی آپ کے تمام تذکرہ نگاروں نے دی ہے، پھر آپ کے ذکر واذکار میں کثرت کا سلسلہ عمر کے آخری حصہ میں بھی جاری رہا۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی نماز اسلاف کی نماز کا نمونہ تھی، عبادات میں آپ کو اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ اپنی کسی عبادت کی وجہ سے دوسروں کو کوئی ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، خاص طور سے غیر واجب عبادات میں اس بات کا پورا لحاظ رکھتے تھے، آپ اس بات سے بھی حتی الوسع پرہیز فرماتے تھے کہ آپ کی وجہ سے کسی مسجد میں نماز کو اپنے مقرر وقت سے مؤخر کیا جائے۔

عزیمت ورخصت کے باب میں بھی مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کا مذاق یہ تھا کہ اس بات کی پوری تحقیق اور اطمینان فرمالیتے تھے کہ اس حالت میں شرعاً رخصت حاصل ہے یہ نہیں؟ جب اطمینان ہو جاتا تو اس پر انشراح کے ساتھ عمل فرماتے تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی کے بیشتر شعبے دین کی دعوت وتبلیغ اور نشر واشاعت ہی سے متعلق تھے، جن میں عوام وخواص دونوں کو تبلیغ حق کے کام شامل تھے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ صلاح پسند طبیعت کے مالک تھے، نفرت انگیز افکار وتقاریر سے کوسوں دور تھے، اور اس باب میں آپ کا ایک خاص طرز تھا، آپ کی آمدنی بہت کم، رہن سہن، قطع وضع میں نہایت سادگی اور قناعت تھی، آپ کو اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کے لیے تجارت، زراعت اور اجارہ تینوں سنتوں پر عمل کی توفیق بخشی، اللہ تعالی نے آپ کو دین ودنیا کی جن نعمتوں سے نوازا تھا حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی قدر کرنا بھی خوب جانتے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا بڑا ذوق تھا اور مصارف خیر کی شاید ہی کوئی صورت ایسی بچی ہو جس پر آپ نے عمل نہ فرمایا ہو، خرچ کرنے کا یہ معمول تنگی فراخی دونوں حالتوں میں جاری رہتا حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ معاملات کی صفائی میں حد درجہ کی احتیاط فرمایا کرتے تھے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے جذبات کی رعایت کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ہر ایک شخص سے اس کے مزاج و مذاق اور اس کی ضروریات کے مطابق معاملہ فرماتے اور آپکی ساری زندگی اس فکر اور احتیاط میں گزری کہ ان کی ذات سے کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچے، ہر آن اپنے ماتحتوں کی راحت رسانی کا اہتمام فرماتے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بزرگان دین سے بہت عقیدت و محبت تھی، خاص کر اپنے اساتذہ و مشائخ اور اکابر علمائے دیوبند کے تذکرے میں تو آپ بے خود سے ہو جاتے تھے، حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ایک طویل عرصہ سے دل کی بیماری میں مبتلا تھے اور آپ کے انتقال سے قبل بھی آپکو دل کے کئی دورے پڑ چکے تھے لیکن 5، اکتوبر 1976 کو منگل کی دوپہر پونے دو بجے آپ کے دل میں سخت تکلیف ہوئی، رات کو بارہ بجکر چوبیس منٹ پر آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی جدائی سے جو خلا پیدا ہوا تھا شاید وہ کبھی بھی پر نہ ہو سکے گا۔ آپ نے تقریباً تمام عمر دین کی خدمت میں بسر کی۔

اولاد میں آپ کے پانچ فرزند، مولانا محمد ذکی مرحوم، مولانا محمد رضی، مولانا محمد ولی رازی ایم۔اے مولانا مفتی رفیع مہتمم دار العلوم کراچی اور مولانا محمد تقی عثمانی ایم۔اے ایل ایل بی استاذ دار العلوم کراچی و مدیر ماہنامہ ''البلاغ'' اور چار صاحبزادیاں ہیں، سب سے بڑی صاحبزادی محترمہ نعیمہ خاتون مرحومہ ۳۷سال کی عمر میں وفات پا گئی تھیں ان کے علاوہ محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ اور محترمہ حسیبہ خاتون کراچی میں اور محترمہ رقیہ خاتون صاحبہ لاہور میں مقیم ہیں۔

حواشی، مراجع ومصادر باب اول

(1) اویس سرور، اسلاف امت کا بچپن، لاہور، بیت العلوم. ۲۰۰۹ء. (ص ۲۴۱)۔

(2) رفیع عثمانی، مفتی ،حیات مفتی اعظم، کراچی ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۲۱)۔

(3) ایضاحوالہ سابقہ (ص ۲۲)۔

(4) ایضا محولہ بالا، (ص ۲۲)۔

(5) رفیع عثمانی، مفتی، حیات مفتی اعظم، کراچی ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۲۲، ۲۳)۔

(6) رفیع عثمانی، مفتی ،البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی مکتبہ دار العلوم ۲۰۰۵ء، (ج۱، ص ۸۱)۔

(7) ایضاحوالہ سابقہ (ج۱، ص ۸۲)۔

(8) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس العربیہ پاکستان، لاہور، (ص ۱۲۶)۔

(9) رفیع عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، مکتبہ دار العلوم کراچی ۲۰۰۵ء، (ج۱، ص ۸۳)۔

(10) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس العربیہ پاکستان، مکتبہ لاہور، (ص ۱۲۶)۔

(11) شفیع عثمانی، مفتی، میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص ۲۹)۔

(12) رفیع عثمانی، مفتی ،حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۹ء، (ص ۲۷)۔

(13) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس العربیہ پاکستان، مکتبہ لاہور، (ص ۱۲۶)۔

(14) شفیع عثمانی، مفتی، میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص ۲۷)۔

(15) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء، (ص ۲۷)۔

(16) ایضاحوالہ سابقہ (ص۲۸)۔

(17) البخاری، محمد بن اسماعیل، (متوفی ۲۵۶ھ)، صحیح البخاری، تحقیق: مصطفی دیب البغا، دار طوق النجاۃ، (کتاب الاذان، باب فضل التہجیر الی الظہر، ج۱، ص۱۳۲، رقم الحدیث: ۶۵۳)۔ مسلم بن الحجاج القشیری النیسابوری، (متوفی ۲۶۱)، صحیح مسلم، تحقیق: فؤاد عبد الباقی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۱ء، (کتاب الامارۃ، باب بیان الشہداء، ج۳، ص۱۵۲۱، رقم الحدیث: ۱۹۱۵)۔

(18) یہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور ادبی اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے۔

(19) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص۲۹)۔

(20) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص۸۷ ج۱)۔

(21) شفیع عثمانی، مفتی، نقوش وتاثرات، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص۱۷)۔

(22) رفیع عثمانی، مفتی، حیات مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص۲۲)، محمد اویس سرور، اسلاف امت کا بچپن، لاہور، بیت العلوم لاہور ۲۰۰۹ء، لاہور، بیت العلوم لاہور ۲۰۰۹ء (ص۲۴۳)۔

(23) رفیع عثمانی، مفتی، حیات مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص۳۰)۔

(24) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص۳۱)۔

(25) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس العربیہ پاکستان، مکتبہ لاہور، (ص۱۲۶)۔

(26) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص۳۳)۔

(27) تقی عثمانی، مفتی، مقالاتِ عثمانی، دائرۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۷ء، (ص۴۸۸)۔

(28) ایضاحوالہ سابقہ، (ص۴۸۸)۔

(29) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء، (ص۳۴)۔

(30) ایضاحوالہ سابقہ، (ص۳۵)۔

(31) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء، (ص ۳۶)، محمد اویس سرور، اسلاف امت کا بچپن، لاہور، بیت العلوم لاہور ۲۰۰۹ء (ص ۲۴۷)۔

(32) اویس سرور، اسلاف امت کا بچپن، لاہور، بیت العلوم لاہور ۲۰۰۹ء (ص ۲۴۷)۔

(33) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء، (ص ۳۷)۔ محمد اویس سرور، اسلاف امت کا بچپن، لاہور، بیت العلوم لاہور ۲۰۰۹ء (ص ۲۴۸)۔

(34) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء، (ص ۳۷)۔

(35) اویس سرور، اسلاف امت کا بچپن، لاہور، بیت العلوم لاہور ۲۰۰۹ء (ص ۲۴۷)۔

(36) اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۶۸)۔

(37) مکاتیب حکیم الامت، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء، (ص ۳۰۲)۔

(38) سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، لاہور، مکتبۃ الفیصل، (ج ۲، ص ۱۴۴۶)۔

(39) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص ۵۱، ۵۰)۔

(40) احمد سعید، بزم اشرف کے چراغ، لاہور، المیزان، ۲۰۰۵ء، (ص ۱۶)۔

(41) اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۶۹)۔

(42) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۳۲)۔

(43) سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، (ج ۲، ص ۱۴۴۶)۔

(44) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۳۳، ۱۳۲)۔

(45) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۴۷، ۴۳)۔

(46) تقی عثمانی، مفتی، خطبات دورۂ ہند، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۷ء (ص ۱۹۷)۔

(47) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۳۵)۔

(48) ایضاحوالہ سابقہ، (ص ۱۳۵)۔

(49) ایضامحولہ بالا (ص ۱۳۵، ۱۳۶)۔

(50) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۳۶)۔

(51) اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، (ص ۶۸)، تقی عثمانی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۳۰)۔

(52) مکتوب نمبر ۶۶ مورخہ ۲۸/رمضان ۲۸ھ، بحوالہ "میرے والد میرے شیخ" (ص ۹۵، ۹۶)۔

(53) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۹۶، ۹۷)۔

(54) مکتوب نمبر ۶۳، بحوالہ "میرے والد میرے شیخ" (ص ۹۷)۔

(55) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۹۸)۔

(56) سورۂ انشراح، آیت: (۷-۸)۔

(57) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۹۸)۔

(58) ایضاحوالہ سابقہ، (ص ۱۰۱)۔

(59) ایضامحولہ بالا، (ص ۱۰۱)۔

(60) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۰۱، ۱۰۲)۔

(61) ابن حبان، محمد بن حبان بن احمد، ابو حاتم، البُستی، صحیح ابن حبان، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۳ء، تحقیق: شعیب ارنؤوط، (ج ۲، ص ۵۹، رقم الحدیث: ۳۵۴)۔ البزار، ابو بکر احمد بن عمرو (المتوفی: ۲۹۲ھ)، مسند البزار، مدینۃ المنورۃ، مکتبۃ العلوم والحکم، (ج ۱، ص ۴۶۹، رقم الحدیث: ۹۹۰)۔ وقال الهيثمي في «مجمع الزوائد» (3/ 162): « رجال البزار ثقات، وكذلك رجال الطبراني».

(62) ابن حبان، محمد بن حبان بن احمد، ابو حاتم، البُستی، صحیح ابن حبان، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۳ء، تحقیق: شعیب ارنؤوط، (ج۲، ص۵۹، رقم الحدیث: ۳۵۴)۔ البزار، ابو بکر احمد بن عمرو (المتوفی: ۲۹۲ھ)، مسند البزار، مدینۃ المنورۃ، مکتبۃ العلوم والحکم، (ج۱، ص۴۶۹، رقم الحدیث: ۹۹۰)۔ وقال الهيثمي في «مجمع الزوائد» (3/ 162): « رجال البزار ثقات، وكذلك رجال الطبراني».

(63) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص۱۰۲، ۱۰۳)۔

(64) سورۃ الشعراء، آیت (۳)۔

(65) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص۱۰۵)۔

(66) سورۂ یوسف، آیت (۳۶-۳۷)۔

(67) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص۱۰۶)۔

(68) سورۂ یوسف، آیت (۳۹)۔

(69) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص۱۰۶)۔

(70) ایضاً حوالۂ سابقہ، (ص۱۰۷)۔

(71) ایضاً محولۂ بالا، (ص۱۰۷)۔

(72) سورۂ طہ، آیت نمبر (۴۴)۔

(73) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص۱۰۷، ۱۰۸)۔

(74) سورۂ نحل، آیت (۱۲۵)۔

(75) تقی عثمانی، مفتی ، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص۱۰۸، ۱۰۹)۔

(76) ایضاً حوالۂ سابقہ، (ص۱۵۲، ۱۵۱)۔

(77) ایضاً محولۂ بالا، (ص۱۵۲، ۱۵۳)۔

(78) تقی عثمانی، مفتی ،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۵۳)۔

(79) ایضاحوالہ سابقہ، (ص ۱۵۳)۔

(80) ایضامحولہ بالا، (ص ۱۵۳)۔

(81) تقی عثمانی، مفتی ،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۵۳)۔

(82) ایضاحوالہ سابقہ، (ص ۱۵۳)۔

(83) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۵۳، ۱۵۴)۔

(84) ایضامحولہ بالا، (ص ۱۵۴)۔

(85) ایضاحوالہ سابقہ، (ص ۱۵۴)۔

(86) تقی عثمانی، مفتی ،البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۰ء، (ج ا، ص ۴۵۹)۔

(87) ایضاحوالہ سابقہ، (ج ا، ص ۴۵۹، ۴۶۰)۔

(88) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۰ء، (ج ا، ص ۴۶۱)۔

(89) ایضاحوالہ سابقہ، (ج ا، ص ۴۶۱)۔

(90) واضح رہے کہ درج بالا الفاظ کتبِ احادیث (متون، شروحات، کتب رجال، کتب مشتہرات اور کتب موضوعات) میں بسیار تلاش کے باوجود نہ مل سکے، البتہ ثعالبی (متوفی ۴۳۰ ھ) کی کتاب "التمثیل والمحاضرۃ" (ص ۱۹۹، ط: الدار العربیہ للکتاب)، احمد بن محمد المیدانی (متوفی ۵۱۸ ھ) کی کتاب "مجمع الامثال" (ج ا، ص ۱۵۰، ط: دار المعرفہ، بیروت) اور شہاب الدین محلی کی کتاب "المستطرف فی کل فن مستظرف" (ج ا، ص ۲۹، ط: المکتبۃ الجمہوریۃ العربیۃ) میں ان الفاظ کو مولدین کی ضرب المثل کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔

(91) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۰ء، (ج ا، ص ۴۶۳، ۴۶۲)۔

(92) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص ۱۵۹)۔

(93) ایضاحوالہ سابقہ،(ص١٦٠)۔

(94) ایضامحولہ بالا،(ص١٦٠)۔

(95) طبرانی،ابوالقاسم،سلیمان بن احمد،ابوالقاسم الطبرانی،المعجم الاوسط،دارالحرمین، قاہرۃ، تحقیق: طارق بن عوض اللہ،(ج۵،ص٦٨)۔

(96) ذہبی، شمس الدین، محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ،١٩٨۵ء،(ج٨،ص١٠٦)۔

(97) تقی عثمانی، مفتی ،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی،١٩٩۴ء،(ص١٦٣،١٦۴)۔

(98) بصائرِ حکیم الامت ص٣۵۵بحوالہ،میرے والد میرے شیخ(ص١٦٧)۔

(99) البزار،ابو بکر احمد بن عمرو(المتوفی: ٢٩٢ھ)، مسند البزار، مدینۃ المنورۃ،مکتبۃ العلوم والحکم،(٣١۵/١٠،رقم:۴۴٣٩)،قال الهيثمي: وفيه عقبة بن عبد الله الأصم، وهو ضعيف، وحسن البزار حديثه. (مجمع الزوائد: ١٨١/١٠، رقم: ١٧٤٠٩، ت: حسام الدين القدسي، ط: مكتبة القدسي).

(100) الطبرانی، سلیمان بن احمد،(المتوفی ٣٦٠ھ)،المعجم الاوسط،القاہرۃ،دارالحرمین، تحقیق: طارق بن عوض اللہ،(ج٨،ص١٧٢،رقم:٨٣٠٧)۔

(101) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء وتلامذہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی،١۴٣٠ھ،(ص٧۵-٧٧)۔

(102) ایضاحوالہ سابقہ،(ص٧٧-٧٩)۔

(103) ایضامحولہ بالا،(ص٧٩)۔

(104) تقی عثمانی، مفتی،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی،١٩٩۴ء،(ص١٧٢)۔

(105) ایضاحوالہ سابقہ،(ص١٧٣)۔

(106) تقی عثمانی، مفتی،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی،١٩٩۴ء،(ص١٧٣،١٧۴)۔

(107) اظہار الحسن محمود، عشق رسول اور علماء دیوبند، مکتبۃ الحسن، لاہور،(ص٢٣٦)۔

(108) تقی عثمانی، مفتی،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی،١٩٩۴ء،(ص١٣٨،١٣٩)۔

(109)ایضاحوالۂ سابقہ،(ص ۱۴۰،۱۴۱)۔

(110)ایضامحولۂ بالا،(ص ۱۴۱،۱۴۲)۔

(111) تقی عثمانی، مفتی ،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء،(ص ۱۴۵،۱۴۶)۔

(112)ترمذی، محمد بن عیسی بن سورۃ، سنن ترمذی، مکتبہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۷۵ء،(ج ۴، ص ۳۶۰)۔

(113) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء،(ص ۱۴۷،۱۴۸)۔

(114)ایضاحوالۂ سابقہ،(ص ۱۴۹)۔

(115)ابن ابی جمرہ، عبد اللہ بن ابی جمرہ، الازدی، الاندلسی،(متوفی ۶۹۹ھ)، بہجۃ النفوس وتحلیہا بمالہا وما علیہا، مصر، مطبعۃ الصدق الخیریۃ، ۱۳۶۳ھ، (ج ۳، ص ۹۸)۔

(116) تقی عثمانی، مفتی ،میرے والد میرے شیخ،ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء،(ص ۱۵۰،۱۵۱)۔

(117)اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء وتلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ،(ص ۱۲۸)۔

(118)اکبر شاہ بخاری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۰ء،(ج ۲ ص ۷۹۳)۔

(119)اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء وتلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ،(ص ۱۲۸،۱۲۹)۔

(120)ایضاحوالۂ سابقہ،(ص ۱۲۹)۔

(121)ایضامحولۂ بالا،(ص ۱۳۰)۔

(122)اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء وتلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ،(ص ۱۳۰)۔

(123)ایضاحوالۂ سابقہ،(ص ۱۳۰،۱۳۱)۔

(124)ایضامحولۂ بالا،(ص ۱۳۲)۔

(125)اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء وتلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ،(ص ۱۳۲،۱۳۳)۔

(126)ایضاحوالہ سابقہ،(ص۱۳۳،۱۳۴)۔

(127)ایضامحولہ بالا،(ص۱۳۴،۱۳۵)۔

(128)اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی،۱۴۳۱ھ،(ص۱۳۵،۱۳۶)۔

(129)ایضاحوالہ سابقہ،(ص۱۳۸،۱۳۹)۔

(130)ایضامحولہ بالا،(ص۵،۶)۔

(131)اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دار العلوم کراچی،۱۴۳۱ھ،(ص۶-۹)۔

۲

بابِ دوم

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفی خدمات

- فصل اول: حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا منہج واسلوب
- فصل دوم: تفسیرِ قرآن وعلومِ قرآن
- فصل سوم: علم حدیث
- فصل چہارم: فقہی تصانیف
- فصل پنجم: اصلاحی تصنیفات

۱

فصلِ اوّل

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا منہج واسلوب

﴿بابِ دوم: مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفی خدمات﴾

مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ کو جہاں اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی دولتِ عظمیٰ سے مالا مال فرمایا تھا، وہاں اصلاحِ قوم کے جذبہ خیر سے بھی سرشار فرمایا تھا، اس کا واضح ثبوت آپ کی وہ تصانیف ہیں جو آپ نے امتِ مرحومہ کی اصلاح کی خاطر تصنیف فرمائیں، یہ فکر و جذبہ دراصل آپ کو اپنے مرشد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ورثہ میں ملا تھا، اس جذبے نے آپ کو بیسیوں ایسی کتب لکھنے پر مجبور کر دیا جن کی علماء اور عام مسلمانوں کو شدید ضرورت تھی، آپ کی یہ تصانیف ایک طویل عرصہ تک امت کو راہ ہدایت پر چلنے میں ممد و معاون رہیں گی۔

ذیل میں اولا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے حوالے سے بعض خصوصیات ذکر کی جائیں گی، اس کے بعد آپ کی تصانیف کا تعارف پیش کیا جائے گا۔

فصل اول: حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا منہج و اسلوب

تصانیف میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا عمومی طرز و اسلوب:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کثیر التصانیف شخصیت تھے، آپ کی بعد کی تصانیف میں صلاح پسندانہ انداز غالب نظر آتا ہے اور اس کی وجہ بھی بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں آغاز شباب میں دوسروں کی تردید کے لیے بڑی شوخی اور چلبلی تحریر لکھنے کا عادی تھا اور تحریری مناظروں میں میرا طرز تحریر طنز و تعریض سے بھرپور ہوتا تھا اور ''ختم نبوت'' میں نے اسی زمانے میں لکھی تھی، لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میرے انداز تحریر کا رخ بدل دیا اور وہ یہ کہ:

''میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب ''ختم نبوت'' میں جو دلائل پیش کیے ہیں، بنظر انصاف پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہت مضبوط معلوم ہوتے ہیں، اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں مرزا صاحب کی اتباع سے تائب ہو جاؤں لیکن آپ نے اس کتاب میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ مجھے اس اقدام سے روکتا ہے، میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ دلائل پر اکتفا کرتے ہیں، طعن و تشنیع سے کام نہیں لیتے، اس لیے میں اب تک اپنے مذہب پر قائم ہوں اور آپ کی طعن و تشنیع نے دل میں کچھ ضد بھی پیدا کر دی ہے''۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ ان صاحب نے یہ بات کہاں تک درست لکھی تھی، لیکن اس واقعے سے مجھے یہ تنبہ ضرور ہوا کہ طعن و تشنیع کا یہ انداز مفید کم اور مضر زیادہ، چنانچہ اس کے بعد میں نے ''ختم نبوت'' پر اس نقطہ نظر سے نظر ثانی کی، اور اس میں ایسے حصے حذف کر دیے، جن کا مصرف دل آزاری کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کے بعد کی تحریروں میں دل آزار اسلوب سے مکمل پرہیز شروع کر دیا[1]''۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے منہج کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مزید لکھتے ہیں:

" والد صاحب فرماتے تھے کہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کے طریق کار سے سبق لینا چاہیے کہ وہ ہمیشہ گالیوں اور طعنوں کے جواب میں پھول برساتے رہے ہیں۔انہوں نے کبھی کسی کی سخت کلامی کا جواب بھی نہیں دیا مثلاً حضرت ہود علیہ السلام سے ان کی قوم کہتی ہے کہ:

﴿إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِي سَفَاهَةٖ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ ٱلۡكَٰذِبِينَ ۝٦٦﴾(2)۔

ترجمہ: بلاشبہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور آپ کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

اس فقرے میں انہوں نے بیک وقت جھوٹا ہونے اور بے وقوف ہونے کا طعنہ دیا ہے والد صاحب فرماتے تھے کہ:

اگر آج کا کوئی مناظر ہوتا تو جواب میں ان کے باپ دادا کی بھی خبر لاتا، لیکن سنیے کہ اللہ کا پیغمبر کیا جواب دیتا ہے:

﴿قَالَ يَٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِي سَفَاهَةٞ وَلَٰكِنِّي رَسُولٞ مِّن رَّبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۝٦٧﴾(3)۔

ترجمہ: اے قوم! میں بے وقوفی میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ میں تو پروردگار عالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں۔

دعوت کا کام انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے،اس لیے اس میں غصہ نکالنے،طنز کے تیر ونشتر چلانے یا فقرے کس کر چٹخارے لینے کا کوئی موقع محل نہیں،اس کام میں تو نفسانیت کو کچلنا پڑتا ہے اور اس کے لیے دوسروں کی گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینے کا حوصلہ چاہیے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحب قدس سرہ سنایا کرتے تھے کہ:

ایک مرتبہ حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید صاحب قدس سرہ وعظ کہنے کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ اتنے میں مخالفین میں سے کوئی شخص سامنے آگیا اور اس نے مولانا کی تحقیر وتذلیل کی غرض سے کہا:

''مولانا! میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں؟''

تصور تو فرمایئے کہ یہ بات اس شخص سے کہی جارہی ہے جو ایک طرف علم وفضل کا دریائے بے کراں اور دوسری طرف خاندانی طور پر مسلم شہزادہ اور جس نے دین کی خاطر اپنے سارے شاہی ٹھاٹھ باٹھ کو تج کر رکھ دیا، اور پھر یہ بات اس وقت کہی جارہی ہے جب وہ وعظ کہہ کر اتر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے کچھ نہ کچھ معتقدین یا ہم خیال حضرات بھی اتر رہیں ہوں گے، آج اگر کسی واعظ سے ایسے ماحول میں یہ بات کہی جائے تو واعظ صاحب برافروختہ ہو کر اس کے حسب نسب کو معرض بحث میں لے آئیں گے اور ان کے رفقاء یقیناً ایسے شخص کو سلامت نہ جانے دیں گے لیکن بے نفسی کی انتہا دیکھیے کہ حضرت شاہ صاحب نے جواب میں فرمایا:

''جناب آپ کو کسی نے غلط خبر پہنچائی، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو اب تک دہلی میں موجود ہیں''(4)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے منہج سے استدلال:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بہت عمیق تھی، انھوں نے چند الفاظ میں ہی علامہ اقبال اور اکبر الٰہ آبادی مرحوم کی شاعری کی وجہ شہرت پر ایسا تبصرہ کیا ہے کہ جس سے ان کے اپنے طرز تصنیف پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان دونوں شعراء کے کلام میں وجہ فرق بھی معلوم ہو جاتا ہے، حضرت فرماتے ہیں:

''اردو زبان میں دو شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے دین کی خدمت کی ہے اور اس سے دینی فکر کی اشاعت کا کام لیا ہے، ایک اکبر الٰہ آبادی مرحوم ہیں اور دوسرے ڈاکٹر اقبال مرحوم، ان دونوں میں سے اکبر الٰہ

آبادی مرحوم کے یہاں فکری سلامتی اقبال مرحوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔اکبر مرحوم کی فکر ٹھیٹھ دینی فکر ہے اوران کے یہاں حکمت کی بھی فروانی ہے،اقبال مرحوم کی فکر بھی اگرچہ مجموعی اعتبار سے دینی فکر ہے مگر اس میں اس درجہ سلامتی نہیں،اس کے باوجود یہ بات واضح طور سے نظر آتی ہے کہ اقبال کی شاعری جتنی مؤثر ہوئی اس کا جتنا فائدہ پہنچا،اکبر مرحوم کی شاعری اس درجہ مؤثر نہیں ہوئی،میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے طنز و تعریض کا طریقہ اختیار کیااور طنز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے ہم خیال لوگ لطف محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے کوئی مؤثر اصلاحی کام نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مخالفین میں ضد پیدا ہو جاتی ہے"[(5)]۔

حق بات کہنے میں مداہنت سے اجتناب:

گذشتہ تحریر میں اس بات کا تذکرہ ہو چکا کہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر و تقریر طعن و تشنیع سے خالی ہوتی تھی اور اصلاحانہ پہلو غالب ہوتا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ حق کو حق یا باطل کو باطل کہنے میں مداہنت سے کام لیتے تھے،بلکہ آپ اس باب میں ایک معتدل مذاق کے حامل تھے،جہاں باطل کو باطل کہنے کی بات آتی تو احسن طریقے سے جدال بھی کرتے تھے،آپ فرماتے تھے:

''داعیٔ حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہیے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم و ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو لیکن اگر کوئی اسے توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے''[(6)]۔

چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحب حق کے معاملے میں ادنی لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا، جس سے عناد کے بجائے دل سوزی، حق پرستی اور لِلٰہیّت مترشح ہوتی تھی۔ چنانچہ جس شخص سے کبھی قلمی مباحثہ رہا ہو، وہ اگر کبھی سامنے آجائے تو نہ آپ کے انداز گفتگو اور انداز تحریر میں کوئی فرق

ہوتا تھا، اور نہ آپ کو کبھی اس بناء پر شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی کہ جس شخص کے بارے میں حد سے گذرے ہوئے الفاظ لکھ چکا ہوں، اس کا سامنا کیسے کروں؟ آپ مخالف نقطۂ نظر والوں کو زبانی گفتگو میں بھی حق کے معاملے میں سخت سے سخت بات کہہ دیتے ہیں، لیکن وہ کبھی یہ تاثر لے کر نہیں اٹھتا تھا کہ اس سختی کا سبب عناد ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں مجھے یاد ہیں جن میں آپ نے بڑے بڑے ذی اثر لوگوں کو خوب کھری کھری سنائیں لیکن ایسا ایک واقعہ یاد نہیں کہ ان کی بناء پر کوئی عناد کا تاثر لے کر گیا ہو"(7)۔

فریق مخالف کے نظریات وافکار کی تعیین میں احتیاط:

دورِ حاضر کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کے نظریات کی تردید میں انتہائی عجلت سے کام لیا جانے لگا ہے، اور اس بات کی تحقیق نہیں کی جاتی کہ وہ بات اس قائل نے واقعۃً کہی بھی ہے یا کسی اور شخص نے اس کی طرف منسوب کردی ہے۔

نیز یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ قائل کا اس بات کے کہنے سے مقصد ومطلب کیا تھا۔ یہ باتیں جانے بغیر ہی اس پر تردید اور طعن وتشنیع شروع کردی جاتی ہے، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں بہت ہی محتاط تھے، اور بہت تحقیق وجستجو کے بعد ہی کسی کے رد میں قلم اٹھاتے تھے۔

چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"دوسرے نظریات کی تردید میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا ایک اصول یہ تھا کہ جس شخص یا گروہ پر تنقید کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات وافکار اور اس کے منشاء ومراد کی اچھی طرح تحقیق کرلی جائے اور اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کی جائے جو اس نے نہیں کہی یا جو اس کی عبارتوں کے منشاء ومراد کے خلاف ہو"(8)۔

خلاصہ کلام یہ کہ چاہے تحریر وتقریر کسی چیز کی دعوت وتبلیغ کے متعلق ہو یا کسی باطل نظریے کی تردید میں، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ دعوتِ حق مضبوطی سے دی جائے اور ایسے اسلوب سے دی جائے جس میں طعن وتشنیع اور دل آزاری کا شائبہ تک نہ ہو اور اس میں ہمدردی، ودل سوزی اور نرمی وشفقت کی مٹھاس ہو، تاکہ ہر ذہن کے لوگ اس تحریر وتقریر سے آزادانہ استفادہ کریں اور ان کے ذہن اس بات کو جلدی قبول کریں۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات کی چند خصوصیات:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات کی خصوصات کے متعلق مولانا اشرف خان تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مفتی صاحب کی تمام تالیفات میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو صرف ان کی تحریر کا مخصوص رنگ کہلا سکتی ہیں، جن کی وجہ سے ان کی تالیفات مفید خاص وعام ہیں۔

ا۔ پہلی خصوصیت ان کی زبان کے بے ساختگی اور سلاست ہے۔ حضرت مفتی صاحب کسی مسئلہ پر قلم اٹھاتے ہیں تو اسے ایسے عام فہم انداز میں صاف صاف بیان کرتے ہیں کہ متوسط استعداد کا آدمی بھی اس سے بھر پور استفادہ کر سکتا ہے، عبارت میں بے جا طول اور مطالب میں پیچیدگی سے ان کی تحریر مبرا ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت ان کے لب ولہجہ میں متانت اور سنجیدگی ہے وہ کٹر سے کٹر مخالف کے مقابلہ میں تحمل اور متانت سے بات کرتے ہیں اور تلخی واکتاہٹ سے ہمیشہ دامن کشاں رہتے ہیں۔ ان کی تحریر میں آپ کو فقرے بازی کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو لیتے ہیں اس کے ساتھ پوری وفاداری کرتے ہیں۔ اور موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے دیتے۔

۴۔ چوتھی خصوصیت ان کا تفقہ، نکتہ سنجی اور استدلال کی قوت ہے جو ان کی ہر تصنیف میں نمایاں ہے۔ وہ فقیہ النفس ہیں اور ان کی ہر عبارت تفقہ کی آئینہ دار ہے۔

۵۔ پانچویں خصوصیت مطالب کی تہذیب اور مضامین کی ترتیب کا خداداد سلیقہ ہے"(9)۔

آپ کی تصنیفات کی تعداد اور ان پر اجمالی تبصرہ:

آپ کی کل تصانیف کی تعداد اور ان پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اشرف خان رقم طراز ہیں:

''حضرت مفتی صاحب قدس سرہ، کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے جو تفسیر و حدیث، فقہ و تصوف، ادب و کلام، اصلاح معاشرت وغیرہ مختلف علوم پر مشتمل ہیں بعض کتابیں ہزار ہا ہزار صفحات پر محیط ہیں اور بعض چند صفحات کی ہیں جنہیں موجودہ اصطلاح میں مقالہ یا مضمون کہا جا سکتا ہے۔ ہر کتاب مصنف کے عمق علم، معلومات کی وسعت، علمی دیانت و ثقاہت و احتیاط کا نمونہ ہے۔

حضرت مفتی صاحب کا قلم متین و سنجیدہ ہونے باوجود سبک روشگفتہ سہل اور عملی گیراؤ، و گہراؤ اور معلومات کا گنجینہ ہے۔ جس سے ہر سلیم الطبع قاری اپنے ذوق کی آبیاری کر سکتا ہے حضرت مفتی صاحب کی تحریر میں نہ تو تھکا دینے والا اطناب پایا جاتا ہے، نہ تشنگی باقی رکھنے والا ایجاز، آپ کا قلم محتاط، موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر ممکن مواد کو سمیٹتا ہوا علم و حکمت کا نور بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ آپ الفاظ کی شان و شوکت مرصع و مسجع عبارت کے قائل نہیں لیکن جو کہنا چاہتے ہیں سلجھی اور نتھری ہوئی پاکیزہ معیاری اور سہل زبان میں کہتے چلے جاتے ہیں، قاری اکتانے نہیں پاتا اور مصنف کا حسن اخلاص، مضمون سے لگن، موضوع سے وفاداری، علم کا گہراؤ پیشکش کا سلیقہ اور وسعت مطالعہ اس کے دل دماغ کو متاثر کرتا چلا جاتا ہے آپ کی نگارشات سادہ اور سہل ہونے کے باوجود ادبی چاشنی سے خالی نہیں۔ اور بعض مقامات پر سہل ممتنع کا حکم رکھتی ہیں،،(10)۔

٢

فصلِ دوم

تفسیر قرآن وعلوم قرآن

فصل دوم: تفسیرِ قرآن وعلوم قرآن

قرآن پاک کی تلاوت اور اس میں نکتہ آفرینی کا خاص ذوق:

قرآن پاک کی تفسیر لکھنا بہت بڑی سعادت ہے، مگر اس کے متعلق یہ شعر سو فیصد صادق آتا ہے کہ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس کے لئے صرف صاحب قلم اور صاحب علم ہونا شرط نہیں بلکہ صاحبِ ذوق ہونا بھی شرط ہے اور مفتی صاحب، صاحبِ علم اور صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب ذوق بھی تھے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تلاوت قرآن کا خاص ذوق تھا۔ خاص طور پر عمر کے آخری پندرہ بیس سالوں میں آپ گوناگوں مصروفیات کے باوجود بڑے اہتمام کے ساتھ کئی کئی پارے روزانہ تلاوت کے لئے وقت نکالتے تھے، ایک چھوٹی سی حمائل ہمیشہ آپ کے دستی بیگ میں ساتھ رہتی تھی، اور جب کبھی ذرا موقع ملتا، آپ اس میں سے تلاوت شروع فرمادیتے، خاص طور سے جب آپ کو کہیں جانا ہوتو کار میں سفر کے دوران بیشتر وقت آپ تلاوت میں صرف فرماتے، اس کے علاوہ گھر میں نماز فجر اور نماز عصر کے بعد آپ کی تلاوت کے خاص اوقات تھے۔

آپ کی یہ تلاوت محض برائے تلاوت ہی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس دوران آپ قرآن کریم میں تدبر فرماتے تھے، احقر نے بارہا دیکھا کہ تلاوت کے دوران آپ اچانک رک گئے ہیں، اور دیر تک ایک ہی آیت کو بار بار پڑھ کر اس پر غور فرمارہے ہیں۔ اس تدبر کے دوران اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے حقائق ومعارف سے متعلق عجیب

وغریب نکات منکشف فرمائے تھے۔ جب کبھی تلاوت کے وقت ہم لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تو اکثر یہ نوادر د نکات ہمیں بتلا دیا کرتے تھے، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ تلاوت کرتے ہوئے آپ احقر کو یا برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم کو باقاعدہ متوجہ فرماتے، اور ہم سے سوال کرتے کہ دیکھو، اس آیت میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، حالانکہ بات دوسرے لفظ سے بھی واضح ہو سکتی تھی، خاص طور پر اس لفظ کے انتخاب میں کیا حکمت ہے۔ اور جب ہم عام طور سے جواب نہ دے پاتے تو پھر خود ہی کوئی لطیف نکتہ بیان فرماتے جس سے مشام روح معطر ہو جاتا"(11)۔

ا۔ تفسیر معارف القرآن:

تفسیرِ معارف القرآن کا مأخذ:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کس طرز پر لکھی، اور کس تفسیر کو بنیاد بنایا اس کے متعلق مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''تفسیر معارف القرآن'' کی شکل میں آپ نے جو عظیم علمی کارنامہ انجام دیا، آج بفضلہ تعالیٰ وہ ایک دنیا کو سیراب کر رہا ہے، عام مسلمانوں سے لے کر علماء تک سب اس سے فیض یاب ہو رہے ہیں، لیکن جب کوئی شخص آپ کے سامنے اس تفسیر کی تعریف کرتا تو یہی فرماتے کہ: ''تفسیر لکھنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، البتہ میں نے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے بیان القرآن کو نسبتاً آسان انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، علماء کرام کے لئے تو شاید اس میں فائدے کی چیزیں زیادہ نہ ہوں، البتہ میں نے عام انسانوں کے لیے یہ کتاب لکھی ہے، خدا کرے کہ اس سے کچھ فائدے پہنچ جائے۔'' لوگ تو عام طور پر دوسروں سے اخذ کی ہوئی باتیں اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، حضرت والد صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ باوجودیکہ ''معارف

القرآن'' میں وقت کی ضرورت کے بے شمار ایسے مسائل ومباحث موجود ہیں جو''بیان القرآن'' اور دوسری تفسیروں کے مباحث سے زائد ہیں، لیکن وہ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے کہ:" اس کتاب میں میں نے کام کیا کیا ہے؟بس''بیان القرآن''اور بعض دیگر تفاسیر کی تسہیل کر کے انھیں نسبتاًعام فہم انداز میں بیان کر دیا ہے"[12]۔

تفسیر''معارف القرآن'' کی ابتداء:

اس مایہ ناز تفسیر کے لکھنے میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کن مراحل سے گذرنا پڑااور کس منہج کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تفسیر کی ابتداء کی،اس حوالے سے خود مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے:

''ابتداء میں علم تفسیر کے ساتھ کوئی خصوصی شغف نہیں رہا، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب سب سے زیادہ اسی سے مناسبت اور شغف علم تفسیر کے ساتھ معلوم ہوتا ہے،اور دعا ہے کہ اسی پر میرا خاتمہ ہو''[13]۔

عملی طور پر اس کے لکھنے کی ابتداء کے متعلق مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''یوں تو دار العلوم دیوبند میں تدریس کے علاوہ آپ کو'' جلالین'' اور ''بیضاوی''پڑھانے کی نوبت آئی،اور ایک عرصے تک وہ دورہ تفسیر کے بعض اسباق تفسیر ابن کثیر وغیرہ بھی آپ کے ذمے رہے۔ لیکن اس زمانے میں خصوصی شغف علم فقہ فتویٰ کے ساتھ تھا۔ پھر جب دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے ''احکام القرآن'' کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو اس زمانے میں تفسیر سے خصوصی اشتغال کی نوبت آئی پھر ہجرت پاکستان کے بعد بھی مسجد باب الاسلام کراچی میں روزانہ اور ریڈیو پر ہفتہ وار درس قرآن کا سلسلہ رہا، جو بالآخر ''معارف القرآن'' جیسی عظیم تفسیر کی شکل میں منظر عام پر آیا، اس پورے زمانے میں قرآن کریم ہی آپ کی دلچسپیوں اور غور وتدبر کا محور رہا''[14]۔

خصوصی تحقیقات:

مفتی شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس مایہ ناز تفسیر میں جن موضوعات پر خاص طور پر علمی تحقیقات پیش کیں ان کی مختصر فہرست مولانا عبدالشکور ترمذی نے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

''ا۔ بندوق کی گولی سے شکار کے مسائل

۲۔ مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ

۳۔ انگریزی دواؤں کا حکم

۴۔ اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

۵۔ اسلام میں عورتوں کا موقف

۶۔ نظام الطلاق فی الاسلام

۷۔ سود (ربا) کی اسلامی تعریف اور اس کے حرام ہونے کی حکمت اور موجودہ زمانہ میں اس سے نجات کی صورت، سود و ربا کی معاشی خرابیاں

۸۔ حرمت شراب اور اس کے متعلقہ احکام

۹۔ حرمت قمار

۱۰۔ بعض معاصرین کی غلط فہمی کا ازالہ

۱۱۔ اسلام میں غلامی کی بحث

۱۲۔ اکتناز دولت پر اسلامی قوانین کی ضرب کاری

۱۳۔ وطنی یا نسبی قومیت کفر و جاہلیت کا نعرہ ہے

۱۴۔دو قومی نظریہ

۱۵۔زکوۃ میں کمی بیشی کا کسی کو کسی زمانہ میں اختیار نہیں

۱۶۔سائنس کی تعلیم بھی عطاحق تعالی ہے

۱۷۔اسلامی سزاؤں پر اعتراضات کا جواب

۱۸۔زکوۃ حکومت کا ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے۔

۱۹۔حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بعض معاصرین کی غلطی اور اس کی تحقیق

۲۰۔حکومت کا غذائی کنڑول

۲۱۔معاش میں اختلاف

۲۲۔ارتکاز دولت کے انسداد کا قرآنی نظام

۲۳۔ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے

۲۴۔انسداد فواحش اور حفاظت عصمت کا ایک اہم باب "پردہ نسواں"

۲۵۔تفسیر قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار

۲۶۔تقسیم معیشت کا قدرتی نظام، معاشی مساوات کی حقیقت، اسلامی مساوات کا مطلب"[15]۔

معارف القرآن کے خصوصی التزامات:

مولانا عبدالشکور ترمذی "معارف القرآن" کے خصوصی التزامات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"۱۔ متنِ قرآن کریم کے ترجمہ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجموں پر اعتماد کیا گیا ہے بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی لفظ زیادہ واضح اور آسان سمجھ کر کسی دوسرے ترجمے سے لیا گیا ہو۔

۲۔ ترجمہ کے بعد مکمل تفسیر اور تفصیل وتشریح سے پہلے آیات کا خلاصہ مضمون لکھ دیا گیا ہے جو بجائے خود ایک مختصر تفسیر کا کام دیتا ہے اور مشاغل میں مصروف آدمی کے لئے قرآن پاک سمجھنے کے لئے ایک حد تک کافی ہے یہ حصہ در حقیقت حضرت حکیم الامت تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ ہے مگر اس کو آسان اور سہل کر کے پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ البتہ خاص خاص لغات ومفردات کا حل اور ان کی تشریح لغت اور تفسیر کی معتبر کتابوں کے حوالے سے نقل کر دی گئی ہے۔

۴۔ اصل تفسیر میں اصول تفسیر کی مطابقت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے سلف صالحین کی تفسیروں پر اعتماد کیا گیا ہے جو صحابہ وتابعین سے منقول وماثور اور مستند کتب حدیث وتفسیر میں موجود ہیں اور ہر مواقع پر جہاں سے وہ تفسیر لی گئی ہے اس کتاب کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔

۵۔ لطائف ومعارف کے درجہ میں متاخرین میں سے مستند اہل تفسیر کے مضامین بھی لئے گئے ہیں اور ایسے مضامین کو خصوصیت سے اہمیت دی گئی ہے جو انسان کے دل میں اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ومحبت کو بڑھائیں اور قرآن پر عمل کرنے اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف مائل کریں۔

۶۔ اس کے بعد آیات مندرجہ سے متعلق احکام ومسائل لکھے گئے ہیں اس میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ صرف ایسے احکام ومسائل کو لیا جائے جن پر الفاظ قرآن کی دلالت قواعد واصول کے تحت واضح ہے، ایسے احکام ومسائل کا بڑا حصہ، تفسیر قرطبی، احکام القرآن (از امام جصاص)، احکام القرآن (از ابن عربی)، تفسیرات احمدیہ

،البحر المحیط (از ابن حیان)، روح المعانی، روح البیان، بیان القرآن (از حکیم الامت) اور تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے۔ احکام و مسائل کے تحت جس طرح ہر زمانہ کے مفسرین نے اپنے اپنے زمانہ کے فرقوں اور ان کے مباحث کو اہمیت دی ہے اسی طرح اس تفسیر میں زمانہ حاضرہ کے اہم مسائل کو موضوع بنا کر اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی مسائل پر قرآن کریم اور سنت کی روشنی میں تفصیلی تبصرے کئے گئے ہیں اور تجدد پسند لوگوں کی طرف سے ان مسائل میں جو شکوک وشبہات پیدا کرنیکی کوشش کی گئی ہے ایسے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ تعلیمات اسلام میں کئی ادنی ترمیم کے بغیر تسلی بخشی طور پر کیا گیا ہے۔

۷۔ اس زمانہ کے بعض مصنفین نے قرآن کریم کی تفسیر میں جو غلطیاں کی ہیں موقع بموقع ان غلطیوں کی بڑے ناصحانہ اور منصفانہ انداز میں تفصیلی نشاندہی کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس تفسیر میں زیادہ زور ان تعلیمات پر دیا گیا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں اور یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم محض اعتقادی اور نظریاتی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کی ہدایت انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور مشتمل ہیں اور یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس لئے جابجا قرآن کریم سے روزمرہ کے مسائل زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس سلسلہ میں جو تعلیمات اخذ کی گئی ہیں ان کا طریقہ استنباط اس قدر لطیف اور وجد آفریں ہے کہ اس کی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ اہل علم اور اہل ذوق ہی کر سکتے ہیں"[16]۔

۲۔ احکام القرآن (عربی):

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بلند پایہ اہم علمی تصنیف ہے جس کی نظیر سابقہ زمانہ میں بھی بہت کم یاب ہے، حضرت امام ابو بکر جصاص (متوفی ۳۱۰ھ) کے بعد مسلک احناف کے اصول وفروع پر قرآن کریم آیات سے استدلال اور اختلافی مسائل میں

دوسرے ائمہ کرام کے دلائل کے جوابات کو کتابی صورت میں جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی،اس اہم دینی ضرورت کو ''احکام القرآن'' کے ذریعہ بطریق احسن پورا کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب علماء وطلباء علوم عربیہ کے لئے اس صدی کا قابل قدر اور عظیم علمی تفسیری سرمایہ ہے۔

آغاز اور سببِ تالیف:

اس کے آغاز اور سببِ تالیف کے حوالے سے مولانا عبدالشکور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

''۱۳۵۱ھ میں جب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف کے بعد دورۂ تفسیر قرآن کریم بھی پڑھانے کی تجویز ہوئی اور اس دورۂ تفسیر کے افتتاح کی درخواست کے لئے اکابر علماء کے ایک وفد کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون تشریف لے گئے، اس وقت دورۂ تفسیر کے نصاب میں ''تفسیر ابن کثیر''، ''بیضاوی'' (کامل) کے ساتھ مسلکِ احناف کی تائید کے لئے ''تفسیر مدارک'' رکھنے کا تذکرہ بھی آیا۔

حضرت تھانوی نے ''تفسیر مدارک'' کے بجائے اُن آیات کے انتخاب کا مشورہ دیا جن سے حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہے اور اس مجوزہ تصنیف کا نام بھی حضرت تھانوی قدس سرہ نے اسی وقت ''دلائل القرآن علی مسائل النعمان'' تجویز فرمادیا۔

اس کے بعد غالباً ۱۳۵۴ھ میں حضرت تھانوی نے اس کام کو حضرت مفتی صاحب کے سپرد فرمایا اور حضرت مفتی صاحب نے اسی وقت کام بھی شروع فرمادیا تھا لیکن چونکہ حضرت موصوف اس وقت دارالعلوم دیوبند کے عہدہ صدارت وافتاء پر مامور اور بہت زیادہ مشغول تھے اس لئے اس کام کے لئے جس قدر فراغت درکار تھی وہ میسر نہیں آسکی، ادھر اس زمانہ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہ ''اِعلاء السنن'' کی تصنیف سے فارغ ہوگئے تو حضرت تھانوی نے اس خیال سے کہ حضرت مولانا موصوف ''دلائل القرآن'' کا کام جلد پورا کر دیں

گے، اس کی تالیف کا کام حضرت مولانا موصوف کے سپرد فرمادیا مگر حضرت مولانا عثمانی کے ڈھاکہ یونیورسٹی تشریف لے جانے کے بعد یہ کام پھر تعویق میں پڑ گیا۔

پھر ۱۳۶۱ھ میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کام کی طرف توجہ خصوصی فرمائی اور پھر چاہا کہ کوئی عالم فارغ ہو کر صرف اس کام میں لگ جائیں تاکہ اس کی جلدی تکمیل ہو جائے مگر ایسی صورت نہ نکل سکی تو اس کے چند حصے کر کے ان حصوں کو حضرات اہل علم پر تقسیم کر دینے کا فیصلہ فرمایا اس تقسیم میں قرآن کریم کی پانچویں اور چھٹی دو منزلیں سورۃ الشعراء سے سورۃ الحجرات تک حضرت مفتی صاحب کے سپرد فرمائی گئیں۔

ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ میں بعض حوادث کی بنا پر حضرت مفتی صاحب دار العلوم دیوبند کے رسمی تعلق سے استعفیٰ دیکر ۱۶ جمادی الثانیہ کو آستانہ عالیہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "احکام القرآن" کی خدمت انجام پر مامور فرمادیا"[17]۔

تفسیر احکام القرآن کی تالیف میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم سے خوشہ چینی:

تفسیر احکام القرآن کی تالیف میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم سے خوب استفادہ کیا اور خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس تفسیر کا خوب اہتمام تھا، مولانا عبد الشکور ترمذی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

" مفتی صاحب نے خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون میں جب "دلائل القرآن" کی تصنیف کا کام شروع فرمایا تو جو سورت لکھنا شروع کرتے اس کو پہلے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خود بار بار تلاوت فرماتے اور اس میں جس مقام سے کوئی حکم مستنبط ہوتا نظر آتا اس کی تقریر بھی حضرت مولانا مفتی صاحب کے سامنے فرماتے مگر اس کے ساتھ ہی غایت احتیاط کی بناء پر ہدایت بھی فرماتے کہ اس کو کتب تفسیر وغیرہ میں تلاش کر لیا جائے اگر کہیں مل جائے تو اس حوالہ سے ورنہ جس سے سنا ہے ان کے حوالہ سے لکھ دیا جائے۔

اس کے علاوہ حضرت اقدس تھانوی اس تصنیف کی طرز اور اس میں کس چیز کو لیا جائے اور کس کو ترک کیا جائے تمام امور کے بارے میں مفصل ہدایت اور رہنمائی فرماتے اور آیت زیر بحث کے بارے میں بھی مضامین عالیہ اور علوم غامضہ کے افادات سے سرفراز فرماتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کا حافظہ بحمد اللہ اس قدر قوی تھا کہ حضرت حکیم الامت کے افادات کو مجلس مبارک میں سن کر ان کو اپنے حافظے میں محفوظ فرمالیتے اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر انکو بعینہ ضبط تحریر میں لے آتے تھے اس طریقے پر سورہ شعراء سے سورہ قصص کے اول تک یہ تفسیری کام حضرت تھانوی کی زیر پرستی اور ہدایات کے مطابق ہوتا رہا''[18]۔

تفسیر احکام القرآن کے دائرہ کار میں وسعت:

''احکام القرآن'' کی تالیف میں ابتداء تو دورۂ تفسیر کے طلبہ کے لئے قرآن کریم سے صرف فقہ حنفی کے دلائل کا استنباط ہی پیش نظر تھا مگر کام شروع ہونے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے گرامی اس تالیف کے موضوع کو عام اور وسیع کرنے کی ہو گئی اور آیاتِ قرآنیہ سے مطلقاً احکام کا استنباط موضوع بحث بنالیا گیا، چنانچہ پھر احکام، خواہ احکام فقہیہ ہوں یا عقائد و تصوف اور اخلاق و تمدن اور نئی تعلیم کے اثر سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات ہوں، سب کا استنباط موضوع بحث بن گیا اور اس تفسیر کا نام بھی وسعت موضوع کے لحاظ سے ''دلائل القرآن'' کے بجائے ''احکام القرآن'' تجویز فرمادیا گیا۔

اس تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالشکور ترمذی رقم طراز ہیں:

''غرضیکہ علم تفسیر کی یہ محققانہ اور بلند علمی کتاب ہے جس کی تصنیف و تالیف کے لئے حضرت حکیم الامت تھانوی کی نظر انتخاب حضرت مفتی صاحب پر پڑی اور حضرت تھانوی نے آں موصوف کو اس خدمت کے

انجام دینے کے لئے مامور ومنتخب فرمایا تھا یہ کتاب حضرت مفتی صاحب کے تفقہ اور استنباط مسائل، وسعتِ نظر کا آئینہ اور حضرت موصوف کی وسعت معلومات کا گنجینہ ہے، حضرت مفتی صاحب نے اس کتاب کی تالیف میں انتہائی دیدہ ریزی اور محنت اور بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ فتنہ اور عقائد نیز معاشی اور معاشرتی مسائل کا بہت بڑا گر اں قدر ذخیرہ جمع فرمایا ہے، خاص طور سے ایسے مسائل کی توضیح وتفصیل پر زیادہ زور دیا ہے، جو عہد حاضر میں خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہیں اور ان کے بارہ میں پہلے علماء کی کتابوں میں ایک جگہ تفصیلی بحث دستیاب نہیں ہوتی''۔

بعض مسائل پر مبسوط ومفصل بحثوں نے مستقل رسالوں کی شکل اختیار کرلی ہے جن کو ''احکام القرآن'' کا جز بنادیا گیا ہے"(19)۔

زمانہ تصنیف اور حجم:

مولانا عبدالشکور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت حکیم الامت تھانوی کے بتائے ہوئے طریقوں اور تعلیم فرسودہ اصولوں کی روشنی میں حضرت مفتی صاحب نے اس تصنیف کے کام کو جاری رکھا اور بڑی محنت ومشقت سے اس مفوضہ تفسیری خدمت کو دو جلدوں میں پایۂ تکمیل تک پہونچادیا ایک جلد ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ سے شروع ہوکر دوسرے وقتی ضروری کاموں کے ساتھ ساتھ ۲۴ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ تک مکمل ہوئی۔

دوسری جلد کی ضخامت ۲۰۷ صفحات ہے اس کی تصنیف کا کام اگرچہ ذوالحجہ ۱۳۶۳ھ میں ہی شروع ہوچکا تھا اور ذوالقعدہ ۱۳۶۴ھ میں سورہ فصلت کے آخر تک لکھا جاچکا تھا، مگر تحریک پاکستان اور تقسیم کے بعد کے

ضروری اہم مشاغل میں مصروفیات نے تقریباً ۲۴ سال کے عرصہ دراز تک اس کام کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں دی۔

عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے عظیم احسان فرمایا اور اس اہم علمی خدمت کی تکمیل کا موقع حضرت مفتی صاحب کو عطا فرمایا گیا، چنانچہ محرم ۱۳۸۸ھ سے یہ کام پھر تسلسل کیساتھ شروع ہوا اور سورہ شوریٰ سے سورہ حجرات کے آخر تک کا کام کسی وقفہ کے بغیر مسلسل ہوتا چلا گیا، بالآخر ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ کی انیسویں تاریخ کی نیک ساعت میں یہ بابرکت خدمت تفسیر قرآن اختتام کو پہونچی۔

نفعہا اللہ بہا و جمیع المسلمین آمین"[20]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر معارف القرآن اور احکام القرآن میں بہت ہی قیمتی مضامین سپردِ قلم کیے ہیں، مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"۔۔۔ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید ترین "تفسیر معارف القرآن" میں اور عربی تفسیر "احکام القرآن" میں قادیانیت سے متعلقہ مباحث پر جو گراں قدر علمی ذخیرہ سپرد قلم فرمایا ہے، اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم اور جامع کتاب مرتب ہو سکتی ہے"[21]۔

۳۔ تفصیل الخطاب فی تفسیر آیات الحجاب:

مولانا عبدالشکور ترمذی اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اس کتاب میں عورتوں کے پردہ سے متعلق جتنی آیاتِ قرآن کریم وارد ہوئیں، ان کی مکمل تفسیر اور ان میں ظاہری تعارض کا دفع کیا گیا ہے، اس کے بعد عذاب قبر کے مسئلہ میں اہل السنت والجماعت کے اجماع کا ذکر فرما کر، منکرینِ عذاب قبر، معتزلہ اور ملحدین کے شبہات کے جوابات ارقام فرمائے گئے ہیں"[22]۔

۴۔ موقف اہل الانابہ فی مشاجرات الصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین:

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالشکور ترمذی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اس رسالہ میں مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق اہل سنت والجماعت کے موقف کا ثبوت کتاب وسنت اور اقوال سلف کی روشنی میں پانچ آیات کریمہ اور دس احادیث نبویہ سے پیش کیا گیا ہے، اس تالیف کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت قطعی جنتی اور مغفور ہے''[23]۔

۵۔ ''دستور قرآنی'' مع ضمیمہ ''غیر مسلموں کے حقوق'':

اس کے متعلق مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب رقم طراز ہیں:

''یہ ایک رسالہ ہے اور بڑے سائز کے ۳۶ صفحات پر ہے، یہ بھی مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیری خدماتِ جلیلہ میں سے تقاضۂ وقت کے مطابق بڑی ہی اہم اور اپنی نوعیت کی خصوصی خدمت ہے، جن دنوں مسجد باب السلام، متصل آرام باغ کراچی میں حضرت مفتی صاحب کا درس قرآن جاری تھا، اسی درس قرآن کی ایک تقریر کو ضبطِ تحریر میں لاکر دوسری چند اہم مضمون کی ایسی آیات کے اضافہ کے ساتھ جن میں اسلامی مملکت کے دستوری مسائل مذکور ہیں اور حضرت موصوف کے ملاحظہ اور نظر اصلاحی کے بعد یہ بات واضح کرنے کے لئے شائع کیا گیا تھا کہ اسلامی دستور جس کا مطالبہ قیام پاکستان کے وقت سے ہی تمام مسلمانوں کی طرف کیا جارہا ہے وہ صرف اجتہادات اور قیاسات پر مبنی نہیں ہے بلکہ دستور اسلامی کی اہم دفعات منصوص اور براہ راست قرآن سے بھی ثابت ہیں"[24]۔

نیز انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

''زیر نظر رسالہ میں حضرت مفتی صاحب نے اس فرض کی انجام دہی کے لئے قرآن شریف کی ان آیات کی تفسیر و تشریح کے ضمن میں جن سے اسلامی مملکت کی اہم دفعات کا استنباط کیا جا سکتا ہے اسلامی قوانین کو مروجہ طریقہ تدوین قانون کے مطابق دفعات کی شکل میں مرتب فرما کر اسلامی حکومت کا دستوری خاکہ ہاتھوں میں دے دیا ہے مثلاً اسلامی حکومت کی غرض اور اس کا مقصد کیا ہے اسلامی حکومت کا طرز اور طریقہ کیا ہے؟اس کے فرائض کیا ہیں؟ صدر مملکت کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیئے؟ قومیتوں کی تقسیم اور امتیاز؟ معاشی نظام۔ معاشرہ کی اخلاقی تربیت کا مقام اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کیا ہیں؟

غرضیکہ ایسے بہت سے عنوانات پر حضرت مفتی صاحب نے بصیرت افروز کلام فرما کر منکرین اور معاندین اور مغربیت سے مرعوب طبقہ کے اس اعتراض کا کافی شافی جواب مہیا فرما دیا کہ اسلام کے پاس عدل و انصاف کے لئے کوئی قانون اور ملک کے انتظام و انصرام کے لئے کوئی دستور نہیں ہے۔

اس رسالہ پر علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب و حضرت مولانا ادریس کاندھلوی وغیرہ اکابر عصر کی تقریظات ثبت ہیں بحمد اللہ یہ رسالہ اس قدر مقبول عام اور مفید ثابت ہوا کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا گیا اور بارہ ہزار کاپیاں اس کی مفت تقسیم کی گئیں''(25)۔

٦۔قرآن میں نظامِ زکوۃ:

یہ ٦٤ صفحات کا ایک رسالہ ہے، جو زکوۃ اور متعلقات زکوۃ کے موضوع پر نہایت جامع اور تفصیلی ابحاث پر مشتمل ہے، مفتی عبدالشکور ترمذی اس کے تعارف کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ رسالہ بھی حضرت مفتی صاحب کے ان ہی چھ درسوں کا مجموعہ اور علم تفسیر میں خدمات جلیلہ کا ایک حصہ ہے جو سورہ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق ہفتہ وار جمعہ کے روز ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہے ہیں یہ دونوں

آیتیں سورہ توبہ کی ہیں ایک آیت میں مصارفِ زکوۃ کا بیان ہے کہ کس جگہ خرچ کرنا شرعاً ناجائز ہے اور دوسری میں نظام زکوۃ کے اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہونے کا ذکر ہے، اس کے ضمن میں زکوۃ کی حقیقت اور اس کی تاریخ کا بیان بھی عمدہ پیرائے میں آگیا ہے۔ ان درسوں کی افادیت کے پیش نظر جب ان کا مستقل طور پر رسالہ کی شکل میں شائع کرنے کی فرمائش کی گئی تو حضرت مفتی صاحب نے ان پر از سر نو نظر ثانی فرمائی اور کہیں کہیں ترمیم واضافہ بھی فرمایا۔ اس کے بعد ان کو رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے اہل علم دین اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کے لئے یہ رسالہ تحقیق اور نظر فکر کے اعتبار سے بہت ہی جامع اور بڑا ہی مفید اور کارآمد ہے۔

اس میں زکوۃ کے متعلق تمام اہم مباحث اور موضوعات مثلاً: زکوۃ کی حقیقت اس کی تاریخ، اہمیت وفرضیت، زکوۃ کس میں واجب ہے کس میں نہیں نصاب زکوۃ، نظام زکوۃ، اموال باطنہ کی زکوۃ، مصارف زکوۃ، عاملین زکوۃ، مؤلفۃ القلوب اور فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟ "تملیک" کی شرط، جن کاموں میں زکوۃ صرف نہیں ہو سکتی۔ زکوۃ حکومت کا ٹیکس نہیں، بلکہ عبادت ہے، بیت المال کی مدات کی اقسام اور ان کے احکام غرضیکہ زکوۃ اور متعلقات زکوۃ پر سیر حاصل بحث فرما کر مسئلہ نظام زکوۃ کی تفصیل اور وضاحت فرمائی گئی ہے اور اس سلسلہ کے تمام شکوک وشبہات کا ازالہ فرما کر مسئلہ کو خوب اچھی طرح صاف کر دیا ہے"[26]۔

۷۔ ایمان وکفر قرآن کی روشنی میں:

یہ رسالہ بڑے سائز کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے تعارف میں مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب لکھتے ہیں:

"اس سلسلہ میں سورہ بقرہ کی ابتدائی چار آیتوں کی تفصیلی تفسیر اور چند دوسری آیات کے مضامین پر اجمالی تبصرہ فرما کر ایمان وکفر کی تعریف کو ایسے انداز سے واضح فرمادیا گیا کہ اس کی وضاحت کے بعد اس اختلافی اور نزاعی بحث کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ اور خاتمہ ہو گیا جس کو تجدد پسند لوگوں نے "لاینحل" سمجھ کر پیش کیا تھا اور پنجاب کی

تحقیقاتی عدالت میں بھی ایسے ہی طبقہ کی طرف سے یہ سوال بار بار اٹھایا جارہا تھا، بحمد اللہ یہ مسئلہ ایسا صاف اور بے غبار کر دیا گیا کہ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

علم تفسیر میں حضرت مفتی صاحب کی یہ خدمت بھی بڑی وقیع اور نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس لحاظ سے تو بہت ہی قابل قدر ہے کہ اس کے ذریعہ ''ایمان و کفر کی تعریف'' جیسے بنیادی مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں کر دیا گیا ہے''[27]۔

۸۔ ختم النبوۃ فی القرآن:

اس کتاب کے متعلق مفتی عبد الشکور ترمذی صاحب رقم طراز ہیں:

''270 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم رسالہ حضرت مفتی صاحب کی عظیم الشان ''ختم نبوت'' کامل (بر سہ حصص) کا پہلا حصہ ہے اس میں تقریباً ایک سو ایک آیات قرآنیہ کی تفسیر و تشریح کر کے مسئلہ ختم نبوت کے ہر پہلو کو واضح فرمایا گیا ہے۔

زمانہ حاضر میں جھوٹی نبوت کے مدعی گروہ نے ختم نبوت کے متواتر اجماعی عقیدہ سے عام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے اور اپنے دام تزویر میں پھنسا کر گمراہ کرنے کے لئے جہاں اور طرح طرح کی تلبیسات سے کام لیا گیا ہے وہاں قرآن کریم کی آیات بینات کو بھی اپنی تحریفات کا تختہ مشق بنانے سے در گزر نہیں کیا حضرت مفتی صاحب نے اس رسالہ میں اس گروہ کی تمام تحریفات و تلبیسات کا پردہ چاک فرما کر شکوک و شبہات کا ازالہ فرما دیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کا روئے سخن چونکہ ایک ایسے فرقہ کی طرف تھا جو قرآن کریم کے ماننے کا دعویٰ باطلہ کے اثبات میں قرآنی آیات کو ان میں معنوی تحریف و تبدیل کر کے پیش کر رہا تھا اس لئے مسئلہ زیر بحث کو قرآن

کریم کی آیات سے مدلل کر کے پیش کرنا ضروری تھا، تاکہ مسئلہ کا قطعی اور واضح ثبوت قرآنی آیات سے ہی سامنے آجائے اور منکر کے لئے انکار کے کسی پہلو کی بھی گنجائش باقی نہ رہے اور اس پر اچھی طرح اتمام حجت ہو جائے۔

پھر چونکہ قرآن مجید ذو وجوہ ہے اور اس بلیغ کلام میں بحیثیت زبان و لغت مختلف معانی کا احتمال ممکن ہے۔ اس لئے احتمالات ممکنہ میں سے احتمال صحیح کی تعیین اور اس کی پہچان کے لئے کسی میعار کی ضرورت تھی ورنہ ہر شخص جس معنی کو چاہے گا اختیار کرلے گا صحیح احتمال کی تعیین اور اختلافی بحثوں میں فیصلہ کی کوئی صورت ممکن ہی نہ رہے گی؛ اس لئے ختم نبوت کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات کو پیش کرنے کے ساتھ حضرت مفتی صاحب نے قطعی نزاع کے لئے تفسیر قرآنی کی صحت کا صحیح معیار بھی رقم فرمادیا ہے۔

اس صحیح معیار کے نظرانداز کر دینے کیوجہ سے زمانہ حاضر میں اکثر تفسیر لکھنے والوں نے تفسیر بالرای کرکے دین میں تحریف والحاد کا دروازہ کھول دیا ہے اور چونکہ اکثر اہل قلم اور آزاد مصنفین اس غلط روش پر چل رہے ہیں ،اس لئے افادۂ عام کے لئے صحیح تفسیر کے معیار کا حامل ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، حضرت مفتی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ :

” آج کوئی شخص کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے اس کے لئے نہایت سہل اور اور سلامت کا راستہ یہ ہے کہ وہ سلف صالحین، صحابہ وتابعین کی تفاسیر کو اپنا قدوہ بنا کر ان کو اختیار کردہ تفسیر کو قرآن کی مراد سمجھے اور جو کوئی معنی جمہور صحابہ وتابعین واسلاف امت کے خلاف سمجھ میں آئیں ان کو اپنی غلط فہمی اور قصور علم کا نتیجہ سمجھے۔

صحیح تفسیر کے اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے ننانوے آیات قرآنیہ سے واضح طور پر یہ ثابت فرمادیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد ہر قسم کی نبوت کا اختتام ہو چکا ہے آپ کے بعد تو اب کوئی تشریعی نبی پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی غیر تشریعی ظلی بروزی وغیرہ۔

غرضیکہ حضرت مفتی صاحب نے قرآن مجید کی روشنی میں عقیدہ ختم نبوت کے ہر پہلو پر بڑی جامعیت اور تفصیل کے ساتھ قادیانی فرقہ کے دجل و تلبیسات اور اس کی تحریفات و تشکیکات کا ازالہ فرما کر منکرین ختم نبوت پر خدا تعالیٰ کی حجت پوری فرما دیں۔ اب بھی اگر کوئی شخص نبوت پر ایمان نہ لائے تو اس کی قسمت "[28]۔

۹۔ ہدیۃ المہدیین فی آیات خاتم النبیین ﷺ:

مولانا عبد الشکور ترمذی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حضرت مفتی صاحب کی یہ تالیف بھی عربی زبان میں اسی عقیدہ ختم نبوت کے سلسلہ کی تفسیری خدمت ہے، عرب ممالک کے ناواقف مسلمانوں میں اس طائفۂ زائغہ اور شرذمۂ قلیلہ کے دجل و تلبیسات کی وجہ سے عقیدہ ختم نبوت میں شکوک و شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس رسالہ سے ان کا ازالہ مقصود ہے۔

یہ رسالہ نہایت جامع اور عرب ممالک کے مسلمانوں کے لئے نہایت نافع ہے۔ عربی دانوں کے شبہات کا ازالہ کے لئے آیت خاتم النبین کی یہ تفسیر عربی زبان میں ارقام فرمائی گئی ہے "[29]۔

۳

فصلِ سوم

علمِ حدیث

فصل سوم: علم حدیث

علم حدیث وہ علم ہے جس کے بارے میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ:

''اس سے میرا اشتغال بہت کم رہا''(30)۔

لیکن یہ ان کی کسر نفسی تھی ورنہ انھوں نے علم حدیث کے حوالے سے جو خدمات سرانجام دیں، ان میں سے تدریسی خدمات کا ذکر اگلے باب میں آئے گا اور تصنیفی خدمات کا ذکر اس فصل میں آرہا ہے۔

"مفتی صاحب کی علم حدیث سے مناسبت اور تعلق کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے علم حدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا جن کو اپنے زمانے کا حافظ ابن حجر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، آپ نے حضرت شاہ صاحب سے دورۂ حدیث بڑے ذوق وشوق اور اہتمام کے ساتھ پڑھا، اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر بخاری اور تقریر ترمذی درس کے دوران ہی عربی زبان میں قلم بند فرمائی، حضرت شاہ صاحب کو بھی حضرت والد صاحب سے بڑی محبت تھی اور درس کے دوران آپ سے خصوصی خطاب فرمایا کرتے تھے(31)۔

۱۔التصریح بما تواتر فی نزول المسیح:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کتاب عقیدہ نزول مسیح سے متعلق احادیث کا جامع ترین ذخیرہ ہے۔اس کتاب کا ابتدائی مواد حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے جمع فرمایا تھا، پھر اس کی تالیف وترتیب حضرت والد صاحب کے سپرد فرمادی۔ چنانچہ جب آپ نے اسے مرتب فرما کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت شاہ صاحب نے بہت دعائیں دیں اور حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''دیکھو بھائی، محنت تو ہم کرتے ہیں، اور ثواب یہ صاحب لے اڑتا ہے''۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ مع تحقیق و تشریح برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم نے کیا ہے جو ''علامات قیامت اور نزول مسیح'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے "(32)۔

۲۔الازدیاد السنی علی الیانع الجنی:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس کتاب کا تعارف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حضرت شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی اسانیدِ کتب حدیث ان کے مؤلفین تک ''الیانع الجنی''میں موجود ہیں۔ حضرت والد صاحب نے اس رسالے میں تمام اکابر علمائے دیوبند کی اسانید حدیث حضرت شاہ عبد الغنی صاحب قدس سرہ تک جمع فرمائی ہیں۔اس طرح یہ کتاب تمام بزرگان دیوبند کا "ثبت" ہے جس میں ان حضرات کے مختصر حالات بھی موجود ہیں "(33)۔

۳۔ختم النبوۃ فی الحدیث:

مولانا عبد الشکور ترمذی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ کتاب ختم نبوت پر دلالت کرنے والی احادیث کا جامع ترین ذخیرہ ہے، اور اب ''ختم نبوت کامل'' کا ایک جزء ہے "(34)۔

۴۔جوامع الکلم:

مولانا عبد الشکور ترمذی صاحب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ رسالہ در حقیقت اخلاق و آداب سے متعلق ایک چہل حدیث ہے اور ''سیرت خاتم الانبیا'' کے آخر میں شائع ہو گیا ہے ''(35)۔

۵۔ آداب النبی ﷺ:

مولانا عبد الشکور ترمذی صاحب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس رسالہ میں آنحضرت ﷺ کے شمائل واخلاق جمع فرمائے گئے ہیں''[36]۔

۶۔ المامول المقبول فی ظل الرسول:

مولانا عبد الشکور ترمذی تحریر فرماتے ہیں:

''یہ رسالہ ''سایۂ رسول'' کے نام سے طبع ہوا ہے اور اس میں خصائص کبریٰ کی اس روایت کی مکمل تحقیق ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کا سایہ نہیں پڑتا تھا''[37]۔

۷۔ چہل حدیث (در حرمتِ سود):

مولانا عبد الشکور ترمذی صاحب اس کتاب کے تعارف کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ چہل حدیث'' مسئلہ سود'' میں شائع ہوئی ہے''[38]۔

۸۔ چہل حدیث (در حرمتِ غناء):

مولانا عبد الشکور ترمذی صاحب لکھتے ہیں:

"یہ چہل حدیث'' احکام القرآن'' میں شامل ہے"[39]۔

۹۔ چہل حدیث (در معاشی مسائل):

مولانا عبد الشکور ترمذی صاحب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ چہل حدیث غیر مطبوع ہے"[40]۔

٤

فصلِ چہارم

فقہی تصانیف

فصل چہارم: فقہی تصانیف

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی تصانیف میں معیار تحقیق:

آپ کے فقہی رسائل میں تحقیقی معیار کے حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''یوں تو آپ کے فتاویٰ کے مجموعے'' فتاویٰ دار العلوم دیو بند''ہیں،اور خاص طور پر مذکورہ بالا فقہی رسائل ہیں۔ہر ایک میں اہل علم کے لئے ساری باتیں کارآمد ہی ہیں، لیکن آپ کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن سے جب کبھی استفادے کی نوبت آتی ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے کوئی اسلوب کافی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کی تحقیق حضرت والد صاحب قدس سرہ کے ذریعے قلمبند اور شائع کرادی، ورنہ اگر آپ وہ کام کر کے نہ جاتے تو بظاہر آج کسی کے بس میں نہ تھا کہ ان مسائل پر تحقیق کا وہ حق ادا کرتا،اور اس اطمینان بخش طریقے پر ان مسائل کا حل تلاش کرتا۔اور جب میں یہ تصور کرتا ہوں کہ ان مسائل کی تحقیق میں حضرت والد صاحب نے کتنی اولو العزمی اور استقامت کے ساتھ کتنی محنت شاقہ برداشت کی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے''(41)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت اور فتویٰ نویسی:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی میں کن اساتذہ کرام سے تربیت حاصل کی اور آپ کو اس فن میں امامت کا درجہ پانے میں کیا کیا اسباب کارفرما ہوئے،اس حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''حضرت مفتی صاحب نور اللہ مر قدہ، فطرتاً فقیہ النفس تھے۔اس پر حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب قدس سرہ اور مجدد الملت حضرت تھانوی اعلی اللہ مقامہ جیسے نادر روزگار اور فقید المثال فقہاء اور صاحب فتویٰ بزرگوں کی صحبت و تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔

اس وجہ سے دیگر جملہ علومِ متداولہ پر عبور اور تبحر رکھنے کے باوجود آپ کے اصل جواہر اور کمالات فقہ وفتاویٰ کی صدر نشینی میں کھلے اور ان کے نام کا سابقہ لقب ہی تقدیر الٰہیٰ اور زبان خلق نے ''مفتی اعظم'' بنادیا جو اس،فقیہ کبیر وجلیل کے لیے عین حقیقت تھا۔فقاہت دینی کے لیے جس وسعت علم (کتب فقہ) کے جزئیات تک پر گہری نگاہ، دقت نظر کی سلامتی، ذہن،اصابت رائے،احتیاط بیدار مغزی،اساتذہ فن کی صحبت وتربیت، تقویٰ وطہارت ،اخلاص و بے نفسی،عدل وانصاف ،راست گوئی وحق کوشی غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت،مسئلہ کے مالہ وماعلیہ سے واقفیت ،ضروریات زمانہ اور احوال متعلقہ سے باخبری کی ضرورت ہے وہ حضرت نور اللہ مرقدہ، میں بدرجہ اتم موجود تھیں ''فتوی نویسی'' کہنے کو ایک فن ہے۔ لیکن یہ فتویٰ نویسی بغیر فقاہت کے ممکن نہیں اور فقاہت میں مہارت جملہ علوم پر گہری نگاہ اور تمام علومِ دینیہ پر عبور کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ میں ''فقاہت'' اور فتویٰ نویسی کی صلاحیتیں کماحقہ موجود تھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف سے فقہ اور فتاویٰ کی جو محیر العقول خدمت لی اس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ دیوبندی مدرسہ ، فکر وفتاویٰ کا جو عظیم الشان ذخیرہ منصۂ شہود پر آیا۔اس کے دو بڑے جلیل القدر فتویٰ نگاروں یعنی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس روحہ اور مولانا عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی تبویب و ترتیب نَو اور تدوین جدید حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ ہوئی''[42]۔

ا۔ فتاوی و فقہی رسائل:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ایک جید مفتی تھے بلکہ معاصر علماء نے انھیں مفتی اعظم پاکستان کا لقب بھی دیا تھا، اس لئے آپ کی تصانیف کا بہاؤ فقہ اور فتاوی کی طرف نسبتاً زیادہ ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوی کے متعلق مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''یوں تو حضرت والد صاحب کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے جن میں ہر طرح کے سوالات کے جواب موجود ہیں، لیکن خاص طور سے عہد حاضر کے نئے فقہی مسائل پر آپ نے جو مفصل فتاویٰ یا رسائل تحریر فرمائے ان کی فہرست سے اندازہ ہو گا کہ اس پہلو سے حضرت والد صاحب کا کام کتنا وسیع، ہمہ گیر، ٹھوس اور مثبت ہے، ایمان اور طہارت سے لے کر میراث تک تقریباً ہر باب میں نئے مسائل پر آپ کے مفصل رسائل یا فتاویٰ موجود ہیں۔ احقر کے شمار کے مطابق ان کی تعداد اکیانوے ہے۔

یہ وہ فقہی رسائل ہیں جو ''فتاویٰ دار العلوم''، ''جواہر الفقہ''، ''آلات جدیدہ'' یا ''احکام القرآن'' میں علیحدہ کتابی شکل ہو چکے ہیں اور جو بہت سے رسائل دار العلوم دیوبند کے فتاویٰ کے رجسٹروں میں رہ گئے اور نقل یا شائع نہ ہو سکے، وہ ان کے علاوہ ہیں۔

ان میں سے بعض رسائل صرف چند صفحات کے بھی ہیں اور بعض سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔

اس اجمالی فہرست ہی پر اگر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس سرہ سے خاص طور پر فقہ و فتویٰ کے باب میں اس دور کا کتنا عظیم الشان کام لیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے بعد اتنی متنوع اور کثیر فقہی تصانیف میں کوئی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ ان رسائل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام سے زیادہ اہل علم کی رہنمائی کرتی ہیں، اور ان کا فائدہ صرف اتنا ہی

نہیں ہے کہ جس موضوع پر وہ لکھے ہیں اس میں شریعت کا حکم اپنے دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے، بلکہ ان کے مطالعے سے نت نئے مسائل کا جواب تلاش کرنے کے لئے مستقل اصول استدلال واستنباط معلوم ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اس دور کے مفتی کے لئے بہترین راہ عمل سامنے آجاتی ہے"[43]۔

آپ کے خود نوشتہ فتاویٰ کی تعداد:

یوں تو آپ نے فتوی نویسی دار العلوم دیوبند ہی میں شروع کر دی تھی، مگر آپ کے بعض فتاوی کا ریکارڈ موجود ہے اور بعض کا موجود نہیں، آپ کے فتاوی کی حتمی تعداد بتانا تو مشکل ہے، البتہ تخمینی طور پر ایک محتاط تعداد اور ان کی طباعت کے حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''دوسری طرف فتاویٰ کا ایک عظیم ذخیرہ جو دو لاکھ فتوؤں سے متجاوز ہے حضرت کے قلم کا رہین منت ہے۔اس میں بعض فقہی مسائل مستقل کتابچوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔جس کا مجموعہ "جواہر الفقہ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو گیا ہے۔''حوادثات ونوازل'' مسائل پر جس اصابت رائے علمی، دیانت فقہی، دقیقہ رسی، حالات حاضرہ سے باخبری، طریق سلف اور بزرگوں کی روش کی پیروی کا نمونہ پیش کیا ہے اور نصوص دینی اور شرعی تقاضوں کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے وقتی مصلحتوں پر ترجیح دی ہے وہ سلف کی یاد تازہ کرتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ کے جن فتاویٰ کو تبویب وترتیب جدید کے ساتھ شائع فرمایا ہے وہ امداد الفتاویٰ کے نام سے تین ہزار چار سو پینتالیس (۳۴۴۵) صفحات پر مشتمل چھ (۶) ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

فتاویٰ دیوبند کی دو آخری جلدیں ''امداد المفتیین''حضرت مفتی صاحب کے ان فتاویٰ کے ایک حصے پر مشتمل ہیں جو انہوں نے ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تیرہ سال میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کی حیثیت سے دیے (کل فتاویٰ تقریباً چالیس ہزار تھے) یہ فتاویٰ آٹھ سو پچیس (۸۲۵) صفحات پر مشتمل ہیں"[44]۔

نیز مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''آپ کے فتاویٰ کی جو چار جلدیں شائع ہوئی ہیں وہ بارہ سال (جبکہ آپ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند تھے) کے مجموعی فتاویٰ کا پندرواں حصہ بھی نہیں اگر وہ سب فتاویٰ شائع کیے جائیں جو آپ نے اس تیرہ سالہ دور میں تحریر فرمائے ہیں پھر اس کے بعد ۱۳۶۲ھ میں جب آپ دارالعلوم دیوبند سے مستعفیٰ ہو گئے۔ تو عوام وخواص کے بکثرت رجوع کے باعث حضرت تھانوی کی ہدایت کی بناء پر افتاء کا سلسلہ اب بھی برابر جاری رہا تحریری بھی زبانی بھی۔

افسوس ہے کہ ۱۳۶۲ھ ۱۳۷۱ تک (نوسال کے عرصہ میں) جو فتاویٰ جاری کیے گئے ان کی نقل رجسٹروں میں باقاعدہ محفوظ نہ کی جاسکی نہ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک آٹھ سال کی مدت میں دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے (حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے قلم سے) ستر ہزار نو سو بارہ فتوے جاری ہوئے ان کے علاوہ مجلسی فیصلوں اور زبانی فتووں کی تعداد بے شمار ہے۔

اس سے پہلے نو سال اور بعد کے سترہ سال کے فتاویٰ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وصال سے چند گھنٹے پیشتر تک یہ عالی خدمت جاری تھی"[45]۔

۳۔ جواہر الفقہ:

مولانا اشرف خان صاحب اس کتاب کے تعارف کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

"دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اسم با مسمیٰ ہے اس میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چوالیس نادر فقہی رسائل کو جمع کر دیا گیا ہے جو وقت کے اہم مسائل کے بارے میں عجیب و غریب محققانہ فقہی مباحث اور ان کے دینی احکام پر مشتمل ہے۔

یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب کی فقہی بصیرت و دقیق رسی، علمی عمق اور وسعت فنی و وقوف و سمجھ پر دلیل قاطع و شاہدِ ساطع ہے، ہر رسالہ میں مسئلہ کو دلائلِ قویہ سے منقح و مدلل فرما کر اس کے شرعی حکم کو انتہائی وضوح کیساتھ بیان فرمایا شواہد اتنے واضح اور زبان اتنی شگفتہ ہے کہ قاری کے سامنے سے شک وریب اور اشکالات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور مسئلہ اپنی حقیقت کیساتھ اپنے اصل حکم میں جلوہ گر ہو کر تسلی و تشفی کر دیتا ہے۔

طوالت کا اندیشہ ہے ورنہ ایک ایک موضوع پر تفصیلی بات کر کے اس کے مزایا کو بتایا جاتا، عنوانات اور مختصر تعارف پر اکتفا کرتا ہوں قارئین عنوانات کے تنوع اور بوقلمونی ہی سے مجموعہ کی اہمیت اور وسعت و رنگارنگی اور مصنف کی جامعیت و علم و فن پر عبور کا اندازہ کر لیں گے"(46)۔

یوں تو "جواہر الفقہ" تقریباً ایک سو پانچ (۱۰۵) رسائل پر مشتمل ہے، جن کا تعارف کرانا طوالت سے خالی نہیں، البتہ ذیل میں "جواہر الفقہ" کے اہم رسائل کے نام اور ان کا مختصر تعارف درج کیا جاتا ہے:

ا۔ وصول الاکفار فی اصول الاکفاء یعنی تکفیر کے اصول:

مولانا اشرف خان اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اس رسالہ میں افراط و تفریط سے بچ کر کفر واسلام کا معیار بتایا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کیا کسی مسلمان کہلائے جانے والے شخص کو مرتد یا خارج از اسلام کہا جا سکتا ہے؟ اور وہ کونسی گمراہیاں ہیں جو انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہیں۔ مزید برآں اس ضمن میں چکڑالوی، مرزائی اور آغاخانی فرقوں کی صحیح دینی حیثیت بتائی گئی ہے۔ فقیر کے نزدیک امام العصر حضرت الشیخ علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی اکفار الملحدین کے بعد اپنے موضوع پر دور حاضر کا انتہائی جامع مانع اور نافع بصیرت افزاء رسالہ ہے جسے قدیم کے علاوہ جدید طبقہ کے ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیے جو کفر واسلام کی حدود اور تکفیر کا مسئلہ سمجھنا چاہتا ہے''(47)۔

۲۔ تحذیر الانام عن تغیر رسم الخط من مصحف الامام:

مولانا اشرف خان اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی قرآن کا رسم الخط اور اس کے احکام اس رسالہ میں مصحف عثمانی کے اتباع کے متعلق تمام ضروری احکام جمع کر دیے گئے ہیں مزید برآں موجودہ دور میں مغربیت کے زیر اثر یا مقامی بولیوں کی وجہ سے جو بائیں طرف سے لکھی جاتی ہیں ان سوالات کے جوابات بھی آ گئے ہیں۔ کیا متن عربی جو مصحف عثمانی کے مطابق ہے اسے اور کسی زبان کے رسم الخط میں چاہے وہ ٹامل ہو یا ہندی رومن ہو، یا کوئی اور لکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا ایک صفحہ یا ایک کالم پر عربی متن قرآن کریم اور بالمقابل ترجمہ لکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ان امور میں یہ رسالہ موجودہ دور کی جہت سے اشکالات کا شافی جواب ہے''(48)۔

۳۔ صیانۃ القرآن عن تغییر الرسم واللسان:

مولانا اشرف خان اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"کیا قرآن مجید کا صرف ترجمہ شائع کیا جاسکتا ہے؟ اس کے بارے میں جو غیروں کی تقلید سے بعض مسلمانوں کے ذہن و عمل میں آنے لگا ہے ائمہ اربعہ کے مذاہب کی روشنی میں وافی کلام کیا گیا ہے۔ رسالہ اپنے موضوع پر قابل دید ہے آخر میں "تنبیہ" کے عنوان سے مضمون کا عطر و مغز پیش کر دیا ہے اور متجددین کے لیے سرمۂ بنیش اور آیت عبرت ہے"[49]۔

۴۔ مسئلہ تقلید شخصی:

مولانا اشرف خان اس کے تعارف میں تحریر فرماتے ہیں:

"گزشتہ سوڈیڑھ سو سال سے یہ مسئلہ مقلدین اور غیر مقلدین میں معرکتہ الآرا نوعیت اختیار کئے ہوئے ہے، سلف سے اس کے بارے میں مستقل رسائل لکھے جانے کا اہتمام رہا ہے۔ اپنے استاذ حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے تقلید کے بارے میں چند پیش کردہ سوالات کا جواب حضرت مفتی صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں دیا تھا۔ طالب علمی کی یہ تحریر حضرت مفتی صاحب کی "استاذی" اور "پختہ کاری" کی دلیل یا ہدایت "نہایت" کی طرف مشیر ہونے کا واضح ثبوت ہے چند بعد کی تحریریں اور حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ، کا ایک خط اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے چند افاداتِ علمیہ بھی شامل کر دیے گئے ہیں رسالہ بڑا دلچسپ اور بصیرت افزا اور تقلید کی اہمیت پر برہان ساطع ہے"[50]۔

۵۔ اتمام الخیر فی الافتاء بمذہب الغیر:

مولانا اشرف خان اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے حدود اصل میں اہل علم اور اہل فتویٰ کی رہنمائی کے لیے اس موضوع پر عربی میں ایک یادداشت ہے جس کے آخر میں مراجع کے حوالے دیے گئے ہیں کہ اگر کوئی متدین اور راسخ العلم

اس نہایت نازک اور اہم موضوع پر لکھنا چاہے تو حدود و قیود کی رعایت کے ساتھ وہ اس مسئلہ کی شرائط کو واضح کر سکے۔ اہل علم کے یہ یادداشت بہت کار آمد ہے۔ کاش اہل علم میں سے کوئی شخص اس کام کو سنبھالے اور آگے بڑھائے اور بانی اول کے لیے صدقۂ جاریہ کے ثواب کے ساتھ "نوازل و حوادث" کے اس دور میں امت کی صحیح رہنمائی کرے۔

6-فتوی جماعت اسلامی

جناب مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کا آخری فتویٰ ہے، مودودی صاحب کے عقائد اور کتب پر پچھلے چالیس سال سے مختلف علمائے محققین نے لکھا ہے۔ مودودی صاحب نے انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اور سلف صالحین کو جس طرح اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ ہر درد مند مسلمان کا سینہ چھلنی کرنے کے لیے کافی ہے، ہمارے حضرت الاستاذ علامہ محمد یوسف البنوری نور اللہ مرقدہ کے آخری عمر کے رسائل "الاستاذ المودودی" اس بارے میں حرف آخر ہیں(51)۔

۷۔ پیرو مرشد کا فقہی اختلاف:

مولانا اشرف خان اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ایک خط ہے اور اس کا دیباچہ ہے جس میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ، اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مسئلہ کے بارے میں ایک دوسرے کی رائے سے علمی وجوہ کی بناء پر شرح صدر نہ ہونے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نفسی اور حضرت مفتی صاحب کا شیخ کے آداب کی رعایت کے ساتھ مسئلہ میں اختلاف کا تذکرہ ہے جو آج کل کے زائغین اور ناقدین کے لیے سرمۂ بصیرت ہے۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب واحترام کی جملہ حدود و قیود کو باقی رکھتے ہوئے بھی اہل علم کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے''(52)۔

۸۔تعدیل الحادی فی تقبیل الایادی(دست بوسی اور قدم بوسی کے احکام):

حضرت نے یہ رسالہ ۱۳۲۴ھ میں تحریر فرمایا، مولانا اشرف خان لکھتے ہیں:

''اس رسالہ میں پہلے حضرت شیخ محمد عابد سندھی کے اس عنوان پر ایک مقالہ کی تلخیص کی گئی ہے پھر نصوص اور اقوال فقہاء سے اس بارے میں اقتباسات جمع فرما کر بے نظیر تحقیق کی گئی ہے رسالہ کا سبب کتابت بھی عجیب ہے۔اور یہ رسالہ بھی عجیب و غریب اور زیر بحث مسئلہ میں قولِ آخر واحوط بھی ہے''(53)۔

۹۔مروجہ سیرت کمیٹی اور اس کی شرعی حیثیت:

مولانا اشرف خان اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''موجودہ دور میں عید میلاد النبی ﷺ اور ''سیرت'' کے نام پر بدعات کا جو شیوع ہو رہا ہے،اس بارہ میں قابل دیدہ رسالہ ہے''(54)۔

۱۰۔مروجہ صلوٰۃ وسلام کی شرعی حیثیت:

"یہ ایک استفتاء کا جواب ہے جس میں بعض طبقات کے گھڑے ہوئے درود وسلام کے طریقوں کی نکیر اور اس بارے میں صحیح عقیدہ اور طریقہ بتایا گیا ہے بڑا مفید رسالہ ہے"(55)۔

۱۱۔ مساجد کی نئ شکلیں اوران کے مفاسد:

"اس رسالہ میں ایک استفتاء کا جواب ہے جس میں مساجد کی اسلامی ہیئت کے باقی رکھنے اور یہود ونصاری کے معابدہ اور دیگر ایسی ہیئتوں سے روکا گیا ہے، جو مفاسد پیدا کرنے والی ہوں "[56]۔

۱۲۔ تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال (سمت قبلہ):

"سمت قبلہ کی شرعی حیثیت اور سمت معلوم کرنے کے طریقے کے بارے میں ایک معرکتہ الآرا مقالہ ہے، جن کے ساتھ بعض دیگر حضرات کی تحریریں بھی شامل ہیں، مشرقی صاحب کے قبلہ کے بارے میں مغالطوں پر بھی خوب رد آگیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی ریاضی وہیئت دانی کا بھی بہترین نمونہ ہے، یہ رسالہ ضمیموں کے ساتھ اَسی (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے" [57]۔

۱۳۔ رفع الملامۃ عن القیام عند اول القیامۃ:

"اقامت کے بعد مقتدی کب کھڑے ہوں، اقامت نماز کے وقت امام اور مقتدی شروع اقامت کے وقت کھڑے ہوں یا بعد میں، مؤذن کے کس کلمہ پر کھڑے ہوں، یہ ایک فرعی مسئلہ ہے، دونوں طریقے شرعاً جائز ہیں، صرف افضل اور اولیٰ ہونے میں اختلاف ہے۔

بعض حلقوں نے اس مسئلہ کو بھی نزاعی بنالیا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ادلۂ حدیث وفقہ سے اس کا محققانہ ومنصفانہ فقہی فیصلہ لکھا ہے جو ہر طبقہ کے دیکھنے اور عمل کرنے کے لائق ہے "[58]۔

۱۴۔رفع التضاد عن احکام الضاد:

حرف ضاد کا صحیح مخرج اور اس کے احکام، حرف الضاد کا صحیح مخرج کیا ہے؟ ظاء کے مشابہ ہے یا ''دال'' کے۔اہل عجم کے لیے چونکہ اس کا تلفظ خاصا مشکل ہے اس لیے یہ مسئلہ صدیوں سے بحث کا موضوع بنا رہا کہ کیا اہل عجم اگر صحیح تلفظ نہ کر سکیں تو اس کا کیا حکم ہے اور کیا صحیح مخرج کے ادا نہ کرنے سے نماز ہو گی یا نہیں؟

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے علامہ آلوسی کا ''روح المعانی'' سے ایک فتویٰ نقل کرنے کے بعد اپنے معلوم تفقہ سے اس پر سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے اور آخر میں نقل کر دیا ہے، چونکہ ہر نماز میں ضاد کا تلفظ ہوتا ہے اور اس کی ضرورت شدیدہ ہے اس لیے نقل کئے دیتا ہوں تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ فتویٰ: الغرض صرف ضاد اپنے مخرج وصفات کے اعتبار سے ظاء خالص اور دال پر دونوں سے بالکل جدا اور ایک مستقل حرف ہے، اس کو جس طرح دال سے بدل کر (عوام کی طرح) پڑھنا غلطی ہے اسی طرح ظاءِ خالص سے بدل کر (بعض قرآءِ زمانہ کی طرح) پڑھنا بھی غلطی صریح ہے لیکن فساد نماز کے بارے میں فتوی اس پر ہے کہ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے باوجود قادر بالفعل ہونے کے ایسا تغیر کرے کہ ضاد کی جگہ دال یا ظاء خالص پڑھے تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگرچہ بوجہ ناواقفیت اور تمیز ایسا سرزد عمل ہو جائے اور وہ اپنے نزدیک یہی سمجھے کہ میں نے حرف ضاد پڑھا تو نماز صحیح ہو جائے گی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ عوام کی نماز تو بلا کسی تفصیل و تنقیح کے بہر حال صحیح ہو جاتی ہے خواہ ظاء پڑھیں یا دال، یا زاء وغیرہ۔ کیونکہ وہ قادر بھی نہیں اور سمجھتے بھی یہی ہیں کہ ہم نے اصل حرف ادا کیا ہے۔

قرآء اور مجودین اور علماء کی نماز کے جواز میں یہ تفصیل مذکور ہے کہ اگر غلطی قصداً یا بے پروائی سے ہو تو نماز فاسد ہے اور سبقت لسانی یا عدم تمیز کی وجہ سے ہو تو جائز و صحیح ہے۔

(تنبیہ) لیکن نماز کے جواز و عدم فساد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بے فکر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتے رہنا جائز ہو گیا اور پڑھنے والا گناہ گار بھی نہ رہے گا، بلکہ اپنے قدرت و گنجائش کے موافق صحیح حروف پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے ورنہ گناہ گار ہو گا، اگرچہ نماز فاسد نہ ہو"[59]۔

یہ رسالہ دیگر علماء کے فتاویٰ کے ساتھ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے[60]۔

۱۵۔الاجوبہ فی عربیۃ خطبۃ العربیۃ (صفحات ۲۲):

"خطبہ عربی زبان میں کیوں ہے؟ جدید طبقے کے دماغ کی ایک سوچ یہ بھی ہے کہ خطبہ جمعہ ملکی زبان میں ہونا چاہیے اس رسالہ میں اس کا کافی و شافی جواب ہے، رسالہ کی اہمیت کے لیے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ، کی تقریظی الفاظ کافی ہیں:

''بعد الحمد والصلاۃ: میں نے یہ رسالہ مؤلفہ جامع کمالات علمیہ مولانا محمد شفیع صاحب مدرس و مفتی مدرسہ دار العلوم دیو بند دام فیضہ، نہایت شوق و رغبت سے دیکھا بے حد پسند کیا، بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر بے نظیر ہے اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور شبہات کا دافع فرمادے''[61]۔

۱۶۔قنوت نازلہ، دعاء کا طریقہ اور متعلقہ مسائل:

یہ رسالہ احکام قنوت نازلہ اور اس سے متعلقہ مسائل پر مشتمل ہے[62]۔

۱۷۔احکام رمضان المبارک و مسائل زکوۃ:

یہ مختصر رسالہ دس صفحات پر مشتمل ہے اور عامۃ الناس کے فائدہ کے لیے لکھا گیا ہے[63]۔

۱۸۔ حکم الاسقاط فی حیلتہ الاسقاط (سات صفحات):

"میت کے فوت شدہ نماز، روزہ حج زکوٰۃ اور دوسرے واجبات کی ادائیگی یا کفارہ کس طرح ادا کیا جاسکتا ہے جس سے وہ گناہ سے سبکدوش ہو جائے اس سلسلہ میں بعض علاقوں میں مروجہ حیلہ اسقاط کا مدلل شرعی رد کیا گیا ہے اور فدیہ نماز و روزہ وغیرہ کے صحیح مسائل واحکام درج کیے گئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے دیہی علاقوں میں اس رسالہ کی اشاعت کی بہت ضرورت ہے"[64]۔

۱۹۔ رویت ہلال کے شرعی احکام (۸/صفحات):

"یہ مختصر رسالہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، علامہ محمد یوسف بنوری رحمہا اللہ تعالیٰ اور مفتی صاحب کے اشتراک سے امت کو اس مسئلہ کے بارے میں انتشار سے بچانے کے لیے لکھا گیا حکومت اور عامۃ الناس ان سب کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہے"[65]۔

۲۰۔ أرجح الاقاویل فی أصح الموازین والمکائیل (اوزان شرعیہ):

"۳۸ صفحات کا یہ مقالہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی کاوش، تحقیق و فقاہت کا ایک عظیم واہم اور قابل فخر شاہ پارہ ہے جس کی داد اساطین علم نے دی ہے۔ اس مقالہ میں درہم، دینار، صاع، مد، ذراع، میل وغیرہ کی مکمل تحقیق، مروجہ اوزان و پیمانوں کے مطابق ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے ہمارے جدید ریاضی دان کاش ہمارے ان بوریا نشین فضلاء کی ان محنتوں کو جانتے اور قدر کرتے"[66]۔

۲۱۔احکام عید الاضحیٰ و قربانی:

"یہ مختصر رسالہ ہے جو عوام الناس کے فائدے کے لیے عشرہ ذی الحجہ کے فضائل، تکبیر تشریق، نماز عید قربانی کے وجوب، واحکام وغیرہ پر لکھا گیا ہے"(67)۔

۲۲۔رفع التلاحی فی جلود الاضاحی:

چرم قربانی کے احکام اور بعض بریلوی علماء کے اس فتویٰ کے جواب میں ہے کہ چرم قربانی فروخت کر دینے کے بعد بھی اغنیاء کو دینا جائز ہے، آپ نے دلائل قویہ سے ثابت کیا ہے کہ چرم قربانی فروخت کرنے سے پہلے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور اغنیاء کو ہدیہ بھی دے سکتا ہے اور فقراء و مساکین پر صدقہ بھی کر سکتا ہے۔

لیکن اگر روپیہ پیسوں کے عوض فروخت کر دیا تو خواہ کسی نیت سے فروخت کیا ہو اس کو صدقہ کر دینا واجب ہوتا ہے اور اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں اغنیاء کو دینا یا ملازمین و مدرسین کی تنخواہوں میں دینا جائز نہیں"(68)۔

۲۳۔الیواقیت فی احکام المواقیت:

یعنی مواقیت احرام اور ان کے مسائل (صفحات ۳۸) اس رسالہ میں مواقیت کے بارے میں علمی و فقہی دلائل کے ساتھ حدود و حرم میں داخل ہونے والوں کے لیے احرام باندھنے کے مقام کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مشرق (ہند و پاک) سے ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہی احرام باندھ لینا چاہیے۔ بحری جہاز والے اگر یلملم کے محاذات سے باندھ لیں تو بہتر ہے حضرت الاستاذ علامہ بنوری نور اللہ مرقدہ کی بھی یہی رائے ہے

اور حضرت مفتی صاحب کے نزدیک بھی احتیاط اسی میں ہے تفصیلات رسالہ میں دیکھی جاسکتی ہیں رسالہ اپنے موضوع پر خوب ہے[69]۔

۲۴۔ منہج الخیر فی الحج عن الغیر (حج بدل اوراس کے احکام):

"یہ چوبیس (۲۴) صفحات کا رسالہ ہے، اس رسالہ کا اصل موضوع یہ ہے کہ حج بدل کرنے والا قران یا تمتع کرسکتا ہے یا نہیں ؟ اس کے ذیل میں دوسرے مسائل بھی جمع کردیے گئے ہیں۔ حاصلِ فتویٰ یہ ہے جہاں تک ممکن ہو حج بدل میں اِفراد اور قرآن کیا جائے، بعض مجبوریوں میں تمتع کی بھی گنجائش ہوسکتی ہے"[70]۔

۲۵۔ عائلی قوانین پر تبصرہ (صفحات ۴۸):

"یہ رسالہ صدر ایوب مرحوم کے دورِ اقتدار میں نافذ ہونے والے ان غیر شرعی عائلی قوانین پر دینی اور فقہی لحاظ سے ہمدردانہ گرفت ہے جس میں یتیم پوتے کی میراث، تعدد ازواج، طلاق، صغر سنی کا نکاح، نکاح کا رجسٹریشن وغیرہ پر بڑی علمی فقہی اور عقلی بحثیں اگئی ہیں اوران رسوائے زمانہ قوانین کی شناعت واضح ہوگئی ہے اور پھر متبادل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

کاش اہل حکومت علمائے ربانین کی انہی مخلصانہ سفارشات کو مان کر امت کو غیر دینی قوانین کے ظلم سے بچاتی۔ رسالہ ہر قانون دان اور موضوع سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے پڑھنے کے لائق ہے[71]۔

۲۶۔ نابالغہ کے نکاح میں سوءِ اختیار (صفحات ۱۸):

یہ فتویٰ اس مسئلہ کے بارے میں ہے کہ اگر باپ نے بچی کے مصالح کا خیال رکھے بغیر نکاح کردیا ہو تو اس کے فسخ کی کیا صورت ہے"[72]۔

۲۷۔ نهايات الارب فی غايات النسب، اسلام اور نسبی امتیازات (صفحات ۲۶):

یہ نسبی احکام کے بارے میں ایک اہم رسالہ ہے جس میں تین عنوانات پر علمی اور دینی بحث کی گئی ہے:

(۱) نسباً مساوات اسلام کی حقیقت اور انساب اور پیشوں میں تفاضل۔

(۲) نسب پر تفاخر۔

(۳) دوسرے انساب کی طرف جھوٹی نسبت کرنا۔

"یہ رسالہ اس موضوع پر عجیب معلومات کا ذخیرہ ہے بعض کوتاہ فہموں نے رسالہ کی بعض عبارات کو نہ سمجھ کر شکایت کی تھی۔ اس کا جواب صرف حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے "رفع الغلط لدفع الشطط" کے نام سے لکھا، وہ رسالہ کے ضمیمہ کے طور پر ملحق کر دیا گیا"[73]۔

۲۸۔ حکم الازدواج مع اختلاف دِین الاَزدواج، (مختلف المذہب زوجین کے احکام، صفحات ۲۱):

"یہ مقالہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "الحیلۃ الناجزہ" کا ضمیمہ ہے جو ان کے ارشاد پر لکھا گیا ہے زوجین اگر مختلف المذاہب ہوں یا ان میں کوئی مرتد ہو جائے۔ ان کی مختلف صورتوں کے احکام بتائے گئے ہیں"[74]۔

۲۹۔ اِعلام السوٴول عن اَعلام الرسول، علم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحقیق:

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھنڈے کے بارے میں بعض عصری سوالات کا جواب اور جھنڈے کی تحقیق ہے"[75]۔

۳۰۔ طریق السداد فی عقوبۃ الارتداد (مرتد کی سزا اسلام میں):

"اس محققانہ رسالہ میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قادیانیوں کے اس غلط دعویٰ کی تردید کی ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے"(76)۔

۳۱۔ شریعت اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملات (صفحات ۱۵):

"اس رسالہ میں متحدہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کی شرعی نوعیت اور حدود و قیود بتائے گئے ہیں۔ رسالہ بہت نافع و جامع ہے"(77)۔

۳۲۔ وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین (ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی حدود شرعیہ):

"یہ رسالہ تحریک پاکستان کے زمانہ میں لکھا گیا لیکن غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات کے موضوع پر یہ رسالہ جن فقہی مباحث پر مشتمل ہے اور جس تحقیق سے لکھا گیا اس بناء پر دائمی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی عظمت کے علاوہ ان کی سیاسی بصیرت کا بین ثبوت ہے"(78)۔

۳۳۔ نور السراج فی احکام العشر والخراج:

"یہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی کتاب ''اسلام کا نظام اراضی'' کا چھٹا باب ہے لیکن عشر و خراج کی حقیقت و مسائل کے بارے مستقل حیثیت رکھتا ہے اپنی نوعیت میں خاص چیز ہے۔ اور اس عنوان پر اسلامی اقتصادیات سے دلچسپی رکھنے والے کے مطالعہ کے قابل ہے"(79)۔

۳۴۔ انتخابات میں ووٹ، ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت (صفحات ۷):

"اپنے موضوع پر جامع ومانع اور نہایت مفید مباحث اور احکام پر مشتمل قابلِ دید مضمون ہے"[80]۔

۳۵۔ قانونِ اسلامی بابتِ پٹہ دوامی (صفحات ۱۲):

مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ میں دوامی اجارہ کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر فقہاء کی عبارتوں (جو کہ اکثر مضطرب ہیں) کے مطابق کلام و تحقیق کرنے کے بعد اس مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے، موروثی زمینداریوں اور پٹہ دوامی کے بارے میں یہ رسالہ خوب ہے"[81]۔

۳۶۔ زمیندارہ بل (۲۰ صفحات):

غیر منقسم ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی طرف سے زمینوں کی شخصی ملکیت کے خلاف ایک بل پیش ہوا تھا، اس پر تنقید کے لیے یہ مقالہ لکھا گیا اس میں شخصی ملکیت کے بارے میں اسلام کے موقف کو واضح کیا گیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ دیگر علماء کے فتاویٰ بھی ضمیمہ میں شامل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے یہ مختصر الفاظ آج بھی ہر مسلمان کے لیے اشتراکیت کے لیے سرمہ بصیرت ہیں:

"افسوس اس کا ہے کہ مسلمان جن کے ہاتھ میں قرآن مبین کا وہ روشن نظام ہے کہ بلاخوف و تردد کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کا امن چین اور ہر باشندۂ ملک کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی کے ماتحت ہو سکتا ہے وہ مسلمان بھی اس رو میں بہہ رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اشتراکیت کا اصول قرآن شریف اور تعلیمات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھلی بغاوت ہے جب شخصی ملکیت ہی کو جرم کہہ دیا تو پھر زکوۃ حج واقاف جن کا مدار ہی شخصی ملکیت

پر ہے اور جن سے قرآن وحدیث بھرا پڑا ہے ان کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عبادات مالیہ کا سوال ہی پیدا نہیں رہتا۔ اس اصول کی حمایت خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے کھلی بغاوت ہے“[82]۔

۳۷۔ اباحت التقطیف من ثمراۃ الصنعۃ والتالیف (حق تصنیف اور حق ایجاد کی شرعی حیثیت):

"اس مختصر رسالہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اپنی کسی تصنیف، یا ایجاد کو کسی سے رجسٹر کرا کر دوسروں کو اس کی اشاعت یا صنعت سے روکنا جائز نہیں۔ ضمناً سرمایہ دارنہ نظام اور اشراکیت پر بھی مختصر و مفید تنقید آئی ہے، یہ ۱۳۶۴ھ کی تحریر ہے"[83]۔

۳۸۔ احکام القمار (صفحات ۲۰۰):

"موجودہ دور میں معاملات میں طرح طرح کا جوا اور قمار کی صورتیں رواج پا گئی ہے۔ اس رسالہ میں ان کی تشریح و توضیح اور کتاب و سنت و فقہ کے مطابق ان کے شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں، گھوڑ دوڑ وغیرہ کے بارے میں بھی فتویٰ آگیا ہے"[84]۔

۳۹۔ تفصیل الاحکام للارباح الفاسدۃ والمال الحرام (ناجائز معاملات پر تصنیف کا ایک خاکہ):

"حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درد مند دل نے مسلمانوں کے معاملات میں خلاف شرع کوتاہیوں اور اسلامی قانون کے بارے میں غفلت کوشیوں کو دیکھتے ہوئے ایک نہایت مفید کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا جو اعذار کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔ مجوزہ کتاب کے عنوانات بہت اہم ہیں کاش کوئی اہل علم اس خاکہ میں رنگ بھر سکے اور سب سے احق حضرت مفتی صاحب کے لائق صاحبزادے جناب محمد رفیع عثمانی صاحب ہیں"[85]۔

۴۰۔اسلامی ذبیحہ (صفحات ۵۶):

"اسلامی ذبیحہ اور اس کے احکام کے بارے میں ایک نہایت جامع ونافع مقالہ ہے جو موجودہ دور کے اسلامی ذبیحہ کے بارے میں اٹھائے ہوئے سوالات کا شافی جواب ہے"[86]۔

۴۱۔احکام الخطاب فی بعض احکام اللحیٰ والخضاب (داڑھی کے خضاب اور کترانے وغیرہ کے احکام):

"داڑھی کے رکھنے، کترانے،اس کی مقدار اور مختلف رنگ کے خضاب کے بارے میں ایک شافع ونافع رسالہ ہے جو کہ ہر ایک کے دیکھنے کے قابل ہے"[87]۔

۴۲۔تفصیل الکلام فی مسالۃ الاعانۃ علیٰ الحرام (عربی، صفحات ۱۷):

"حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن (جلد خامس وسادس) کے ذیل میں آیت قرآنی ﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ أَنۡعَمۡتَ عَلَيَّ فَلَنۡ أَكُونَ ظَهِيرٗا لِّلۡمُجۡرِمِينَ ١٧﴾ [القصص: ۱۷] کے تحت ظلم ومعصیت کی اعانت اور اس کے اعتبار سے معاملات میں فساد کے بارے میں فقہاء کے تفصیلی احکام اس نام سے جمع کئے تھے۔ بعد میں اس کا خلاصہ ''الاستیانۃ بمعنی التسبب والاعانۃ''، تواحکام القرآن میں شائع ہو گیا۔ لیکن اصل رسالہ شائع نہ ہوا اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے شائع کر دیا گیا ہے"[88]۔

۴۳۔ناجائز کاموں میں تعاون کی شرعی حیثیت۔(صفحات ۶)

"یہ عربی رسالہ "تفصیل الکلام فی مسالۃ الاعانۃ علی الحرام" کا اردو خلاصہ ہے جسے ضرورت کی وجہ سے شائع فرمایا ہے۔ بڑی مفید تحقیقات پر مشتمل ہے"[89]۔

۴۴۔ آداب الاخبار۔ اخبارات و جرائد کی مذہبی ضرورت، اسلامی اخباروں کے لیے شرعی دستور العمل:

"موجودہ دور میں اخبار بینی جس طرح گھر گھر عام ہوگئی ہے اور اس کے مفاسد ہر جگہ پھیل گئے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے اخبارات کی خرابیوں پر ''اخبار بینی'' کے نام ان مفاسد کی نشان دہی فرمائی تھی اور صحیح اخبار نویسی کے اصول وضوابط بتائے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنی عبارت میں ان کو دوبارہ مرتب کیا اور حضرت تھانوی سے نظر ثانی کروائی۔ اور دس زریں اصول بیان فرمائے۔ بڑا مفید رسالہ ہے۔ کاش ہمارے اخبارات ان آداب کی کچھ رعایت کر لیتے"[(90)]۔

۴۵۔ "القول السدید فی تحقیق میراث الحفید" (اِرغام العنید) پوتے کی میراث:

"موجودہ دور کے متجددین نے اسلام کے متفقہ قوانین میراث کے خلاف ورزی کرتے ہوئے نام نہاد ہمدری کے نام پر یتیم پوتے کی میراث کا فتنہ اٹھایا۔ حضرت مفتی صاحب نے ان تمام غلط دعاوی اور مغالطوں کا دینی اور فقہی اور عقلی لحاظ سے مسکت اور شافی جواب لکھا ہے۔ آخر میں دیگر علماء کی تصدیقات شامل کر دی گئی ہیں"[(91)]۔

وہ فقہی رسائل جو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا جزء بن کر شائع ہوئے:

فتاویٰ دار العلوم دیوبند (طبع جدید چار جلدوں پر مشتمل ہے پہلی دو جلدوں کا نام ''عزیز الفتاویٰ'' اور آخری دو جلدوں کا نام ''امداد المفتین'' ہے حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ ذیل رسائل "امداد المفتین" کا جزء بن کر شائع ہوئے ہیں۔

۱۔الافصاح عن تصرفات الجن والارواح:

"یہ امداد المفتین کتاب الایمان والعقائد میں ہے اور اس میں جنات اور ارواح کے تصرفات کے متعلق تحقیق ہے "(92)۔

۲۔روع الناس عن محدثات الاعراس:

"یہ امداد المفتین کتاب الایمان والعقائد میں ہے اور مروجہ عروس مزارات کے شرعی احکام کا بیان ہے"۔ (93)۔

۳۔ماموں القبول فی ظل الرسول:

"رسول اللہ ﷺ کا سایہ پڑتا تھا یا نہیں اس کی تحقیق (امداد المفتین کتاب السیر والمناقب) "(94)۔

۴۔موزوں پر مسح، نیل المآرب فی المسح علیٰ الجوارب:

"جس میں کپڑے کے موزوں پر چمڑہ چڑھا کر مسح کرنے کے متعلق مفصل تحقیق ہے کہ کس صورت میں مسح جائز ہے کس صورت میں جائز نہیں (امداد المفتین۔کتاب الطہارۃ)" (95)۔

۵۔احکام الاعلام بالتکبیر والاعلام:

"جھنڈوں، ترانوں اور نعروں وغیرہ کے ذریعہ لوگوں کو نماز کے لیے اٹھانا، اس کے متعلق حکم۔امداد المفتین۔کتاب الصلوٰۃ)" (96)۔

۶۔تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال:

"اس میں سمت قبلہ سے متعلق علامہ مشرقی کی پیدا کردہ تشکیکات کا واضح جواب بھی ہے اور اس مسئلہ کی مثبت انداز میں مکمل تحقیق بھی۔ فتاویٰ دارالعلوم میں اس کا صرف وہ حصہ درج ہے جو حضرت مفتی صاحب مد ظلہم کا تحریر فرمودہ ہے اور جواہر الفقہ میں اس حصہ کے علاوہ بعض دیگر علماء کے مقالات بھی اسی کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں"(97)۔

۷۔القول القریب فی اجابۃ الاذان بین الخطیب:

"جمعہ کی اذان کا جواب دینا اور بعد کی دعا پڑھنی چاہیئے یا نہیں؟اس مسئلہ کی مفصل تحقیق(امداد المفتین۔باب الجمعۃ والعیدین)" [98]۔

۸۔اماطۃ التشکیک فی اناطۃ الزکاۃ بالتملیک:

"رفاہی کاموں میں زکوٰۃ کی رقم تملیک کے بغیر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔اور اداءِ زکوٰۃ کے لیے تملیک ضروری ہے اس مسئلہ کی مفصل اور مدلل بحث اس رسالہ میں بیان کی گئی ہے۔اور شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔(امداد المفتین، کتاب الزکوٰۃ)"[99]۔

۹۔انجکشن سے روزہ فاسد نہ ہونے کی تحقیق

"اس مسئلہ پر سیر حاصل مدلل بحث ہے۔(امداد المفتین۔کتاب الصوم)" [100]۔

۱۰۔خبر الامور فی قدر المہور:

"عورتوں کے مہر کی مقدار کے متعلق مکمل تحقیق۔(امداد المفتین، کتاب النکاح، باب الجہاز والمہر) "[101]۔

۱۱۔اقامۃ العرف مقام الثبوت فی سقوط بعض الحقوق بالسکوت:

"عورت کے سکوت سے مہر معاف ہو گا کہ نہیں؟اس مسئلہ کی تحقیق کے ضمن میں یہ بحث بھی آگئی ہے کہ دین کی معافی کے لیے سکوت بیان کے قائم مقام کب ہو گا، کب نہیں؟امداد المفتین۔کتاب النکاح، باب الجہاز والمہر)" [102]۔

۱۲۔رفع الجور فی حکم یمین المؤبد والفور:

"اگر طلاق کو کسی کام کے نہ کرنے پر معلق کیا تو کب تک نہ کرنے سے طلاق واقع ہو گی۔اس مسئلہ کی مکمل تحقیق۔(امداد المفتین، کتاب الطلاق)"[103]۔

۱۳۔ حکم الانصاف فی الطلاق الغیر المضاف:

"شوہر نے جس طلاق کی اضافت بیوی کی بجائے اپنی طرف کی ہو، وہ واقع ہو گی کہ نہیں؟ اس کا مفصل ومدلل حکم، یہ رسالہ در حقیقت حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی تصنیف ہے حضرت مفتی صاحب مد ظلہم نے اسے تبرک وافادہ کے لیے امداد المفتین کا جزء بنایا ہے (امداد المفتین۔ کتاب الطلاق)" (104)۔

۱۴۔ نیل المرام فی حکم المسجد المبنی بالمال الحرام:

" مال حرام مسجد کی تعمیر میں لگانے کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم ۔(امداد المفتین ۔کتاب الوقف)"(105)۔

۱۵۔ الاحوی بالقبول فی وقف العمارۃ علی ارض النزول:

"لاوارث زمین پر حکومت قبضہ کر کے کسی کو دیدے تو اس کو وقف کرنے کے احکام پر مشتمل ہے۔(امداد المفتین۔ کتاب الوقف)" (106)۔

۱۶۔ توضیح کلام اہل اللہ فی ما اہل بہ لغیر اللہ:

"بتوں یا قبروں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں کے متعلق شرعی احکام۔(امداد المفتین کتاب الصید والذبائح)" (107)۔

۱۷۔ سجدۂ تعظیم، یعنی "المقالۃ المرضیۃ فی سجدۃ التحیۃ":

"تعظیمی سجدہ کے متعلق مفصل بحث و تحقیق پر مشتمل ہے"۔(امداد المفتین۔ کتاب الحظر والاباحۃ) (108)۔

۱۸۔ اشباع الکلام فی مصرف الصدقۃ من المال الحرام:

"مال حرام کو صدقہ کرنے کے متعلق مفصل تحقیق پر مشتمل ہے"۔(امداد المفتین، باب ارباح فاسدہ، ومال حرام)(109)۔

وہ فقہی رسائل جو احکام القرآن عربی کا جزء بن کر شائع ہوئے:

۱۔ تفصیل الخطاب فی تفسیر آیات الحجاب:

"عورتوں کے پردے سے متعلق جتنی آیتیں قرآن کریم میں آئی ہیں۔ ان سب کی تفسیر اس رسالے میں یکجا کر دی گئی ہے اور پردہ شرعی سے متعلق چالیس (۴۰) سے زیادہ روایات حدیث اور صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کے ارشادات جمع کر کے پردے کے احکام مدلل و مفصل بیان کئے گئے ہیں اور مخالفین کے شبہات کا شافی جواب دیا گیا ہے"(110)۔

۲۔ السعی الحثیث فی تفسیر لہو الحدیث:

"آیت قرآنی ﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشۡتَرِي لَهۡوَ ٱلۡحَدِيثِ﴾ [لقمان: ٦] کی مبسوط تفسیر ہے۔ جس میں گانے بجانے اور سماع کی مفصل بحث ہے"(111)۔

۳۔ کشف الریب عن علم الغیب:

"یہ علم غیب کے مسئلہ پر آیات قرآنی اور ارشادات نبوی اور ائمہ فقہاء و صوفیا کی تحقیقات کا بہترین مجموعہ ہے"(112)۔

۴۔ تکمیل الحبور بسماع اہل القبور:

"اس میں سماع موتی کے معرکۃ الآراء مسئلہ پر قرآن و سنت اور ائمہ دین کے ارشادات کی روشنی میں تحقیقی بحث کی گئی ہے"(113)۔

۵۔ کشف العناء عن وصف الغنا:

"اس میں غناء ومزامیر اور موسیقی کے بارے میں قرآنی آیات کی تفسیر اور احادیث کی تشریح کر کے مسئلہ کو مدلل کیا گیا ہے"(114)۔

٦۔ اماطۃ الشغب فی کراہۃ اللھو واللعب:

"اس میں مختلف کھیلوں کے احکام قرآن وسنت کی روشنی میں جمع کئے گئے ہیں"(115)۔

۷۔ تنقیح الکلام فی احکام الصلاۃ والسلام:

"یہ رسالہ آیت ﴿إِنَّ ٱللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّ﴾ [الأحزاب: ٥٦] کی مبسوط تفسیر ہے۔ جس میں درود وسلام کے احکام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں"۔

یہ کل پچاس فقہی تصانیف ہیں علاوہ ازیں پینتالیس فقہی رسالے ''جواہر الفقہ'' میں آ گئے ہیں۔ اس طرح صرف فقہی موضوعات پر حضرت مفتی صاحب مد ظلہم کی تصانیف کی کل تعداد پچانوے ہو گئی اور یہ بھی موجودہ تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے ہو سکتا ہے۔ کچھ اور رسائل بعد میں مل جائیں۔ جن تک اس وقت احقر کی نظر نہ گئی ہو"(116)۔

دیگر فقہی کتب وتحقیقات:

۴۔ آلات جدیدہ:

"اس میں لاؤڈ اسپیکر، گراموفون، فوٹو گرافی، ہوائی جہاز، ریڈیو، ایکسرے، انجکشن وغیرہ آلات جدیدہ سے متعلق پیدا ہونے والے جدید مسائل کا شرعی حل، نیز مریض کے بدن میں خون پہنچانے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے"(117)۔

۵۔آلہ مکبر الصوت:

"لاؤڈ اسپیکر کو اذان خطبہ اور نماز میں استعمال کرنے کے متعلق شرعی احکام، علمائے دیوبند، تھانہ بھون سہارنپور اور دہلی وغیرہ کی قدیم وجدید تحقیقات کا خلاصہ اور آخری فیصلہ ہے۔ پہلے یہ رسالہ الگ شائع ہوا تھا اب حالات جدیدہ کا جزءبن کر شائع ہوا ہے"(118)۔

٦۔رؤیت ہلال:

"پاکستان اور دوسرے ممالک میں یہ مسئلہ عرصہ سے معرکۃ الآراء بنا ہوا ہے، حضرت مفتی صاحب نے اس مسئلہ کی پوری تفصیل شرعی اصول کے مطابق لکھی ہے، چاند کے معاملے میں شرعی حیثیت اور متعلقہ شرعی احکام کی تفصیل بیان فرمائی ہے"(119)۔

۷۔مسئلہ سود

"سود کی شرعی تعریف، قدیم طرز کا مہاجنی سود اور جدید قسم کے تجارتی بنکوں کے سود کی مفصل تحقیق اور عام شبہات تفسیر اور حرمت سود کے متعلق چودہ(۱۴)احادیث، سود کی دینی، ودنیاوی خرابی وبربادی کا مفصل بیان، اس موضوع پر نہایت شافی وکافی تصنیف ہے"(120)۔

۸۔بیمہ زندگی:

"اس مسئلہ کی مکمل تحقیق شرعی اصول پر کی گئی ہے آخر میں دیگر علماء کرام کی تصدیقات ہیں"(121)۔

۹۔پراویڈنٹ فنڈ:

"پراویڈینٹ فنڈ پر زکوۃ واجب ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق اور اس فنڈ پر سود کے نام سے ملنے والی رقم کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے"(122)۔

۱۰۔اسلام کا نظام تقسیم دولت:

"سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان اسلامی نظام کا اعلیٰ وبہتر ہونا اور دونوں نظاموں پر نئی حیثیت سے بحث، اس موضوع پر بہترین مقالہ ہے"(123)۔

۱۱۔اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟:

"اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔اور اس سے موجودہ معاشی مسائل کیوں کر حل ہو جائیں گے؟حضرت مفتی صاحب مد ظلہم نے اس سوال کا سادہ،عام فہم اور دلنشین جواب اس رسالہ میں دیا ہے اس کے مطالعہ سے عام پڑھا لکھا انسان ایک نظر میں یہ جان سکتا ہے کہ اسلام موجودہ نظام معیشت میں کیا بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔اور سوشلزم کے بر خلاف ان کے ذریعہ سرمایہ داری کی خرابیوں کا انسداد کس طرح ہو سکے گا؟"[124]۔

۱۲۔قرآن میں نظام زکاۃ:

"زکوٰۃ کے متعلق آیات قرآنی کی تفسیر،زکوٰۃ کن اصولوں پر قائم ہے اور اس کے نصاب اور مصارف کا تعین اور شبہات کا جواب اس کتاب کے دوسرے حصہ میں مفتی محمد رفیع عثمانی نے زکوٰۃ کے مفصل احکام درج کئے ہیں"[125]۔

۱۳۔اعضائے انسانی کی پیوند کاری:

"سرجری کے ذریعہ ایک انسان کا عضو دوسرے انسان کے جسم میں لگانے کی شرعی حیثیت کی مفصل اور مدلل تحقیق"[126]۔

۱۴۔ضبط ولادت:

"اس کی شرعی حیثیت اور مروجہ خاندانی منصوبہ بندی پر شرعی اور اقتصادی حیثیت سے مکمل بحث"[127]۔

۱۵۔تصویر کے شرعی احکام:

"تصویر کشی اور استعمال، تصاویر سے متعلق قرآن وحدیث کے ارشادات اور مفصل احکام،فوٹو اور چھوٹی چھوٹی تصویروں اور آدھے دھڑ کی تصویروں کے احکام مع جواب شبہات"[128]۔

۱۶۔ایمان اور کفر۔ قرآن کی روشنی میں:

"کفر اور اسلام اور مسلم وکافر کی شرعی تعریف، کسی مسلمان کو اسلام سے خارج کہنے میں کیا احتیاط لازم ہے۔ اور اس کے کیا اصول ہیں؟ اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کی مکمل تشریح اور اہل قبلہ کے معنی، قرآن وحدیث کے دلائل اور صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کی تصریحات نہایت تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب درحقیقت حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کی ضخیم کتاب اکفار الملحدین کا اردو میں خلاصہ ہے"۔[129]

۱۷۔آداب سفر مع احکام سفر:

"سفر شرعی کی تعریف، مسافر اور سفر کے احکام، آداب اور دعائیں جو احادیث اور کتب فقہ سے جمع کی گئی ہیں"[130]۔

۱۸۔آداب مساجد:

"اس میں مساجد کے فضائل، آداب، احکام اور ان کاموں کا مفصل بیان ہے جو مسجد میں ناجائز ومکروہ ہیں"[131]۔

۱۹۔احکام دعا:

"حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی عربی تصنیف یعنی "استجاب الدعوات" کا اردو ترجمہ جس میں نمازوں کے بعد دعا مانگنے کا مسنون طریقہ احادیث صحیحہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس میں مزید اضافے بھی فرمائے ہیں"[132]۔

۲۰۔شب براءت:

"اس میں شب برأت کے فضائل وبرکات اور احکام کا مفصل بیان اور غلط رسموں کی تردید ہے"[133]۔

۲۱۔احکام حج:

"تمام ضروری احکام حج مختصر اور آسان طرز میں لکھے گئے ہیں نہایت مفید اور کارآمد رسالہ ہے"[134]۔

۲۲۔تاریخ قربانی:

"اس میں قربانی کی مکمل تاریخ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاءﷺ کے عہد مبارک تک ہر دور میں اس کی مختلف صورتیں اور اسلام میں واجب ہونے کی اور اس کے بدلہ میں قیمت کا صدقہ کافی نہ ہونے کی مفصل تحقیق قرآن وسنت کے دلائل سے بیان کی گئی ہے۔ نیز متجددین کے اعتراضات کا کافی جواب دیا گیا ہے"[135]۔

۲۳۔جہاد پاکستان ۱۹۶۵ء:

"اس میں جہاد کے فضائل اور مفصل احکام بیان کئے گئے ہیں"[136]۔

۲۴۔بسم اللہ:

"کے فضائل وبرکات اور مسائل،اورآخر میں اس کے خواص اور اس کے ذریعہ دینی ودنیوی فوائد، بیماریوں اور پریشانیوں کا علاج لکھا گیا ہے"[137]۔

۲۵۔گناہ بے لذت:

"اس رسالے میں ایسے گناہوں کا بیان ہے جن میں نہ کوئی ظاہری لذت ہے نہ کوئی معاشی مجبوری، محض غفلت وبے پروائی سے لوگ ان میں مبتلا ہیں۔ اگر ذرا بھی فکر کریں تو ان گناہوں کو فوراً چھوڑ سکتے ہیں اس رسالے میں قرآن وحدیث سے ان گناہوں کے سخت عذاب ووبال کو بھی بیان کیا گیا ہے ،اور آخر میں ایک دوسرا رسالہ صغائر گناہوں کی فہرست لگا دیا گیا ہے"۔

فتنۂ قادیانیت پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات:

رد قادیانیت کے سلسلہ میں حضرت مفتی اعظم کی اہم ترین خدمات اس کی وہ گرانقدر تصنیفات ہیں جو آپ نے اسلام اور قادیانیت کے درمیان زیر بحث مسائل پر مرتب فرمائیں،ان میں اکثر کا ذکر اوپر کی تحریر میں آچکا ہے۔

۵

فصلِ پنجم

اصلاحی تصنیفات

فصل پنجم: اصلاحی تصنیفات

فقیہِ ملت مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ، کو جہاں اللہ تعالٰی نے تفقہ فی الدین کی دولت عظمیٰ سے مالامال فرمایا تھا وہاں اصلاح قوم کے جذبہ خیر سے بھی سرشار فرمایا تھا، حضرت تھانوی کو قوم کی زبوں حالی اور پر مصائب زندگی کی اصلاح کی جو فکر لاحق رہتی تھی جس کا بین ثبوت ان کی وہ سینکڑوں تصانیف ہیں جو انہوں نے اس امت مرحومہ کی اصلاح کی خاطر تصنیف فرمائیں۔ اسی فکر و جذبہ کا ایک بڑا حصہ حضرت مفتی صاحب کو اپنے شیخ کی میراث میں ملا تھا، یہی وہ جذبہ تھا جس نے حضرت مفتی صاحب کو بھی بیسیوں ایسی کتابیں لکھنے پر مجبور کر دیا جن کی عام مسلمانوں کو انتہائی شدید ضرورت تھی اور جو انشاءاللہ ایک طویل مدت تک اس قوم کو راہ ہدایت پر چلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی رہیں گی۔

اس فصل میں حضرت مفتی صاحب کی ان تصانیف میں سے چند کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے جو بنیادی طور پر اصلاحی تصانیف کی فہرست میں آتی ہیں۔

ا۔ اَوجز السیر لخیر البشر (سیرت خاتم الانبیاء ﷺ):

اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

> ''حضرت مفتی صاحب سے بعض احباب نے اسلامی انجمن کے لیے سیرت پر ایک رسالہ تصنیف فرمانے کی درخواست کی جس میں اختصار کے ساتھ آسان زبان میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک اجمالی نقشہ مکمل طور پر روایات میں احتیاط کو مدنظر رکھ کر کھینچا گیا ہو، مفتی صاحب نے اس درخواست کو قبول کیا اور ۱۳۴۶ھ میں ایک انتہائی مختصر مگر جامع کتاب جو تمام ضروری اور اہم واقعات کے ساتھ بہت سے معرکۃ الآراء مسائل مثلاً

تعدد ازواج، جہاد اور واقعۂ معراج وغیرہ پر مخالفین کے اوھام واشکالات کے موٹے موٹے مگر شافی جوابات پر مشتمل ہے تحریر فرمائی۔

مفتی صاحب نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اس میں ایک تو اس بات کا اہتمام فرمایا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی مکمل سیرت انتہائی سہل اور سادہ زبان میں عوام الناس کے سامنے آجائے جس کو بڑا آدمی ایک مجلس اور بچے چند مجالس میں سبقاً پڑھ کر حضور ﷺ کی سیرت پر عمل پیرا ہو سکیں۔

اسی اختصار کی بناء پر اس رسالہ کا نام ''او جز السیر لخیر البشر'' بھی تجویز فرمایا اور ساتھ ہی اس بات کا بھی پورا اہتمام فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی کا نقشہ معتبر کتب تاریخ وحدیث کے حوالے سے سامنے آئے چنانچہ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے لے کر وصال تک کے تمام واقعات اس رسالہ میں سما گئے ہیں اور ساتھ ہی بعض اہم مباحث کو سہل کر کے ان کا اختصار کیا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اس قدر قبولیت عطا فرمائی کہ تقریباً ڈھائی لاکھ کے قریب اس کے نسخہ کئی مرتبہ شائع ہو کر عوام وخواص میں پھیل چکے ہیں، ہندوستان کے بہت سے اسکولوں اور دینی مدارس میں نیز پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں یہ کتاب داخل نصاب ہے"[138]۔

۲۔ نجات المسلمین یعنی گناہوں کا کفارہ:

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا منیب احمد رقم طراز ہیں:

''مسلمان موجودہ دور میں جس زبوں حالی اور مصائب ومشکلات کا شکار ہیں وہ کسی صاحب عقل وفہم سے مخفی نہیں۔ ان مسائل کا اصل سبب تو ہمارے گناہ ہیں جیسا کہ قرآن وحدیث کی سینکڑوں نصوص سے ثابت ہے، اور ان کا اصل علاج تو اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار ہی ہے۔

مگر گمراہیوں کے اس طوفان اور گناہوں کے اس بھنور میں جس طرح مسلمان چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں ان سے بچنے اور نکلنے میں بھی خاصا وقت درکار ہے، ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں بہت سے ایسے اعمال مذکور ہیں جن کے متعلق معتبر احادیث میں گناہوں کا کفارہ ہونا مذکور ہے اور وہ اعمال نہایت آسانی سے فوراً کئے جا سکتے ہیں۔

یوں تو اس موضوع پر بہت سے علماء سلف و خلف نے قلم اٹھایا ہے۔ مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، اور حافظ ذکی الدین عبد العظیم منذری، شیخ ابو بکر مروزی، شیخ ابو زید ابن خلیل اوزاعی، شیخ محمد بن حطاب شامل ہیں، مگر یہ ساری کتابیں اور رسائل عربی میں ہیں جن سے عربی دان یا اہل علم ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے ان میں سے دو رسائل: حافظ ابن حجر کا رسالہ ''الخصال المکفرۃ عن الذنوب المتقدمة والمتأخرة'' اور شیخ محمد بن حطاب کا رسالہ ''بشارۃ المحبوب بتکفیر الذنوب'' کو پیش نظر رکھ کر اردو زبان میں یہ رسالہ تحریر فرمایا ہے تا کہ پاکستان کے عام مسلمان بھی ان اعمال کو اختیار کر کے اپنے گناہوں کی معافی کا سامان کر سکیں'' (139)۔

۳۔ ذکر اللہ اور فضائل و مسائل درود و سلام:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی اس اصلاحی تصنیف کے حوالے سے مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب حضرت مفتی صاحب نے بعض احباب کے مشورہ اور اصرار پر ۱۳۸۲ھ میں مسلمانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر بطور علاج تالیف فرمائی۔ اس کتاب کی تالیف کا محرک بھی حضرت مفتی صاحب کا وہی جذبۂ خیر ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنی ظاہری و باطنی حالت سنوار لیں اور دین پر عمل کر کے اپنی نجات کا سامان پیدا کر لیں۔

خصوصیات:

۱۔ذکر اللہ کے فضائل اور حقیقت کا صحیح انداز ہوتا ہے۔

۲۔درود شریف کی اہمیت اور مقام واضح ہوتا ہے۔

۳۔ذکر اللہ کرنے اور درود شریف پڑھنے کا ذوق شوق اور اس کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔

۴۔تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔

۵۔ہر بات مدلل اور مبرہن ہے، اور حوالے کے ساتھ کہی گئی ہے۔

۶۔حسب ضرورت فقہی جزئیات و مسائل بیان کئے گئے ہیں"(140)۔

۴۔گناہ بے لذت:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

" آج کل قریب قیامت کی بناء پر کفر والحاد، بے دینی اور بے عملی کا دور دورہ ہے اور دین پر عمل کرنا بمطابق حدیث ایسا مشکل ہو گیا جیسے انگارے کے ہاتھ میں تھامنا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعدا کو تو اس بات کی فکر ہی نہیں رہی کہ جو کام وہ کر رہے ہیں حلال ہے یا حرام ہے ثواب ہے یا گناہ، اور اگر کوئی مسلمان انفرادی طور پر گناہوں سے جان بچا بھی لے تو دنیا کی فضا اتنی تنگ ہو گئی ہے کہ اجتماعی گناہ، زراعت، تجارت، ملازمت اور معاش کے تمام شعبوں پر چھائے ہوئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہماری عدم توجہ، بے پروائی، غفلت اور کم علمی کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آج کل شریعت پر عمل کرنے کو سخت دشوار سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ شریعت پر عمل میں کوئی دشواری نہیں۔

حدیث میں ہے: "الدین یسر "[141] دشواری اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ جب کسی چیز پر عمل کرنے

والے کم ہو جائیں اور اس کا رواج نہ رہے تو آسان چیز بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور ذلت کو دیکھ کر حضرت مفتی صاحب کی اصلاحی طبیعت نے ان کو مجبور کیا کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ایک ایسا رسالہ تحریر کیا جائے جس میں ان گناہوں کی تفصیل قرآن و حدیث کی روشنی میں آجائے تاکہ مسلمانوں کو اس کے گناہ ہونے کا علم ہو جائے، اور اس کے چھوڑنے کا ارادہ کر لیں، اسی مناسبت سے رسالہ کو گناہ بے لذت کے نام سے موسوم فرمایا۔

حضرت مفتی صاحب نے زیر نظر رسالہ میں دو قسم کے گناہوں کی فہرست جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے ایک تو گناہ جن میں کسی بے حس بد مذاق کو بھی حظ اور لذت نہیں، دوسرے وہ جس میں حقیقتاً کوئی لذت نہیں مگر بعض لوگ اپنی بداخلاقی اور بے حسی کے سبب ان میں کوئی حظ محسوس کرتے ہیں لیکن اگر ان کو چھوڑ دیں تو دنیا کی ادنی ضرورت و خواہش میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہر گناہ کو ذکر کرنے کے بعد اس پر جو وبال عظیم اور شدید وعیدیں آئیں ہیں، ان کو احادیث کی مستند کتابوں سے نقل کیا ہے، حسب ضرورت فقہی مسائل اور اہم نکات بیان فرمائے ہیں۔ عام مسلمانوں کو دعوت فکر دی ہے اور اس انداز سے سمجھایا ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنی اولاد کو یا ایک مرشد کامل اپنے مرید کو انتہائی خلوص لگن اور محبت سے گمراہیوں سے نکال کر راہ ہدایت پر چلانے کی فکر کرتا ہے۔

اس کتاب کے اخیر میں حضرت مفتی صاحب نے علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری حنفی صاحبِ کی تصانیف مشہورہ جن میں ''الاشباہ والنظائر'' بھی شامل ہے۔ ایک رسالہ (جو ان کے مجموعہ ''رسائلِ زینیہ'' میں چوتیسواں رسالہ ہے اور ''الاشباہ والنظائر'' مصری کے آخر میں لگا ہوا ہے) کو اردو زبان میں منتقل کر کے مستقل

رسالہ کی صورت میں مذکورہ کتاب کا ضمیمہ بنادیا ہے، اور اس کا نام ''إنزار العشائر من الصغائر والکبائر''

تجویز فرمایا ہے''۔

خصوصیات:

۱۔ نہایت ہمدردی اور شفقت سے لوگوں کو گناہوں سے ترک کی ترغیب دی گئی ہے۔

۲۔ ایسے گناہوں کو بطور خاص ذکر کیا گیا ہے جن کو آج کل غفلت یا جہالت کی بناء پر گناہ نہیں سمجھا جاتا۔

۳۔ اردو زبان میں صغائر و کبائر کی سب سے طویل فہرست ہے۔

۴۔ جگہ جگہ ضرورت کے مطابق فقہی جزئیات ذکر کئے گئے "(142)۔

۵۔ مصیبت کے بعد راحت مع ''دفع الافلاس'':

مولانا منیب احمد اس کتاب کے تعارف کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''یہ رسالہ در حقیقت امام حدیث شیخ ابو بکر عبداللہ بن ابی الدنیا متوفی ۲۸۲ھ کی ایک کتاب ''الفرج بعد الشدۃ'' کا اردو ترجمہ اور تشریح ہے۔

یہ رسالہ حضرت مفتی صاحب نے ۱۳۵۸ھ میں تالیف فرمایا اور اس میں تقریباً بیاسی روایات حدیث اور مستند واقعات وارشادات مذکور ہیں، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان اعمال واوراد وظائف کے ذریعہ مسلمانوں نے بڑی سے بڑی پریشانی اور مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ ایک مستقل رسالہ پر مشتمل ہے جو ''دفع الافلاس'' کے نام سے موسوم ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب نے افلاس تنگ دستی اور فقر وفاقہ کے دفع کرنے کے لئے کچھ تدابیر اور ادعیہ نقل فرمائی ہیں کہ اگر مسلمان ان پر عمل کریں تو کشائش رزق اور فراخی روزگار کے لئے انتہائی مجرب اور آزمودہ ہیں۔

یہ رسالہ بھی درحقیقت نویں صدی ہجری کے معروف امام حدیث و تفسیر شیخ السنہ علامہ جلال الدین سیوطی کے رسالہ ''اصول الرفق فی الحصول''کا اردو ترجمہ اور تشریح ہے۔ حضرت مفتی صاحب مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ خود روایات حدیث اور اثار واقوال جمع کرتا اس رسالہ کا سلیس اردو ترجمہ کر دینا مناسب سمجھا جو اس باب میں کافی شافی ہے''(143)۔

۶۔وحدت امت:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''یہ کتاب دراصل حضرت مفتی صاحب کا ایک خطاب ہے جو آپ نے ذوالقعدہ ۱۳۸۵ھ میں جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائلپور کے ایک جلسہ میں فرمایا جو بعض حضرات نے ٹیپ ریکارڈ کی بعینہ نقل ''اخبار المنبر''لائلپور سے شائع ہوئی۔ بعد میں بعض احباب کے اصرار اور اس کے انتہائی مفید اور اہم ہونے کے بناء پر عوام کے فائدے کے لئے اس پر نظر ثانی کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

اس کتاب میں حضرت مفتی صاحب نے ٹھوس دلائل اور مستند واقعات سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ اختلاف رائے اور چیز ہے جو بسا اوقات محمود اور ضروری ہے اور افتراق وانتشار دوسری چیز ہے جو ہر حال میں قبیح اور واجب الترک ہے۔

اس کتاب کے ساتھ بھی ایک بہت ہی اہم رسالہ ''اختلاف امت اور ان کا حل''بطور تکملہ شامل ہے یہ بھی ایک تقریر ہے جو ''شام ہمدرد''میں ۳/اکتوبر ۱۹۶۳ھ میں بمقام لاہور کی گئی۔ اس کی بعد میں ترمیم واضافہ کر کے اسے کتابی شکل دے دی گئی''(144)۔

۷۔ آداب النبی ﷺ:

مولانا منیب احمد اس کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضور اقدس ﷺ کے اخلاق و شمائل اور حلیہ شریفہ و معجزات کو اس رسالہ میں اختصار کیساتھ جمع فرمایا گیا ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں حضرت مفتی صاحب نے ایک مختصر رسالہ ''سیرت خاتم الانبیاء''، لکھا تھا جس کا تفصیلی تعارف ما قبل میں گذر چکا ہے، اس کے کچھ ہی عرصے بعد زیر نظر رسالہ کی اشاعت ایک ماہوار رسالہ میں شروع ہوئی لیکن بعض اسباب کی وجہ سے ہی رسالہ بند ہو گیا اور اشاعت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا اور اشاعت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا بیس سال بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اس کی تکمیل کا تقاضا پیدا ہوا اور چند ایام میں اس کی تکمیل فرمادی۔

اس رسالہ کی بنیاد دراصل حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی کا ایک رسالہ ''آداب النبی'' ہے حضرت مفتی صاحب نے اس رسالہ کا سلیس ترجمہ اور ضروری تشریح فرمائی ہے اور ہر بات کا حوالہ کتب، آپ کا حلیہ مبارک اور آپ کے معجزات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں اور حضور اکرم ﷺ سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے''۔[145]

۸۔ آداب الشیخ والمرید:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد رقم طراز ہیں:

''اس رسالہ میں حضرت موصوف نے طریقت وسلوک کے وہ آداب واصول صحیح ارشاد فرمائے ہیں جو شیخ اور مرید دونوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔

یہ رسالہ دراصل ''قدوۃ الاکابر اسوۃ الاصاغر'' شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف ہے حضرت مفتی صاحب نے اس کا سلیس اردو ترجمہ فرما کر اپنے مربی و مرشد حضرت تھانوی کی خدمت میں پیش کیا اور آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا اور اپنے دست مبارک سے اس پر ضروری اضافات و حواشی تحریر فرمائے۔

مقدمہ میں حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''میں ذاتی طور پر الحمدللہ ہمیشہ ان اداب و طریقت کو ضروری سمجھتا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی کوئی نقل سامنے نہیں آئی تھی اتفاقاً شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا رسالہ مذکورہ نظر سے گذرا تو ایک امام فن سے انہی اصول کو منقول دیکھ کر مسرت ہوئی، تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرت اقدس تھانوی کی خدمت میں پیش کیا، حضرت بھی اس وجہ سے مسرور ہوئے کہ جو اصول طبعی طور پر مقرر فرمائے تھے وہ سب ایک امام فن کے قلم سے ظاہر کئے گئے تھے، حضرت تھانوی نے اس کا عربی نام ''القول المضبوط'' تجویز فرمایا''[146]۔

۹۔ خلاصہ تسہیل قصد السبیل:

مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''تصوف اور طریقت جو در حقیقت شریعت پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے اس میں بہت سے ناواقف لوگوں کو کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اور بہت سے لوگ بزرگوں کے غیر اختیاری احوال اور وجدی کیفیات کو تصوف سمجھ بیٹھے، اسی طرح بعض طریقت کو نہایت مشکل اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں جب کہ بعض نادان باجود غیر شرعی امور کے ارتکاب کے چند اچھے خواب اور حالات دیکھ کر نفس کی اصلاح اور اعمال کے اہتمام سے بے فکر ہو جاتے ہیں حضرت نے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا بنام ''قصد السبیل'' یہ رسالہ ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا۔

مگر اس رسالہ کی زبان علمی تھی اس لیے عام لوگوں کو اس سے استفادہ میں دشواری پیش آتی تھی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قدیم خلیفہ مولانا شاہ لطف رسول صاحب نے حضرت کی اجازت سے اس رسالہ کی تسہیل آسان زبان میں لکھی جو "تسہیل قصد السبیل" کے نام سے شائع ہوئی اور اس کے ساتھ چند اہم مضامین بطور ضمیمہ شامل ہوئے، مگر آج کل لوگوں کی تساہل پسندی، کسل اور عملی استعداد کی کمی کو دیکھ کر حضرت مفتی صاحب نے اس رسالہ کے مضامین کا خلاصہ اس طرح تحریر فرمایا کہ ضمائم کو اصل کے ساتھ شامل فرمادیا اور جہاں اجمال تھا اس کا مختصر مگر واضح تشریح بھی فرمادی۔

اس رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود تصوف کے صحیح خدوخال اور اس کی حقیقت پوری طرح واضح کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مشائخ سب سے پہلے مریدین کو اس رسالہ کا مطالعہ کا حکم دیتے ہیں اور بہت سے مشائخ بیعت سے پہلے مبتدی کو کئی مرتبہ اس رسالہ کو پڑھواتے ہیں، تب جا کر بیعت فرماتے ہیں۔ یہ رسالہ طریقت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے"(147)۔

۱۰۔مقامات صوفیہ:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد تحریر فرماتے ہیں:

"بزرگان سلف کے مقالات وملفوظات اور معمولات بلاشبہ علم و عمل کی روح ہیں، اور دنیا اور آخرت کی رہبری اور رہنمائی کا ذریعہ ہیں، ان کا مطالعہ ایمان میں قوت اور یقین میں پختگی پیدا کرتا ہے۔

زیر نظر رسالہ تصوف وتاریخ کی مستند کتب "رسالہ قشیریہ" اور "طبقات امام شعرانی" کا بہترین انتخاب ہے جس میں بزرگان سلف کے چیدہ چیدہ حالات ومقالاتِ حکمت درج کئے گئے ہیں، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی اور جاہلانہ تصوف میں فرق ہے۔

یہ رسالہ بھی درحقیقت حضرت تھانوی کی ایک سعی مبارک کا تکملہ ہے حضرت تھانوی نے یہ مقالات وملفوظات عربی زبان میں جمع فرما کر حضرت مفتی صاحب کے سپرد فرمادیے کہ اس کا اردو ترجمہ کر کے شائع کرادو، حضرت مفتی صاحب نے ترجمہ میں افادہ عوام کی غرض سے تحت اللفظ ترجمہ کے بجائے لازمی ترجمہ یا خلاصۂ مطلب پر اکتفاء کیا ہے اور حسب ضرورت مشکل مقامات کی شرح بھی فرمادی گویا یہ رسالہ حضرت تھانوی کے عربی رسالہ کی بہترین اردو شرح ہے۔اس رسالہ میں مشائخ ومشاہیر صوفیا کے جو ملفوظات جمع کیے گئے ہیں وہ دین ودنیا کی فلاح کا ذریعہ ہیں''[148]۔

۱۱۔ملفوظات امام مالک:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس قدس سرہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، کسی عالم یا جاہل کی گردن آپ کے احسانات سے آزاد نہیں۔ حضرت مفتی صاحب کو امام مالک سے عشق کی حد تک محبت اور تعلق تھا اور یقیناً آپ ہی امام مالک کے مقام بلند کو کماحقہ پہچان سکتے تھے۔

اس مختصر رسالہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے زریں ملفوظات جمع کئے گئے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

مسلمانوں کے لئے بڑی ناشکری اور ناقدر شناسی ہے کہ ان کے حالات وملفوظات سے ناواقف رہیں۔آپ کے یہ ملفوظات طیبہ عام مسلمانوں کی حیاتِ دنیا وآخرت کے لیے مشعل راہ، علماء کے لئے عالم تبحر، صوفیا کے لیے مرشد کامل، زعماء امت کے لیے فوز وفلاح کا دستور اساسی ہے''[149]۔

۱۲۔درس عبرت:

مولانا منیب احمد صاحب نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تاریخ عالم عبرتوں کا آئینہ ہے، دنیا کا عروج وزوال، قوموں کی ترقی و تنزلی، امتوں کے واقعات ایک صاحب نظر کے لیے اپنے اندر ہزاروں عبرتیں لیے ہوئے ہے۔

زیر نظر رسالہ اندلس کے ایک مشہور بزرگ کا ایک نصرانی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونے اور پھر راہ راست پر آنے کا نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ ہے جس کا ماخذ علامہ دمیری کی کتاب ''حیات الحیوان'' ہے، حضرت مفتی صاحب نے اس کا اردو میں انتہائی دلچسپ ترجمہ فرمایا ہے تاکہ عام مسلمان اس کو پڑھ کر عبرت حاصل کر سکیں۔

اس رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ غرور و تکبر کی شناعت و قباحت واضح ہوتی ہے اور قاری اس مہلک مرض سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا ہے''(150)۔

۱۳۔ذوالنون مصری:

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''اسلام کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس کی حقانیت کے روشن دلائل قدم قدم پر نظر آتے ہیں، علماء سلف کا ہر فرد حقانیت اسلام کی زندہ جاوید دلیل ہے جن کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے اور اعمال واخلاق معاشرت و معاملات کے لیے نمونہ عمل سامنے آتا ہے، علماء سلف کی تاریخ کا ایک ایک ورق امت کے لیے راہنمائی کا خزینہ ہے۔

زیر نظر رسالہ بھی تاریخ کے انھی اوراق کا حصہ ہے، حضرت ثوبان ذوالنون مصری دوسری اور تیسری صدی کے معروف ومشہور عابد وزاہد ولی اللہ ہیں آپ کے حالات سے عربی تواریخ تو بھری پڑی ہیں مگر اردو میں کچھ

نہیں لکھا گیا تھا، حضرت مفتی صاحب نے اس رسالہ میں آپ کے سبق آموز حالات، حکیمانہ ملفوظات اور والہانہ اشعار کو عام فہم اردو زبان میں جمع فرمایا ہے تاکہ عام مسلمان اس کو پڑھ کر طاعت وعبادت کے شوق اور نور ایمانی میں اضافہ کر سکیں، اس رسالہ کا مدار حافظ حدیث ابن عساکر کی مشہور تاریخ ہے۔

شروع میں حضرت ذوالنون مصری کے مختصر حالات زندگی انتہائی دلکش انداز میں بیان کئے گئے ہیں، اس کے بعد آپ کے چند ملفوظات طیبہ ذکر کیے گئے ہیں"[151]۔

۱۴۔دو شہید:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

"اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر حضرت مفتی صاحب نے زیر نظر رسالہ تحریر فرمایا جس میں تابعین میں سے دو جلیل القدر بزرگوں کو سبق آموز زندگی اور دین پر ثابت قدمی اور راہ خدا میں قربان ہو جانے کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔

پہلے حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہے جو ۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور بڑے بڑے صحابہ کرام سے علم حاصل کر کے علم وعمل کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو فرماتے کہ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاؤ وہ مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔

دوسرے بزرگ جن کا تذکرہ اس رسالہ میں کیا گیا ہے حضرت سعید ابن مسیب ہیں۔ آپ کی ولادت کا سنِ فاروقی کا دوسرا سال ہے۔ آپ کی جلالت شان کے لیے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کا یہ فرمان کافی ہے کہ "میں نے سعید ابن مسیب سے زیادہ عالم دنیا میں نہیں دیکھا"[152]۔

۱۵۔ میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات:

حضرت مفتی صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا یٰسین صاحب علماء دیوبند، اکابر اور سلف و صالحین کا آخری نمونہ تھے، آپ علماء دیوبند کے ان اکابر کے علوم و معارف اور احوال و ملفوظات کے امین تھے، اس کتاب میں مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد کے احوال اور ان کے آزمودہ عملیات کو بیان کیا ہے، مولانا منیب احمد رقم طراز ہیں:

''اس رسالہ میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے والد محترم کی مختصر سوانح تحریر فرمانے کے بعد آپ سے سنے ہوئے بزرگان دیوبند کے حالات ملفوظات تعلیمات وہدایات مع مجربات جمع فرمائی ہیں۔

رسالہ کی ابتداء میں حضرت مولانا یٰسین صاحب کے مختصر حالات زندگی، آپ کی تعلیم، دار العلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس تقرری اور بزرگان دیوبند کیساتھ تعلقات کے احوال بیان کئے گئے ہیں''(153)۔

۱۶۔ شہادت کائنات:

مولانا منیب احمد اس کتاب کے تعارف کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس رسالہ میں حضرت مفتی صاحب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و حقانیت کی وہ شہادتیں جمع فرمائی ہیں، جو غیر شعوری چیزوں کے ذریعہ خرق عادات کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں پر ظاہر فرمائی ہیں اس میں ایسے ایسے عجیب واقعات ہیں کہ ان کو ضعیف العقیدہ مسلمان اور مادیت و تہذیب مغرب سے متاثر انسان کی عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی'' (154)۔

۱۶۔ مجالس حکیم الامت:

یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات کا مجموعہ ہے، مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب میں مفتی صاحب نے حضرت تھانوی قدس سرہ، کی چند مجالس کے خاص خاص اور اہم نکات جمع فرمائے ہیں۔ یہ کتاب علم و معارف اور تصوف و سلوک کے مسائل کا ایک بیش بہا خزینہ ہے اور دریا بکوزہ کا مصداق ہے۔ ان مختصر صفحات میں اس کا مختصر تعارف بھی کماحقہٗ پیش نہیں کیا جاسکتا، اس کے ایک ایک صفحہ میں اور مختصر الفاظ و جملوں میں ایسے ایسے دقیق مباحث و مضامین اور معرکہ آراء مسائل کا حل موجود ہے۔ جو بڑے بڑے رسائل میں بھی نامکمل رہتے ہیں''[155]۔

۱۸۔ شب براءت کے فضائل واحکام:

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''زیر نظر رسالہ میں حضرت مفتی صاحب نے شب براءت کی وجہ تسمیہ، اس کی تعین اور اس کے فضائل و برکات احادیث صحیحہ کی روشنی میں بیان فرمائے ہیں۔ اور اس رات میں جو اعمال مسنون ہیں ان کی فہرست بھی تحریر کی ہے تاکہ عام مسلمان اس رات کے بیش بہا فضائل و برکات سے بہرہ اندوز ہو سکیں، مگر افسوس ہے کہ بہت سے لوگ غفلت و جہالت سے اس کے ثواب و برکات کو عذاب و نقصانات سے بدل لیتے ہیں اور اپنی شومیٔ اعمال سے طرح طرح کی بدعتیں اور قبیح رسمیں ایجاد کر کے ہر ایک برکت کو اپنے لیے مصیبت بنا لیتے ہیں''۔

اس رسالہ میں ان خرافات اور لغویات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً آتش بازی جس میں لاکھوں روپیہ اور کئی جانوں کا نقصان ہو جاتا ہے، رسم حلوہ، چراغاں کی رسم، مسجدوں میں اجتماع اور شور شغب وغیرہ''[156]۔

۱۹۔ بسم اللہ (فضائل واحکام):

اس کتاب کے متعلق مولانا منیب احمد رقم طراز ہیں:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''ایک ایسا مختصر جملہ ہے جس کے پڑھنے میں نہ کوئی محنت ومشقت ہے نہ کوئی وقت صرف ہوتا ہے مگر اس کے آثار وبرکات نہایت دور رس اور عظیم الشان دینی ودنیوی فوائد پر مشتمل ہیں۔

اس مختصر رسالہ میں حضرت مفتی صاحب نے بسم اللہ کے شرعی احکام وخواص بسم اللہ کا قدرے تفصیل ذکر فرمایاہے، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اس مختصر رسالہ کی اصل مسلمانوں کو اس غفلت پر تنبیہ کرنا ہے کہ اور کچھ نہیں ہوتا تو اس بے محنت کام سے تو دم نہ چرائیں اور اس کے فضائل وبرکات کو بلاوجہ ضائع نہ کریں''(157)۔

۲۰۔جہاد، فوائد، مسائل دعائیں:

اس کتاب کا تعارف کرتے ہوئے مولانا منیب احمد لکھتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کے اچانک حملے کے وقت یہ مفصل رسالہ تحریر فرمایا جس میں جہاد کی تعریف، اس کے احکام وفضائل اور برکات کا مفصل تذکرہ فرمایاہے''(158)۔

خلاصۃ الباب

مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ کو جہاں اللہ تعالی نے تفقہ فی الدین کی دولتِ عظمی سے مالا مال فرمایا تھا، وہاں اصلاحِ قوم کے جذبۂ خیر سے بھی سرشار فرمایا تھا،اس کا واضح ثبوت آپ کی وہ تصانیف ہیں جو آپ نے امتِ مرحومہ کی اصلاح کی خاطر تصنیف فرمائیں، یہ فکر وجذبہ دراصل آپ کو اپنے مرشد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ورثہ میں ملا تھا،اس جذبے نے آپ کو بیسیوں ایسی کتب لکھنے پر مجبور کردیا جن کی علماء اور عام مسلمانوں کو شدید ضرورت تھی، آپ کی یہ تصانیف ایک طویل عرصہ تک امت کو راہ ہدایت پر چلنے میں ممد ومعاون رہیں گی۔

آپ کی تصانیف میں صلاح پسندانہ انداز غالب نظر آتا ہے اور آپ کی تحریر وتقریر طعن وتشنیع سے خالی ہوتی تھی، آپ اس باب میں ایک معتدل مذاق کے حامل تھے، جہاں باطل کو باطل کہنے کی بات آتی تو احسن طریقے سے جدال بھی کرتے تھے، کسی پر رد کرنا ہوتا تو فریق مخالف کے نظریات وافکار کی تعیین میں احتیاط وتثبت سے کام لیتے کہ وہ بات اس قائل نے واقعۃً کہی بھی ہے یا کسی اور شخص نے اس کی طرف منسوب کردی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ چاہے تحریر وتقریر کسی چیز کی دعوت وتبلیغ کے متعلق ہو یا کسی باطل نظریے کی تردید میں، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ دعوتِ حق مضبوطی سے دی جائے اور ایسے اسلوب سے دی جائے جس میں طعن وتشنیع اور دل آزاری کا شائبہ تک نہ ہو اور اس میں ہمدردی، ودل سوزی اور نرمی وشفقت کی مٹھاس ہو، تاکہ ہر ذہن کے لوگ اس تحریر وتقریر سے آزادانہ استفادہ کریں اور ان کے ذہن اس بات کو جلدی قبول کریں۔

آپ کی تالیفات کی خصوصیات میں سے زبان کے بے ساختگی اور سلاست، لب و لہجہ میں متانت اور سنجیدگی، فقرے بازی سے کوسوں دور، موضوع کا استیعاب، نکتہ سنجی اور استدلال کی قوت، مطالب کی تہذیب اور مضامین کی ترتیب کا خداداد سلیقہ ہے۔

آپ کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے جو تفسیر و حدیث، فقہ و تصوف، ادب و کلام، اصلاح معاشرت وغیرہ مختلف علوم پر مشتمل ہیں بعض کتابیں ہزار ہا ہزار صفحات پر محیط ہیں اور بعض چند صفحات کی ہیں جنہیں موجودہ اصطلاح میں مقالہ یا مضمون کہا جاسکتا ہے۔

تفسیرِ قرآن میں آپ کو خاص ذوق تھا، اس کی مثال آپ کی مایہ ناز تفسیر معارف القرآن ہے۔ اس میں آپ نے تفسیری جواہر بکھیرنے کے ساتھ ساتھ فقہی میدان کے بھی جوہر دکھائے۔ نیز اس میں آپ نے دور حاضر کے بعض مصنفین کی تفاسیر میں موقع بموقع غلطیوں کی بڑے ناصحانہ اور منصفانہ انداز میں تفصیلی نشاندہی کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس تفسیر میں زیادہ زور ان تعلیمات پر دیا گیا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں اور یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم محض اعتقادی اور نظریاتی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کی ہدایت انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور مشتمل ہیں اور یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس لئے جابجا قرآن کریم سے روز مرہ کے مسائل زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس سلسلہ میں جو تعلیمات اخذ کی گئی ہیں ان کا طریقہ استنباط اس قدر لطیف اور وجد آفریں ہے کہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اہل علم اور اہل ذوق ہر کر سکتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ، فطرتاً فقیہ النفس تھے، زبان خلق نے ''مفتی اعظم'' بنادیا جو اس، فقیہ کبیر و جلیل کے لیے عین حقیقت تھا۔ فقاہت دینی کے لیے جس وسعت علم (کتب فقہ) کے جزئیات تک پر گہری نگاہ، دقت نظر کی سلامتی، ذہن، اصابت رائے، احتیاط بیدار مغزی، اساتذہ فن کی صحبت و تربیت، تقویٰ و طہارت، اخلاص و بے نفسی، عدل وانصاف، راست گوئی و حق کو شی

غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت، مسئلہ کے مالہ وماعلیہ سے واقفیت، ضروریات زمانہ اور احوال متعلقہ سے باخبری کی ضرورت ہے وہ حضرت نور اللہ مرقدہ، میں بدرجہ اتم موجود تھیں "فتوی نویسی" کہنے کا ایک فن ہے۔ لیکن یہ فتویٰ نویسی بغیر فقاہت کے ممکن نہیں اور فقاہت میں مہارت جملہ علوم پر گہری نگاہ اور تمام علومِ دینیہ پر عبور کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ میں " فقاہت " اور فتویٰ نویسی کی صلاحتیں کماحقہ موجود تھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف سے فقہ اور فتاویٰ کی جو محیر العقول خدمت لی اس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ دیوبندی مدرسہ، فکر و فتاویٰ کا جو عظیم الشان ذخیرہ منصۂ شہود پر آیا۔اس کے دو بڑے جلیل القدر فتویٰ نگاروں یعنی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس روحہ اور مولانا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی تبویب و ترتیب نَو اور تدوین جدید حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ ہوئی۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ چونکہ ایک جید مفتی تھے بلکہ معاصر علماء نے انھیں مفتی اعظم پاکستان کا لقب بھی دیا تھا، اس لئے آپ کی تصانیف کا بہاؤ فقہ اور فتاوی کی طرف نسبتاً زیادہ ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تعداد تقریباً دو لاکھ سے متجاوز ہے جن میں ہر طرح کے سوالات کے جواب موجود ہیں، لیکن خاص طور سے عہد حاضر کے نئے فقہی مسائل پر آپ نے جو مفصل فتاویٰ یا رسائل تحریر فرمائے ان کی فہرست سے اندازہ ہو گا کہ اس پہلو سے مفتی صاحب کا کام کتنا وسیع، ہمہ گیر، ٹھوس اور مثبت ہے، ایمان اور طہارت سے لے کر میراث تک تقریباً ہر باب میں نئے مسائل پر آپ کے مفصل رسائل یا فتاویٰ موجود ہیں، جن کی تعداد اکیانوے ہے، اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی رسائل کا مجموعہ "جواہر الفقہ" تقریباً ایک سو پانچ (۱۰۵) رسائل پر مشتمل ہے۔

فقیہِ ملت مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ، کو جہاں اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی دولت عظمیٰ سے مالامال فرمایا تھا وہاں اصلاح قوم کے جذبہ خیر سے بھی سرشار فرمایا تھا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو قوم کی زبوں حالی اور پر مصائب زندگی کی اصلاح کی جو فکر لاحق رہتی تھی جس کا بین ثبوت ان کی وہ سینکڑوں تصانیف ہیں جو انہوں نے اس امت مرحومہ کی اصلاح کی خاطر تصنیف فرمائیں۔ اسی فکر وجذبہ کا ایک بڑا حصہ حضرت مفتی صاحب کو اپنے شیخ کی میراث میں ملا تھا، یہی وہ جذبہ تھا جس نے حضرت مفتی صاحب کو بھی بیسیوں ایسی کتابیں لکھنے پر مجبور کر دیا جن کی عام مسلمانوں کو انتہائی شدید ضرورت تھی اور جو انشاءاللہ ایک طویل مدت تک اس قوم کو راہ ہدایت پر چلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی رہیں گی، ان اصلاحی تصانیف کی تعداد بیس (۲۰) سے متجاوز ہے۔

مصادر، مراجع وحواشی باب دوم

(1) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۹۴ء، (ص:۱۰۹)۔

(2) القرآن، سورۂ ھود، (آیت:٦٦)۔

(3) القرآن، سورۂ ھود، (آیت:٦٧)۔

(4) تقی عثمانی، مفتی ، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۴۲۰)۔

(5) تقی عثمانی، مفتی ، میرے والد میرے شیخ، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۹۴ء، (ص:۱۱۲)۔

(6) حوالۂ سابقہ، (ص:۱۱۳)۔

(7) تقی عثمانی، مفتی ، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۴۲۲، ۴۲۳)۔

(8) تقی عثمانی، مفتی ، میرے والد میرے شیخ، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۹۴ء، (ص:۱۱۳، ۱۱۰)۔

(9) ایضا محولۂ بالا، (ص۵۲۴)۔

(10) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۵ء، (ج۱، ص۴۹۷)۔

(11) تقی عثمانی، مفتی ، میرے والد میرے شیخ، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۹۴ء، (ص:۸۵، ۸٦)۔

(12) حوالۂ سابقہ، (ص:۱۳٦)۔

(13) محولۂ بالا، (ص:۸۵)۔

(14) تقی عثمانی، مفتی ، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، دارالعلوم، (ج:۱، ص:۳۹۷، ۳۹۸)۔

(15) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۵ء، (ج۱، ص٦۲۲)۔

(16) ایضا حوالۂ سابقہ، (ص:٦۱۰، ٦۱۱)۔

(17) ایضا محولۂ بالا، (ص٦۱۲)۔

(18) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۶۲۰)۔

(19) ایضاحوالہ بالا، (ص:۶۲۲)۔

(20) ایضامحولہ بالا، (ص:۶۲۳)۔

(21) یوسف لدھیانوی، مفتی، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۲، ص:۶۲۲)۔

(22) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۶۲۲)۔

(23) ایضاحوالہ سابقہ، (ص:۶۲۳)۔

(24) ایضامحولہ بالا، (ص:۶۲۳)۔

(25) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۶۲۴)۔

(26) ایضاحوالہ سابقہ، (ص:۶۲۵)۔

(27) ایضامحولہ بالا، (ص:۶۲۵،۶۲۶)۔

(28) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۶۲۷،۶۲۶)۔

(29) ایضاحوالہ سابقہ، (ص:۶۲۷،۶۲۶)۔

(30) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۹۴ء، (ص:۸۳)۔

(31) ایضاحوالہ سابقہ، (ص:۸۳)۔

(32) ایضامحولہ بالا، (ص:۸۴)۔

(33) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۹۴ء، (ص:۸۴)۔

(34) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۶۲۷)۔

(35) ایضاحوالہ سابقہ (ج:۱، ص:۶۲۷)۔

(36) ایضا محولہٗ بالا(ج:۱،ص:۶۲۷)۔

(37) عبدالشکور ترمذی، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص:۶۲۸)۔

(38) ایضا حوالہٗ سابقہ (ج:۱، ص:۶۲۸)۔

(39) ایضا محولہٗ بالا(ج:۱، ص:۶۲۸)۔

(40) ایضا حوالہٗ سابقہ (ج:۱، ص:۶۲۸)۔

(41) تقی عثمانی، مفتی ، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۳۶۳)۔

(42) ایضا محولہٗ بالا، (ص:۳۲۴)۔

(43) ایضا حوالہٗ بالا، (ص:۴۵،۴۴)۔

(44) تقی عثمانی، مفتی، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۳۶۳)۔

(45) ایضا محولہٗ بالا، (ص:۳۲۴)۔

(46) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، ج:۱، (ص ۵۰۹)۔

(47) ایضا حوالہٗ بالا، (ص ۵۰۹)۔

(48) ایضا محولہٗ بالا، (ص ۵۰۹، ۵۱۰)۔

(49) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۰)۔

(50) ایضا حوالہٗ بالا، (ص ۵۱۰)۔

(51) ایضا محولہٗ بالا، (ص ۵۱۱)۔

(52) اشرف خان، مفتی، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۱)۔

(53) ایضا حوالہٗ بالا، (ص ۵۱۱)۔

(54) ایضا محولہٗ بالا،(ص۵۱۱)۔

(55) اشرف خان، مفتی، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء،(ج:۱،ص۵۱۱، ۵۱۲)۔

(56) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۲)۔

(57) ایضا محولہٗ بالا،(ص۵۱۲)۔

(58) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء،(ج:۱،ص۵۱۲)۔

(59) شفیع عثمانی، مفتی، جواہر الفقہ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۰ء،(ج۱،ص۲۳۹، ۲۳۸)۔

(60) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء،(ص۵۱۲، ۵۱۳)۔

(61) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۳)۔

(62) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۳)۔

(63) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۳)۔

(64) ایضا محولہٗ بالا، ج:۱،(ص۵۱۳، ۵۱۴)۔

(65) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء،(ص۵۱۴)۔

(66) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۴)۔

(67) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء،(ج:۱،ص۵۱۴)۔

(68) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۵)۔

(69) ایضا محولہٗ بالا،(ص۵۱۵)۔

(70) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء،(ج:۱،ص۵۱۵)۔

(71) ایضا حوالہٗ بالا،(ص۵۱۵)۔

(72) ایضا محولہ بالا، (ص ۵۱۵)۔

(73) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۶)۔

(74) ایضا حوالہ بالا، (ص ۵۱۶)۔

(75) ایضا محولہ بالا، (ص ۵۱۶)۔

(76) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۶)۔

(77) ایضا حوالہ بالا، ج:۱، (ص ۵۱۶)۔

(78) ایضا محولہ بالا، (ص ۵۱۶)۔

(79) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۶، ۵۱۷)۔

(80) ایضا حوالہ سابقہ، (ص ۵۱۷)۔

(81) ایضا محوالہ بالا، (ص ۵۱۷)۔

(82) ایضا محولہ بالا، (ص ۵۱۷، ۵۱۸)۔

(83) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۸)۔

(84) ایضا حوالہ بالا، (ص ۵۱۸)۔

(85) ایضا محولہ بالا، (ص ۵۱۸)۔

(86) اشرف خان، مفتی، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۸)۔

(87) ایضا حوالہ بالا، (ص ۵۱۸)۔

(88) ایضا محولہ بالا، (ص ۵۱۸، ۵۱۹)۔

(89) اشرف خان، مفتی، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص ۵۱۹)۔

(90) ایضاحوالہ بالا، (ص۵۱۹)۔

(91) ایضامحولہ بالا، (ص۵۱۹، ۵۲۰)۔

(92) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۴)۔

(93) ایضاحوالہ بالا، (ص۵۲۴)۔

(94) ایضامحولہ بالا، (ج:۱، ص۵۲۴)۔

(95) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۴)۔

(96) ایضاحوالہ بالا، (ص۵۲۴)۔

(97) ایضامحولہ بالا، (ص۵۲۴)۔

(98) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۴)۔

(99) ایضاحوالہ بالا، (ص۵۲۴)۔

(100) ایضامحولہ بالا، (ص۵۱۱)۔

(101) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۱۱)۔

(102) ایضاحوالہ بالا، (ص۵۱۱)۔

(103) ایضامحولہ بالا، (ص۵۱۱)۔

(104) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۱۱)۔

(105) ایضاحوالہ بالا، (ص۵۱۱)۔

(106) ایضامحولہ بالا، (ص۵۱۱)۔

(107) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۱۱)۔

(108)ایضاحوالۂ بالا،(ص۵۱۱)۔

(109)ایضامحولۂ بالا،(ص۵۱۱)۔

(110)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۶)۔

(111)ایضاحوالۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۶)۔

(112)ایضامحولۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۶)۔

(113)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۶)۔

(114)ایضامحولۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۶)۔

(115)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۷)۔

(116)ایضاحوالۂ بالا،(ص۵۲۷)۔

(117)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۲۰)۔

(118)ایضاحوالۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۰)۔

(119)ایضامحولۂ بالا،(ص۵۲۰)۔

(120) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ص۵۲۰)۔

(121)ایضاحوالۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۰)۔

(122)ایضامحولۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۱)۔

(123) اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ص۵۲۱)۔

(124)ایضاحوالۂ بالا،(ج:۱، ص۵۲۱)۔

(125)ایضامحولۂ بالا(ص۵۲۱)۔

(126)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج ا، ص ۵۲۱)۔

(127)ایضاحولہٗ بالا (ج:ا، ص ۵۲۱)۔

(128)ایضا محوالہٗ بالا، (ص ۵۲۲)۔

(129)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ص ۵۲۲)۔

(130)ایضاحوالہٗ سابقہ (ج:ا، ص ۵۲۲)۔

(131)ایضاحوالہٗ بالا، (ص ۵۲۲)۔

(132)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ص ۵۲۲)۔

(133)ایضاحوالہٗ سابقہ (ج:ا، ص ۵۲۲)۔

(134)ایضاحوالہٗ بالا، (ص ۵۲۳)۔

(135)اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ص ۵۲۳)۔

(136)ایضاحوالہٗ سابقہ (ج:ا، ص ۵۲۳)۔

(137)ایضا محولہٗ بالا، (ص ۵۲۳)۔

(138)منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:ا، ص:۵۷۵)۔

(139)ایضاحوالہٗ بالا، (ص:۵۷۶)۔

(140)ایضا محولہٗ بالا، (ص:۵۷۷-۵۷۹)۔

(141)البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، دار طوق النجاۃ، (ج ا، ص ۱۶، رقم الحدیث:۳۹)۔

(142)منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:ا، ص ۵۸۰-۵۸۳)۔

(143)ایضاحوالہٗ سابقہ، (ص ۵۸۳-۵۸۴)۔

(144) ایضا محولہ بالا، (ص۵۸۵-۵۸۶)۔

(145) منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص۵۷۸)۔

(146) حوالہ سابقہ، (ص۵۷۸)۔

(147) ایضا محولہ بالا، (ص۵۸۹، ۵۹۰)۔

(148) منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص: ۵۹۰، ۵۹۱)۔

(149) حوالہ سابقہ، (ص: ۵۹۱، ۵۹۲)۔

(150) ایضا محولہ بالا، (ص: ۵۹۳، ۵۹۴)۔

(151) منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص: ۵۹۴)۔

(152) حوالہ بالا، (ص: ۵۹۵، ۵۹۶)۔

(153) ایضا محولہ بالا، (ص: ۵۹۶، ۵۹۷)۔

(154) منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص: ۵۹۷)۔

(155) حوالہ بالا، (ص: ۵۹۹)۔

(156) ایضا محولہ بالا، (ج:۱، ص: ۶۰۱)۔

(157) منیب احمد، مولانا، ماہنامہ ''البلاغ''، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص: ۶۰۱)۔

(158) عبد الشکور ترمذی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء، (ج:۱، ص: ۶۰۲)۔

۳

بابِ سوم

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات

- فصل اول: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات
- فصل دوم: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور علم حدیث
- فصل سوم: تدریسی خدمات
- فصل چہارم: دار العلوم کراچی کی بنیاد و تاسیس
- فصل پنجم: بورڈ آف تعلیمات اسلام اور لاء کمیشن کی رکنیت

١

فصلِ اوّل

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات

﴿بابِ سوم: مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات﴾

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات متنوع ہیں، آپ نے فتاوی نویسی، تصنیفات، خطبات و مواعظ، مدارس کا قیام اور پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ میں عملی کوششیں کی، آپ کی ان خدمات کو ذیل میں مفصلا تحریر کیا جاتا ہے۔

فصل اول: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا فقہی مقام:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ پاکستان کے ایک مایہ ناز مفتی تھے، آپ نے اپنی زندگی میں جو اصلاحی، علمی، تدریسی اور ملی خدمات سر انجام دیں ان کی بدولت آپ کا شمار ملک کے نامور فقہاء و مفتیان عظام میں ہوتا ہے، آپ کے فقہی مرتبہ اور مقام کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں:

> "کسی بھی علم و فن میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرنے اور اپنے آپ کو خدمت دین اور خدمت خلق کے نقطہ نظر سے مفید بنانے کے لئے بڑے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علوم دین اور بالخصوص فقہ و فتویٰ میں جو مقام بلند عطا فرمایا وہ اللہ تعالی کی عطاء خاص کے علاوہ ظاہری اسباب میں اس طرز عمل کا نتیجہ ہے جو آپ نے اس سلسلے میں اختیار فرمایا اور اس طرز عمل کا خلاصہ احقر کی ناچیز رائے میں چار چیزیں ہیں؟ پیہم محنت، للٰہیّت، بزرگوں کی صحبت اور ان سے تربیت حاصل کرنے کا اہتمام اور غایت احتیاط ان چار باتوں کے مکمل اہتمام کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو فقہ اور فتویٰ میں وہ مقام بخشا جو ان کے معاصرین میں سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز تھا۔

''فقیہ النفس''،فقہاء کی ایک اصطلاح ہے،اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ سے کثرت ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمادیا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔

مجھ جیسے بے علم و عمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے،البتہ یہاں دو باتیں ضرور عرض کرنا چاہوں گا،ایک تو یہ کہ مصر کے معروف اور محقق عالم شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحب کو ''فقیہ النفس'' ہونے کا خطاب دیا تھا۔علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ وہ بزرگ ہیں جن کو ان کے تبحر علمی اور وسعت معلومات کی بناء پر اگر مصر کے علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فقہی مسئلے کی تحقیق میں ان کو خط لکھا تھا،اس خط کا جواب آیا اس کا کچھ حصہ والد صاحب نے اپنے رسالے ''آلہ مکبر الصوت'' میں شائع فرمایا ہے۔

اس مکتوب میں علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحب کے علم و فضل کی محض رسمی تعریف نہیں کی ۔بلکہ باقاعدہ آپ کو'' صحیح معنی میں فقیہ النفس'' کا خطاب دیا ہے،اور جو لوگ علامہ زاہد الکوثری کے تبحر علمی سے واقف ہیں،انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے الفاظ کو کسی تصنع یا مبالغے پر محمول نہیں کیا جا سکتا''[1]۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فتویٰ نویسی کی خدمت:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تادم حیات فتویٰ نویسی کی خدمت سرانجام دی،اس حوالے سے آپ کے علمی جانشین مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں:

''حضرت والد صاحب قدس سرہ سے اللہ تعالیٰ نے یوں تو دین کی بے شمار خدمتیں لیں،جن میں تدریس،تصنیف،وعظ،اصلاح وارشاد،اقامت دین اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے سیاسی جدوجہد وغیرہ۔لیکن ان تمام

خدمات میں سے وہ خدمت جو آپ کی زندگی کا جزء بن گئی تھی، فتویٰ کی خدمت تھی جو "مفتی" کے منصب پر فائز ہونے کے بعد شاید ایک دن کے لیے بھی نہیں چھوٹی، یہاں تک کہ زندگی کا آخری کام جو وفات سے چند گھنٹے پہلے انجام دیا، وہ بھی ایک استفتاء کا جواب تھا، دوسری خدمات اپنے اپنے وقت کے ساتھ مخصوص رہیں اور ان کی انجام دہی میں وقفے آتے رہے، لیکن فتویٰ کا کام سفر و حضر، صحت و علالت، مصروفیت و فراغت، تنگدستی و خوشحالی کسی بھی حالت میں نہیں چھوٹا، آپ سفر میں جاتے تو ڈاک کا ایک ضخیم پیکٹ ساتھ ہوتا اور چلتی ہوئی ریل میں بھی، جب کہ عام آدمیوں کے لئے لکھنا ممکن نہیں ہوتا، ڈاک کا جواب برابر جاری رہتا تھا"[(2)]۔

فتویٰ نویسی میں آپ کے شغف وانہاک کا سبب:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی کے ساتھ اپنے شغف اور انہاک کا سبب خود یوں بیان فرمایا:

" دینی خدمت کے جتنے شعبے ہیں، ان میں سے فتویٰ وہ شعبہ ہے جس کا فائدہ نقد ظاہر ہو جاتا ہے، انسان تصنیف کرتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے لوگ پڑھیں گے وہ اس پر عمل کریں گے یا نہیں! اس طرح وعظ و تقریر کرنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے بیان سے کوئی متاثر ہو کر اس کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرے گا یا نہیں! یہی حال تدریس کا ہے کہ طلبہ میں سے کتنے لوگ اس سے حقیقی فائدہ اٹھائیں گے؟ یہ معلوم نہیں ہوتا، اس کے برخلاف مفتی کے پاس عموماً وہی شخص سوال بھیجتا ہے جسے دین کی طلب ہوتی ہے اور جو مفتی کے فتوے کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے، اور عام طور سے اس پر عمل کر بھی لیتا ہے۔ اس لئے اس کا فائدہ اگرچہ بظاہر محدود ہے، لیکن نقد اور متعین ہے، اس کے علاوہ اس خدمت میں شہرت طلبی وغیرہ کے مکائد نفس دوسری خدمت کے مقابلے میں کم ہیں، اس لئے اس میں اجر و ثواب کی امید زیادہ ہے"[(3)]۔

آپ کے فتاویٰ کی تعداد:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ساری علمی زندگی فتاوی نویسی میں گذری، آپ نے بے شمار فتاوی تحریر کئے جن کا صحیح طور پر شمار تو مشکل ہے، البتہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے تخمینا کچھ مقدار تحریر کی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''یوں تو حضرت والد صاحب کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے جن میں ہر طرح کے سوالات کے جواب موجود ہیں''(4)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت اور فتویٰ نویسی کی مختلف جہات:

آپ کے فتاویٰ کی ہمہ گیری:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ و فقہی رسائل میں جیسے علماء واہل علم حضرات کے لئے بیش قیمت مواد موجود ہے، اسی طرح وہاں عام لوگوں کے لئے بھی رہنمائی موجود ہے، یہ کسی خاص شخص اور خاص طبقہ کو مد نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''ان رسائل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام سے زیادہ اہل علم کی رہنمائی کرتی ہیں، اور ان کا فائدہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جس موضوع پر وہ لکھے ہیں اس میں شریعت کا حکم اپنے دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے۔ بلکہ ان کے مطالعے سے نت نئے مسائل کا جواب تلاش کرنے کے لیے مستقل اصول استدلال واستنباط معلوم ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اس دور کے مفتی کے لئے بہترین راہ عمل سامنے آجاتی ہے''(5)۔

آپ کے فتاویٰ کی وسعت:

نیز آپ کے فتاوی و فقہی رسائل میں یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ یہ فتاوی صرف کسی خاص باب، یا وقتی ضرورت کو مد نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے، بلکہ مفتی صاحب نے ان میں وہ جواہر و لعل پر و دئے ہیں کہ جن سے تا قیامت استفادہ ہوتا رہے گا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''لیکن خاص طور سے عہد حاضر کے نئے فقہی مسائل پر آپ نے جو مفصل فتاویٰ یا مسائل تحریر فرمائے ان کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ اس پہلو سے حضرت والد صاحب کا کام کتنا وسیع، ہمہ گیر، ٹھوس اور مثبت ہے، ایمان اور طہارت سے لے کر میراث تک تقریباً ہر باب میں نئے مسائل پر آپ کے مفصل رسائل یا فتاویٰ موجود ہیں''[6]۔

فتاویٰ و فقہی رسائل میں تحقیق کا معیار:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاوی و فقہی رسائل میں صحیح معنی میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور آپ کی تحقیق کے معیار کے حوالے سے آپ کے صاحبزادے مفتی محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن سے جب کبھی استفادے کی نوبت آتی ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے کوئی اسلوب کافی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کی تحقیق حضرت والد صاحب قدس سرہ کے ذریعے قلمبند اور شائع کروادی، ورنہ اگر آپ وہ کام کر کے نہ جاتے تو بظاہر آج کسی کے بس میں نہ تھا کہ ان مسائل پر تحقیق کا وہ حق ادا کرتا، اور اس اطمینان بخش طریقے پر ان مسائل کا حل تلاش کرتا۔ اور جب میں یہ تصور

کرتا ہوں کہ ان مسائل کی تحقیق میں حضرت والد صاحب نے کتنی اولوالعزمی اور استقامت کے ساتھ کتنی محنت شاقہ برداشت کی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے (7)۔

بر صغیر کی اراضی کی شرعی حیثیت پر ایک منفرد تحقیق:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ میں تحقیقی اسلوب کی ذیل میں چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں، جن سے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے تحقیقی منہج کی وضاحت ہو جاتی ہے، پہلی تحقیق بر صغیر کی اراضی کے متعلق ہے، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"یہ سوال عرصے سے اہل علم کے درمیان زیر بحث تھا کہ بر صغیر کی اراضی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی ان پر جو مالکان صدیوں سے متصرف چلے آرہے ہیں۔ ان کا قبضہ شرعاً مالکانہ ہے یا نہیں؟ کیونکہ بہت سی زمینوں میں ایسا ہوا ہے کہ وہ حکومت کی ملکیت تھیں، اور جاگیر داروں کی حکومت کی طرف سے صرف لگان وصولی کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ لیکن طوائف الملوکی کے زمانے میں یہ زمیندار خود مالک بن بیٹھے اور ان جاگیر داروں پر مالکانہ تصرف شروع کر دیا، شرعاً یہ زمینیں اس طرح ان کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتیں، لیکن یہ معاملہ تمام زمینوں کا نہیں تھا، بلکہ بہت سے زمیندار واقعتہً مالک بھی تھے، اس لئے مسئلہ یہ تھا کہ ان زمینداروں کو مالک سمجھا جائے یا نہیں؟ اس کے علاوہ اگر زمینیں واقعتہً کسی کی ملکیت میں ہوں تو یہ سوال تھا کہ وہ زمینیں عشری ہیں یہ خراجی؟ ان تمام مسائل کی تحقیق اس بات پر موقوف تھی کہ ہندوستان کے مختلف خطے جس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئے، اس وقت مسلمان حکام نے ان کی زمینوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور بعد میں ان کے ساتھ معاملے میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں؟ یہ تحقیق اس لئے انتہائی پیچیدہ اور دشوار تھی کہ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے لے کر عہد حاضر تک بر صغیر پر سینکڑوں انقلابات آئے ہیں، اور یہ سارا خطہ کسی ایک وقت میں کسی ایک فاتح کے ہاتھوں فتح نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی حصہ کسی نے فتح کیا اور کوئی کسی نے، اب ان تمام خطوں کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ ابتداً

وہ کب فتح ہوئے تھے؟اور ان کے فاتحین نے زمینوں کے مالکان سے کیا معاملہ کیا تھا؟ وہ اپنی ملکیت پر برقرار رکھے گئے تھے؟ یا ان کے اراضی بیت المال میں داخل کر لی گئی تھیں؟ انہیں مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا یا نہیں؟ ایک ایسی مشکل تحقیق ہے کہ اسکے تصور ہی سے پتہ پانی ہوتا ہے۔

لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اپنی کتاب ''اسلام کا نظام اراضی'' میں ان سنگلاخ مباحث کو نہ صرف چھیڑا ہے۔ بلکہ ان کی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے مختلف نادر نایاب دستاویزات کے ذریعہ اس بات کی تحقیق فرمائی کہ کونسے فاتح نے اراضی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور اگر کسی کو جاگیر دی تو وہ کس قسم کی دی؟ پھر اراضی کی ملکیت اور ان کے عشری یا خراجی ہونے کی تحقیق کے لئے فقہ اور حدیث کی تمام متعلقہ کتب کو کھنگالا، اور انتہائی دیدہ ریزی اور ژرف نگاری سے ان کے فقہی اصولوں کو ہندوستان کے حالات پر منطبق کیا، یہ تمام کام آپ نے قیام پاکستان سے پہلے کیا تھا۔ پھر قیام پاکستان کے بعد اس کتاب میں مزید دو ابواب کا اضافہ فرما کر ان دقیق اور پیچیدہ مسائل کو از سر نو حل فرمایا "(8)۔

اوزان شرعیہ پر عمدہ تحقیقی کام:

ہندوستان کی اراضی کی شرعی حیثیت پر تحقیق کے علاوہ آپ نے اوزان شرعیہ پر بھی بہت ہی قابل قدر تحقیق کی ہے اور ان کی عہدِ حاضر کے اوزان کے اعتبار سے تحدید واضح کی، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اسی طرح ''اوزان شرعیہ'' کہنے کو تو چھوٹا سا رسالہ ہے جو کل 32/ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن ان بتیس صفحات نے عہد حاضر کے اہل علم، خاص طور پر اہل فتویٰ کے لئے جو سہولت میسر کر دی ہے وہ بسا اوقات ضخیم تصانیف سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس رسالے کا موضوع یہ ہے کہ شریعت میں بہت سے احکام کا مدار خاص اوزان اور پیمانوں پر ہے، لیکن عہد صحابہ رضی اللہ عنہ میں اور اس کے بعد فقہاء کے زمانے میں جو اوزان اور پیمانے

صاع، مد، اوقیہ، رطل وغیرہ کے نام سے رائج تھے، وہ آج کے پیمانوں سے یکسر مختلف تھے۔ ان پیمانوں کا موجودہ دور کے اوزان سے مقابلہ کر کے یہ بتانا ضروری تھا کہ صاع کتنے سیر کا ہوتا ہے اور موجودہ دور میں مد یا اوقیہ یا مثقال کا وزن کیا ہوگا؟ اگرچہ اس سے پہلے بھی ہندوستان کے متعدد فقہاء نے اس بارے میں اپنی اپنی تحقیقات مرتب فرمائی تھیں؟ لیکن ان تحقیقات میں اختلاف چلا آتا تھا، خاص طور پر فرنگی محل کے علماء کی رائے دوسرے اہل علم سے مختلف تھی، اور اس بنیاد پر حضرت مولانا عبدالحئ صاحب لکھنوی قدس سرہ جیسے وسیع النظر عالم کے فتاویٰ پر تھی۔ اب اس اختلاف پر محاکمہ بڑا پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انتہائی محنت اٹھائی، ایک ایک پیمانے کا خود وزن کیا۔ فقہاء نے درہم وغیرہ کا وزن جو کے دانوں سے مقرر کیا ہے، اور اس کی خاص صفات تحریر کی ہیں، ان خاص صفات کے دانوں کو تلاش کر کے ان کا موجودہ اوزان کے ذریعہ وزن کیا۔ اس کے لئے خود جنگل جا جا کر اصلی رتیاں توڑیں، اور ان سے حساب لگایا، یہاں تک کہ اختلاف کا اصل منشا پالیا جو حضرت ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''اب اس پر حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالحئ صاحب جیسے محقق اور ماہر عالم کے حساب میں اتنا عظیم الشان فرق کیسے آیا؟ سو غور کرنے سے خیال آیا کہ شاید موصوف نے صرف چار جو ایک رتی کا باہم وزن ہی فرمالیا ہے اور اس میں تفاوت نامعلوم ہونے کی بناء پر محسوس نہ ہوا۔ پھر اسی پر ستر اور سو جو کا حساب لگا کر درہم و مثقال کے وزن قائم فرمادیئے۔ ستر جو اور سو جو کو مجموعی طور پر وزن نہیں فرمایا، ورنہ یہ مغالطہ ہر گز نہ رہتا، چنانچہ اس خیال کے امتحان کے لئے چار جو اور ایک رتی کا وزن کیا تو اس خیال کی پوری تصدیق ہوگئی[9]۔

فتاویٰ نویسی کے لئے کثرتِ مطالعہ و جستجو:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ صرف کسی مسئلہ کی تحقیق یا فتوی نویسی کے لئے ہی مطالعہ و تحقیق نہ فرماتے، نہ ہی فقط انھیں مسائل کی تحقیق کرتے جو باقاعدہ پوچھے جاتے ہیں، بلکہ آپ گاہے بگاہے از خود مختلف قسم کے مسائل کے متعلق سوچ وبچار کر کے تحقیقی کام میں لگے رہتے اور اگر کوئی مشکل پیش آتی تو اسے آسان کرنے کا طریقہ بھی آپ کو خوب آتا تھا، مفتی محمد تقی عثمانی اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''احقر نے حضرت والد صاحب قدس سرہ سے خود سنا ہے کہ فقہ کے جوابواب مجھے جتنے زیادہ مشکل معلوم ہوئے۔ میں نے ان کی تحصیل میں اتنی ہی زیادہ کاوش کی، چنانچہ فرماتے تھے کہ مجھے شروع میں وقف کے مسائل سے زیادہ مناسبت نہیں تھی، اور جب کبھی وقف کا کوئی سوال آتا تو مجھے اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس کا علاج میں نے اس طرح کیا کہ وقف کے بارے میں جتنی کتابیں مجھے میسر آئیں ان کا باستیعاب مطالعہ کر لیا، فقہ کی متداول کتب کے علاوہ امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الوقف" اور "الاسعاف فی حکم الاوقاف" کا بھی مطالعہ کیا، یہاں تک کہ میری عدم مناسبت انشراح میں تبدیل ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے جن ابواب سے مجھے خصوصی مناسبت عطا فرمائی ان میں وقف بھی شامل ہے۔ اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کی کتابوں میں سے جس کتاب نے وقف کے مسائل کو سب سے زیادہ شرح وبسط وانضباط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ''وہ فتاویٰ مہدویہ'' ہے۔
>
> آج کل سہولت پسندی کی وجہ سے حال عام طور سے یہ ہو گیا ہے کہ فتویٰ نویسی کے لئے عموماً انہی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے جن کا سوال باقاعدہ آتا ہے، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وکاوش صرف انہی مسائل کی حد تک محدود نہ تھی جو آپ سے باقاعدہ پوچھے جاتے، اس کے بجائے آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق

طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی اور جب کبھی موقع ملتا آپ ان میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے، خواہ اس کے لئے آپ سے سوال نہ پوچھا گیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کا مطالعہ صرف شامی، عالمگیری یا اسی طرح کی معروف و متداول کتب تک محدود نہیں تھا، بلکہ آپ نے وہ کتابیں با قاعدہ پڑھی تھیں، جنہیں آج کل کے اہل علم کو چھونے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح السیر الکبیر" وہ کتاب ہے جو باقاعدہ فقہی ابواب پر مرتب نہیں ہے۔ اس کا اصل موضوع جنگ، و صلح، جہاد غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات وغیرہ ہے، لیکن ضمناً اس میں بہت سے اہم مسائل دوسرے ابواب سے متعلق بھی آ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والد صاحب نے اس کا مکمل طور پر یا اس کے بہت بڑے حصہ کا مطالعہ فرمایا تھا، چنانچہ بہت سے بظاہر غیر متعلق مسائل اس کے حوالے سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ "شرح السیر الکبیر" کے اس نسخے پر جو آپ کے مطالعے میں تھا، جابجا آپ کے قلم سے نوٹ لکھے ہوئے ملتے ہیں"[10]۔

شوق کتابت اور سرعتِ کتابت:

اہل علم کا قلم کے ساتھ بہت گہرا رشتہ ہے، کیونکہ قلم علم کی علامت ہے اور علم اور اس کی حفاظت کے ذوق و شوق کی دلیل ہے، اس حوالے سے استاد محترم، مولانا نور البشر صاحب رقم طراز ہیں:

"بہت سے نامور علماء ایسے گذرے ہیں جو بہت بڑے کاتب بھی تھے، مثلاً امام طبری رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے ۸۶ برس کی عمر پائی، بہت بڑے مصنف بھی تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ نے ان کے ایام بلوغ سے لے کر وفات تک کے ایام کو جمع کیا، پھر ان کی تصانیف کے اوراق کو ان ایام پر تقسیم کیا تو ایک دن کے حساب سے

چودہ اوراق بنے، ان کی بلوغت سے قبل کے چودہ سالوں کو نکال کر باقی بہتر سالوں کے دنوں کا حساب لگایا جائے تو کل اوراق تین لاکھ اٹھاون ہزار بنتے ہیں"(11)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے عالم دین تھے، آپ کی الماریاں کئی قسم کی یاداشتوں اور ڈائریوں سے بھری پڑی تھیں جنھیں آپ نے اپنے قلم سے محفوظ فرمایا تھا، آپ کو جہاں کوئی نادر کتاب یا رسالہ ملتا اور اس کی فوٹو اسٹیٹ کا کوئی راستہ ممکن نہ ہوتا تو آپ اپنے قلم سے ہی اسے محفوظ کر لیتے تھے، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح نگاروں نے اس قسم کے کئی واقعات نقل کئے ہیں، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"فقہ و فتویٰ کی عام کتابوں کے علاوہ آپ کو ان کتب اور رسائل سے بھی شغف تھا جو کسی خاص مسئلے کی تحقیق کے لئے لکھے گئے ہوں، چنانچہ آپ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل ابن عابدین، حضرت مولانا عبد الحیؒ صاحب لکھنوی، حضرت علامہ ظہیر احسن نیوی اور دوسرے علما کے مجموعہ ہائے رسائل بڑی احتیاط کے ساتھ رکھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، چنانچہ آپ کی فقہ کی الماری میں کئی خانے اسی قسم کے رسائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان پر آپ کے قلم کی لکھی ہوئی یاداشتوں اور نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض الماری کی زینت ہی نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے مطالعے میں رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران بارہا ایسا ہوتا کہ کسی موضوع پر بات چھڑتی تو آپ فرماتے "کہ فلاں عالم نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے"۔

اس قسم کے رسائل عام طور سے کبھی کبھار چھپتے ہیں، اور ایڈیشن ختم ہونے پر نایاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حضرت والد صاحب قدس کو جہاں کہیں اس طرح کوئی رسالہ ملتا، آپ اسے غنیمت سمجھ کر خرید رکھتے تھے، اور اگر خرچہ ممکن نہ ہوتا تو اسے نقل کرانے کا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ آپ کے پاس متعدد رسائل ایسے ہیں جنہیں خود آپ نے مصروفیات کے غیر معمولی ہجوم کے باوجود خود اپنے قلم سے نقل فرمایا ہے"(12)۔

ا۔ رسالہ "رد القبول الخائب فی القضاء علی الغائب" کی کتابت:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ قاسم قطلوبغا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک رسالہ "رد القبول الخائب فی القضاء علی الغائب" کی کتابت فرمائی، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں:

> "ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ میں آپ کا لاہور جانا ہوا، وہاں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس قاسم حنفی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "رد القبول الخائب فی القضاء علی الغائب" آپ کی نظر سے گزرا۔ جو اس مسئلے پر لکھا گیا ہے کہ اگر مدعا علیہ غائب ہو تو قاضی کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہ رسالہ بمبئی میں چھپا تھا، اور اب اس کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا، چنانچہ آپ نے اس سفر میں یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل فرمالیا جو آپ کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ بڑے پاکیزہ اور خوشنما عربی خط میں لکھا ہوا ہے، اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ۱۳۷۲ھ آپ کی مصروفیات کے شباب کا زمانہ ہے جس میں آپ ملک کے دینی، سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہے تھے، اور غالباً ایسے ہی کسی کام کے لئے لاہور تشریف لے گئے، ایسی مصروفیات کے عین درمیان ایک ایسے رسالے کو نقل کرنا جو ایک جزوی مسئلے کی تحقیق میں ہے اور جس کی کوئی فوری ضرورت بھی نہیں ہے، ایک ایسا اقدام ہے جو صرف طلب علم کے جذبہ بیتاب ہی کرا سکتا ہے"[13]۔

رسالہ "الکرامۃ والتقبیل" کی کتابت:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ "الکرامۃ والتقبیل" کی کتابت بھی فرمائی، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''اسی طرح محرم ۱۳۸۲ھ میں آپ عمرہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے، وہاں مدینہ منورہ میں کسی عالم کے پاس حضرت علامہ محمد عابد سندھی کا ایک قلمی رسالہ ''الکرامتہ والتقبیل'' آپ کی نظر سے گزرا جس میں دو مسئلوں کی تحقیق تھی، ایک یہ کہ اولیا کرام کی کرامات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پاؤں چومنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ علامہ سندھی کا یہ رسالہ علامہ موسیٰ جار اللہ کے قلم سے لکھا ہوا تھا، چونکہ کہیں اور اس رسالے کے ملنے کا امکان نہ تھا، اس لئے آپ نے وہیں پر خود اسے نقل کرنا شروع فرما دیا، یہاں تک کہ جب اس کے چودہ صفحات نقل فرما چکے تو مدینہ طیبہ کے معروف ترکی عالم شیخ محمود الرازی مد ظلہم نے دیکھ لیا اور پیشکش کی کہ میں کسی اور سے آپ کے لئے نقل کرادوں گا، چنانچہ باقی رسالہ انہوں نے نقل کروا کے دیا اور حضرت والد صاحب نے اسے مجلد کرا کر محفوظ فرما دیا''(14)۔

رسالہ "الفتویٰ فی الاسلام" کی کتابت:

آپ نے علامہ جمال الدین قاسمی کے رسالہ "الفتویٰ فی الاسلام" کو بھی اپنے قلم سے محفوظ فرمایا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ جمال الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب تفسیر قاسمی) کا ایک رسالہ ''الفتویٰ فی الاسلام'' آپ کی نظر سے گزرا جو فتویٰ کے اصول اور تاریخ پر بہترین رسالہ ہے، اس وقت خود نقل کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ آپ نے اسے مولانا مظہر بقا صاحب سے نقل کرایا''(15)۔

رسالہ "حیات القلوب" کی کتابت:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے "حیات القلوب" کی بھی کتابت فرمائی، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''حیات القلوب'' فارسی زبان میں حج کے مسائل پر بے نظیر کتاب ہے، یہ کتاب دار العلوم دیو بند کے کتب خانے میں والد صاحب کی نظر سے گزری تھی، لیکن نایاب ہو چکی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں امام المناسک حضرت مولانا شیر صاحب سندھی کے پاس تھا جو مدینہ طیبہ میں مقیم تھے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اس کتاب کو نقل کرنا چاہتے تھے، کتاب خاصی ضخیم تھی، اور فوٹو اسٹیٹ کی موجودہ سہولیات میسر نہ تھیں۔ آپ نے حضرت مولانا شیر محمد صاحب ہی سے فرمائش کی کہ نقل کا کوئی انتظام فرمادیں۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے مسائل حج کا امام بنایا تھا، اور انہی مسائل کی نشر و اشاعت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہوا تھا چنانچہ انہوں نے والد صاحب کی فرمائش کو اس شرط پر قبول فرمالیا کہ آپ اس کی اشاعت کا انتظام فرمائیں۔ یہ والد صاحب کی عین مراد تھی، چنانچہ آپ نے وعدہ کر لیا اور مولانا شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنے قلم سے اس کی نقل ایک بڑے رجسٹر میں کر کے حضرت والد صاحب کے پاس بھیج دی۔ آپ مسلسل اس کی طباعت کی فکر میں رہے، یہاں تک کہ ۱۳۹۱ھ میں بڑی محنت شاقہ اٹھا کر اسے خود اپنی نگرانی میں شائع کرایا''[16]۔

آپ کی فقہی ڈائری:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ایک علمی و تحقیقی شخصیت تھے، اس لئے آپ نے اہم مسائل کو محفوظ کرنے لئے ایک ڈائری اور یادداشت بنا رکھی تھی، جسے وقتاً فوقتاً استعمال کرتے تھے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''فتویٰ کے کام میں یہ صورتحال اکثر پیش آتی ہے کہ انسان کسی ایک مسئلے کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے، اور مطلوبہ مسئلہ ملنے سے پہلے اس میں بہت سے دوسرے کارآمد مسائل نظر آجاتے ہیں، لیکن چونکہ اس وقت ان کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے ان کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی، اور مطلوبہ مسئلے کی تلاش میں

انہیں نظر انداز کر کے گزر جاتا ہے۔ بعد میں جب کبھی ان مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے تو یاد آتا ہے کہ یہ مسئلہ کہیں دیکھا تھا، لیکن کیا اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس غرض کے لئے ایک ضخیم بیاض بنائی ہوئی تھی، اور اس کو فقہی ابواب پر مرتب کر کے ہر باب کے عنوان کے تحت کئی کئی صفحات سادے چھوڑ دیئے تھے، اور طریق کار یہ تھا کہ جب کبھی مطالعے کے دوران کوئی اہم مسئلہ یا نئی تحقیق پر نظر پڑتی تو اس کا خلاصہ یا کم از کم حوالہ اس بیاض میں متعلقہ باب کے تحت نوٹ کر لیتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ اس کی پابندی تو نہ کر سکا کہ جب بھی کبھی کوئی اہم مسئلہ یا تحقیق کہیں نظر پڑے تو اس کا حوالہ ضرور اس بیاض میں درج کر لیا کروں، لیکن ایک زمانے تک اکثر و بیشتر اس پر عمل کرتا رہا۔ اس طرح آپ کے پاس نادر یادداشتوں اور حوالوں کا بڑا گرانقدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، اور ضرورت کے وقت اس میں بہت سی کام کی باتیں یا مفید حوالے مل جاتے تھے[17]۔

فتویٰ نویسی میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے فتوی نویسی کی تربیت مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا انور شاہ کشمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے وقتاً فوقتاً حاصل کی تھی، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ کی اہلیت محض فقہی مسائل کو یاد کرنے یا فقہی کتابوں میں استعداد پیدا کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک مستقل فن ہے جس کے لئے ماہر مفتی کی صحبت میں رہ کر باقاعدہ تربیت لینے کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی نے اس طرح فتویٰ کی تربیت حاصل نہ کی ہو، اس وقت تک وہ خواہ دسیوں بار ہدایہ وغیرہ کا درس دے چکا ہو، فتویٰ دینے کا اہل نہیں بنتا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃاللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کسی ماہر مفتی سے تربیت لئے بغیر فتویٰ دینا مستند عالم کے لئے بھی جائز نہیں ہے، چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃاللہ علیہ نے مستقل "مفتی" بننے سے پہلے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ سے فتویٰ کی تربیت لی تھی، اور آپ کی وفات کے بعد بھی کوئی فتویٰ صرف اپنے دستخط سے روانہ نہیں کیا، بلکہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب یا حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری یا شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی میں سے کسی نہ کسی سے تصدیق وتوثیق ضرور کراتے تھے۔

چنانچہ اگر کسی شخص کے بارے میں والد صاحب کو اطلاع ملتی کہ اس نے کسی شیخ سے تربیت لئے بغیر خود بخود فتویٰ کا کام شروع کر دیا ہے، تو حضرت والد صاحب کو ان سے فتویٰ کے معاملے میں کبھی مناسبت نہ ہوتی، اور ان کی طرف سے افراط و تفریط کا ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا"[18]۔

مسئلہ کا جواب دینے میں احتیاط وتثبت:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃاللہ علیہ کو اپنی ذمہ داریوں کا خوب احساس تھا، ایک مفتی ہونے کے ناتے کسی کا سوال سننے اور اس کا صحیح صحیح جواب دینے میں جتنا بھی ہو سکتا آپ بہت احتیاط سے کام لیتے تھے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃاللہ علیہ کے پاس جہاں روزانہ ڈاک میں دسیوں استفتاء آیا کرتے تھے۔ وہاں صبح وشام ٹیلی فون پر مسائل معلوم کرنے کا سلسلہ بھی رہتا تھا اور سوال کرنے والے وقت بے وقت فون کرتے رہتے، مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ مدرسے میں پڑھتے تھے تو اس زمانے میں جب کسی مستفتی کا فون آتا تو حضرت والد صاحب رحمۃاللہ علیہ بذات خود ان سے بات کرتے تھے، اور اگر کبھی ہم نے فون پر سوال معلوم کر کے حضرت کے سامنے نقل کر دیا تو ہمارے ذریعے جواب دلوانے کے بجائے خود فون لے کر سوال دوبارہ سنتے اور بذات خود جواب دیتے

تھے کہ مبادا کہ ہم سے سوال سمجھنے میں کوئی غلطی نہ ہو گئی ہو یا جواب نقل کرنے میں کوئی بے احتیاطی ہو جائے۔اس کے بعد جب حضرت کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ ہم سوال کو ٹھیک سمجھ کر صحیح صحیح نقل کر دیتے ہیں،اور جواب میں تصرف نہیں کرتے تو معمول یہ ہو گیا کہ اگر ہم نے ٹیلیفون اٹھایا تو سوال معلوم کر کے حضرت سے ذکر کر دیا،آپ نے جواب دیا،اور ہم نے اسے فون پر بتا دیا۔عرصہ دراز تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا،ایک مرتبہ کسی صاحب کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے کوئی ایسی بات پوچھی جس کا جواب بالکل واضح تھا۔میں نے سوچا کہ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے اور اس کے لئے حضرت والد صاحب کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں،ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنی تن آسانی کو بھی دخل ہو،اور شاید نئے نئے فارغ التحصیل ہونے کی بناء پر علمیت کا گھمنڈ بھی اس کا سبب بنا ہو کہ میں نے حضرت والد صاحب سے یہ پوچھنے کے بجائے خود ہی ان کو جواب دے کر فارغ کر دیا،اور جب والد صاحب نے فون کے بارے میں پوچھا تو میں نے سوال وجواب دونوں نقل کر دیئے۔حضرت والد صاحب نے چند لمحے توقف کے بعد فرمایا:''خیر!جواب تو تم نے ٹھیک دے دیا،لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا''۔اس وقت مجھے اپنی حماقت کا شرمندگی سے احساس ہوا اور آئندہ کسی کو از خود جواب دینے سے توبہ کر لی،چنانچہ اس کے بعد کسی نے خواہ کتنی بدیہی بات پوچھی ہو والد صاحب سے پوچھے بغیر اس کو جواب نہ دیتا''[19]۔

فتویٰ نویسی میں خود رائی سے نفرت:

حضرت الاستاذ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب کو خود رائی سے نفرت تھی،وہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی یہ گرانقدر نصیحت بار بار سنایا کرتے تھے کہ ''جب تک تمہارے ضابطے کے بڑے موجود ہوں۔ان سے استصواب کئے بغیر کبھی کوئی اہم کام نہ کرو،اور جب ضابطے کے بڑے نہ رہیں تو اپنے معاصرین اور برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو،اور

وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرو۔'' چنانچہ ساری عمر والد صاحب کا عمل اسی کے مطابق رہا اور ہم نے تو ان کا وہی زمانہ پایا جس میں ان کے بڑے تقریباً رخصت ہو چکے تھے۔ معاصرین بھی کم تھے اور زیادہ تر چھوٹے ہی تھے، لیکن آپ ہر اہم فیصلے سے پہلے جو چھوٹے بڑے میسر ہوں ان سے مشورہ ضرور فرماتے تھے''[20]۔

نئے پیش آمدہ مسائل میں معاصرین سے استصوابِ رائے اور "مجلسِ تحقیق مسائل حاضرہ" کا قیام:

مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ایک ماہر مفتی تھے اس لئے آپ کے پاس نئے نئے سوالات کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا، آپ بڑی ہی احتیاط کے ساتھ مسائل کی تحقیق فرما کر اس کارِ خیر کو انجام دیتے، ان نئے مسائل کے جواب میں آپ صرف اپنی ہی رائے پر اکتفانہ کرتے، بلکہ معاصر علماء کی رائے اور ان کی مشاورت کو لازم سمجھتے تھے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس کے متعلق آپ کا طرز عمل تحریر فرماتے ہیں:

> "کسی نئے فقہی مسئلے کی تحقیق کرنی ہو تو اس میں اس بات کا ہمیشہ بہت لحاظ رکھتے تھے کہ دوسرے اہل علم کی رائے بھی سامنے آجائے، چنانچہ "فتاویٰ دار العلوم" اور "جواہر الفقہ" میں مختلف فقہی مسائل پر جو مستقل رسالے موجود ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کے آخر میں اس زمانے کے معروف اہل فتویٰ اور اہل علم کی تصدیقات ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ آپ نے حتی الامکان کوئی نئی تحقیق دوسرے اہل علم سے مشورے کے بغیر شائع نہیں فرمائی اور آخر سالوں میں تو آپ نے حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کے ساتھ اس غرض کے لئے کراچی کے اہل علم کی ایک باقاعدہ مجلس قائم فرما دی تھی جس کا نام ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' تھا اور اس کا کام ہی یہ تھا کہ وہ نو پیش آمدہ مسائل کی اجتماعی طور پر تحقیق کرے۔ اس مجلس کا اجلاس عموماً ہر مہینے ایک مرتبہ ہوتا تھا، کبھی دار العلوم میں اور کبھی جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن میں۔ اس اجلاس میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا مفتی رشید صاحب مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد اور دار العلوم اور نیوٹاؤن

کے خاص خاص اساتذہ شریک ہوتے تھے۔ ہم خدام بھی حاضر رہتے اور ان بزرگوں کی شفقت و عنایت کی انتہا تھی کہ ہمیں بھی کھل کر اپنے اشکالات و شبہات پیش کرنے کا موقع دیتے اور ہر بات پر پوری سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ غور فرماتے تھے۔ اور غالباً یہ حضرت تھانوی قدس سرہ کی مذکورہ بالا وصیت ہی کا اثر تھا کہ جب کوئی تحریر تیار ہوتی تو اس پر ہم جیسے خدام کے بھی دستخط کرائے جاتے تھے، حضرت والد صاحب کے تحریر فرمودہ فتوے پر ہم جیسوں کا ''الجواب صحیح'' لکھنا بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ ان کا حکم تھا جس کی تعمیل کی جاتی تھی''(21)۔

مسائل میں "تفرد" سے اجتناب:

فقہاء کے عرف میں "تفرد" (دوسرے علماء سے ہٹ کر کوئی ذاتی موقف اختیار کرنے) کو کہتے ہیں اور کسی مسئلہ میں کسی اہلِ علم کا "تفرد" اختیار کرنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں، تاریخ اسلام میں ایسے کئی علماء گذرے جو کسی نہ کسی مسئلہ میں جمہور سے "تفرد" اختیار کئے ہوئے تھے۔ مگر مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ باوجود ایک علمی شخصیت ہونے کے اپنے آپ کو حتی الامکان اس سے بچاتے تھے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب موصوف کا معمول یوں نقل فرماتے ہیں:

> '' فقہی معاملات میں اس قدر احتیاط جس شخص کا مذاق زندگی بن چکی ہو، وہ خود رائی و خود بینی سے کس درجہ دور ہوگا؟ چنانچہ آپ کو ''تفرد'' سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء کرام نے محقق ابن ہمام اور شاہ ولی اللہ جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ ان کے مقابلے میں بہت اہون ہے۔ چنانچہ اگر کبھی آپ کا ذہن کسی ایسی رائے کی طرف مائل ہوتا جو معروف نقطہ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں سے کسی کا قول اس کے موافق مل جائے، یا معاصر علماء اس رائے پر مطمئن ہو جائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اس وقت تک آپ عموماً اس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔

اس احتیاط کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' وہ کتاب ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے مصیبت زدہ عورتوں کی مشکلات کے حل کے لئے مرتب کروائی تھی اور اس میں بہت سے مسائل میں مالکی مذہب کے مطابق مصیبت زدہ عورتوں کی خلاصی کی راہ نکالی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف حضرت تھانوی قدس سرہ نے ابتداءً جن دو بزرگوں کے سپرد کی تھی ان میں سے ایک حضرت والد صاحب تھے اور دوسرے حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ لہٰذا حضرت والد صاحب اس کتاب کی تالیف میں شروع سے آخر تک براہ راست شریک رہے ہیں۔

اس سلسلے میں حجاز کے علمائے مالکیہ سے جو خط وکتابت کی گئی اس سے بھی اور اس کے علاوہ جتنے مراحل تالیف کے دوران پیش آئے، ان سب سے بھی حضرت والد صاحب پوری طرح باخبر رہے، لیکن حضرت تھانوی قدس سرہ اور حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحب کی وفات کے بعد جب حضرت والد صاحب کو اس کتاب کے بعض مقامات میں اجمال محسوس ہوا اور ان کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو باوجود یہ کہ حضرت والد صاحب بذات خود اس وضاحت پر مطمئن تھے اور اس کا پورا پس منظر بھی آپ کے سامنے تھا، اور اس وقت دنیا بھر میں ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے مسائل کے پورے پس منظر سے آپ سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔ لیکن آپ نے یہ گوارا نہیں فرمایا کہ محض اپنی رائے سے اس وضاحت کے مطابق فتویٰ دے دیں، بلکہ پہلے اس وقت کے اہل فتویٰ حضرات سے استصواب کیا اور اس کے بعد اپنی رائے ظاہر فرمائی''[22]۔

فتویٰ نویسی میں مصادرِ فقہیہ کی طرف مراجعت کا اہتمام:

مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو فتوی نویسی کے دوران مصادر کی طرف مراجعت کا بہت اہتمام تھا، فتوی لکھنے کے دوران آپ کو کسی مسئلہ میں ادنی ساشبہ بھی ہوتا تو آپ بغیر کتب کی مراجعت کے اور بغیر دلی اطمینان کے اس کا جواب نہیں دیتے تھے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''اس بات کا مشاہدہ ہم خدام نے بھی کیا کہ عمر کے آخری سالوں میں ضعف اور علالت کی بناء پر بار بار کتابوں کی مراجعت حضرت کے لئے ممکن نہیں رہی تھی، چنانچہ اکثر بیشتر آپ زبانی یا تحریری سوالات کے جواب مراجعت کتب کے بغیر ہی دیا کرتے تھے۔ بار بار یہ منظر بچشم خود دیکھا کہ فتاویٰ کی ڈاک کا ایک ڈھیر سامنے ہے اور جب جواب لکھنا شروع کیا تو لکھتے چلے گئے اور کسی بھی مسئلے میں مراجعت کتب کی ضرورت پیش نہیں آتی، البتہ جہاں ضرورت پیش آتی تو اس خاص فتوے کو الگ کر لیتے اور آپ کے دستی بیگ میں ایک بڑا لفافہ عموماً رکھا رہتا تھا جس پر ''غور طلب فتاویٰ'' کا عنوان درج تھا، جب کبھی کسی مسئلے میں شبہ ہوتا تو وہ اس لفافے میں چلا جاتا، پھر کسی فرصت کے وقت خود یا کسی اور کے ذریعے متعلقہ کتب کی مراجعت کے بعد اس کا جواب دیتے تھے۔

انہی غور طلب فتاویٰ کے سلسلے میں اس بات کا بارہا مشاہدہ ہوا کہ کتابوں کی مراجعت سے پہلے آپ ابتداً اپنا جو خیال ظاہر فرماتے، کتابوں کی طویل ورق گردانی کے بعد اس خیال ہی کی تائید ہوتی تھی اور اس وقت اندازہ ہوتا کہ اس سوال کو محض احتیاط کی خاطر روکا گیا تھا، ورنہ اس کا صحیح جواب اس مذاق سلیم کے پاس پہلے سے موجود تھا جو اللہ تعالیٰ نے کثرت ممارست سے وہبی طور پر پیدا فرما دیا تھا''[23]۔

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا فقہ میں ذوقِ سلیم:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے "فقیہ النفس" ہونے کے حوالے سے کچھ تفصیل گزر چکی ہے، اس کے ساتھ ساتھ موصوف کو اللہ تعالی نے ذوقِ سلیم بھی عطا فرمایا تھا، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی فقاہت، ذوق سلیم اور مزاج شریعت سے واقفیت کی بناء پر ابتداء ہی وہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے جو ایک عام عالم بیسیوں کتب کھنگالنے اور درجنوں عبارات کا مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ نکالتا، چنانچہ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں:

''جیسا احقر نے پہلے عرض کیا، مہینے میں ایک مرتبہ دارالعلوم کراچی، جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن اور اشرف المدارس کے حضرات اہل فتویٰ کی مجلس ہوا کرتی تھی جس میں مختلف غور طلب فقہی مسائل پر مشورہ ہوا کرتا تھا۔ اس مجلس میں کئی بار اس کا تجربہ ہوا کہ حضرت والد صاحب جو موقف اختیار فرماتے، وہ کتب فقہ کے ظاہر کے خلاف معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ہم جیسے اہل ظاہر اس پر اپنے اشکالات پیش کرتے رہتے، لیکن آخر میں کسی واضح دلیل سے ثابت ہو جاتا کہ بات وہی صحیح تھی جو حضرت نے ابتداً میں ارشاد فرمادی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت علیل تھے، مجلس کا دن آگیا، اور شرکائے مجلس دارالعلوم تشریف لے آئے، حضرت والد صاحب نے بذات خود شرکت سے معذرت فرمالی، لیکن ہم لوگوں سے فرمایا کہ کام ملتوی نہ کریں، چنانچہ ہم سب کام میں لگ گئے، اتفاق سے مسئلہ کوئی پیچیدہ قسم کا تھا، اور صبح سے شام تک کا پورا وقت اسی ایک مسئلے کی تحقیق اور اس پر بحث ومباحثہ میں گزر گیا۔ اس دوران تمام حاضرین نے فقہ وفتویٰ کی تمام متعلقہ کتابیں بھی دیکھیں، شروح حدیث کی طرف بھی رجوع کیا، اور شام کو تمام حضرات ایک فیصلے پر متفق ہوئے اور اس کی تائید میں کتب فقہ کی عبارتیں نقل کرلیں، البتہ پوری بحث کو قلمبند کرنے کا کام مؤخر کر دیا گیا۔ عصر کے بعد جب حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی تو آپ نے دن بھر کی کاروائی کا خلاصہ معلوم فرمایا، ہم جس نتیجے پر پہنچے تھے، ہم نے وہ

عرض کر دیا، حضرت نے سن کر فرمایا: ''نہیں یہ بات دل کو نہیں لگتی۔'' عرض کیا کہ ''تمام فقہی کتب سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا: ''دوبارہ غور کرنا چاہیے، یہ بات صحیح معلوم نہیں ہو رہی''۔ اس وقت چونکہ حضرت کی طبیعت ناساز تھی، اور طویل گفتگو مناسب نہ تھی، اس لئے ہم نے سوچا کہ کسی اور موقع پر عرض کریں گے، چنانچہ ایک روز جب کہ طبیعت نسبتاً بہتر تھی، ہم نے ان تمام کتابوں کے حوالے سے بات کرنی چاہی تو آپ نے وہ حوالے دیکھے بغیر کیسے فیصلہ فرمادیا؟

چنانچہ ہم نے مکرر عرض کیا کہ ''کتب فقہ کی یہ عبارتیں آپ ملاحظہ فرمائیں، ان سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔'' اس مرتبہ آپ نے قدرے تکدر کے ساتھ فرمایا ''نہیں بھئی، یہ بات بالکل غلط ہے اور اگر تم لوگ اس پر متفق ہو چکے ہو تو کم از کم میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔'' بات بظاہر بڑی عجیب تھی کہ نہ آپ وہ حوالے دیکھنے پر آمادہ تھے اور نہ اپنے موقف کے لئے دلیل بیان فرمارہے تھے۔ لیکن اس موقف پر خلاف معمول جزم اتنا تھا کہ اس سے سر موہٹنے کے لئے تیار نہ تھے آپ کا عام معمول یہ تھا کہ اگر ہم جیسے طفل مکتب بھی کوئی معقول بات کہہ دیتے تو اسے فوراً قبول فرمالیتے تھے اور دلیل کے مقابلے میں اپنی کسی رائے پر جمنے کا تو وہاں سوال ہی نہ تھا، للذا یہ طرز عمل ہمارے لئے عجیب اور حیران کن ضرور تھا، لیکن ساتھ ہی اس بات پر بھی یقین تھا کہ یہ جزم بلاوجہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب آئندہ مجلس میں تمام ارکان نے مسئلے پر مکرر غور کیا اور دوبارہ کتابیں دیکھنی شروع کیں تو آخر میں نتیجہ وہی نکلا جو حضرت والد صاحب کا موقف تھا، اور اس وقت اندازہ ہوا کہ اگر ہم اپنے سابقہ موقف پر قائم رہتے تو یہ کتنی سنگین غلطی ہوتی۔

بات یہ نہیں تھی کہ فقہاء کی جو عبارتیں بعد میں ہمارے سامنے آئیں، وہ پہلے سے حضرت کی نگاہ میں تھیں، بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے سابقہ فیصلے کو حضرت والد صاحب کے مذاق سلیم نے قبول کرنے سے

انکار کر دیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ محنت، للّٰہیّت اور بزرگوں کی صحبت و تربیت کے نتیجے میں اپنے خاص بندوں کے قلب کو وہ کسوٹی عطا فرما دیتا ہے جو صحیح و غلط کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے"[24]۔

فتویٰ نویسی کے معاملے میں آپ کے اسلوب کے چند اہم نکات:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ایک مفتی تھے اور ماہر فن تھے اس لئے آپ اس فن کی باریکیوں سے خوب واقف تھے، ذیل میں ہم فتوی نویسی کے متعلق مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج و مذاق کے متعلق چند نکات درج کرتے ہیں، جن سے فتوی نویسی میں آپ کا اسلوب واضح ہو جائے گا:

ا۔ماہر فقیہ کی صحبت اور تربیت:

''حضرت والد صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کر لینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں، ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ در حقیقت ''فقہ'' کے معنی ''سمجھ'' کے ہیں، اور فقیہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو، اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب سے بارہا سنی اور ایک آدھ مرتبہ اس کی تشریح و تفصیل بھی سمجھنی چاہی کہ وہ کیا باتیں ہیں جو محض مطالعے یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ لیکن والد صاحب نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر وہ باتیں بیان میں آسکتیں تو پھر انہیں سیکھنے کے لئے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی اب ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدون نہیں کیا جا سکتا، اور نہ متعین الفاظ میں ان کی تعبیر و تشریح ممکن ہے۔

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر ان کے اندر فکر و نظر کا مشاہدہ کیا جائے، اس طرح مدت کے تجربے اور مشاہدے سے وہ انداز فکر خود بخود زیر تربیت شخص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ بشر طیکہ جانبین میں مناسبت ہو، اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا چاہتا ہو"[25]۔

۲۔ تقلیدِ شخصی اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا معتدلانہ نظریہ:

"مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلید شخصی کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ اس دورِ ہوا و ہوس میں اِسی کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے، اور جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکے کا سوال آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے، کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو تو کم از کم ان کے مساوی تو ہو، اور آج اس مساوات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ ساتھ ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ "تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتظامی فتویٰ ہے"، جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لئے وزنی دلائل موجود ہیں لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے اختیار کرے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرلے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباع خداوندی کے بجائے اتباع نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔

لیکن چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں اس لئے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہدین کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ وصیت کی تھی اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے فرمایا کہ آجکل معاملات پیچیدہ ہوگئے ہیں اور اس وجہ سے دیندار

مسلمان تنگی کا شکار ہیں، اس لئے خاص طور سے بیع و شراء اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذاہب میں عام لوگوں کے لئے گنجائش کا پہلو ہو، اس کو فتویٰ کے لئے اختیار کر لیا جائے۔

لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لئے چند باتوں کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ واقعۃً مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت محقق ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر لیا جائے اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس اطمینان کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک مفتی خود رائی کے ساتھ فیصلہ نہ کرے، بلکہ دوسرے اہل فتویٰ حضرات سے مشورہ کرے اگر وہ بھی متفق ہوں تو اتفاق رائے کے ساتھ ایسا فتویٰ دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس امام کا قول اختیار کی جا رہا ہے، اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتویٰ علماء سے معلوم کی جائیں، محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفا نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اور ان کے نظر انداز کر دینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''عقد الجید'' میں ائمہ اربعہ سے باہر جانے کے مفاسد تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ بعض مصیبت زدہ خواتین کے لئے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے مالکی مذہب پر فتویٰ دینے کا ارادہ کیا تو ان تمام باتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ مد نظر رکھا اور براہ راست مالکی علماء سے خط و کتابت کے ذریعے مذہب کی تفصیلات معلوم کیں اور تمام علمائے ہند سے استصواب کے بعد فتویٰ شائع فرمایا"[26]۔

۳۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ردالمحتار" پر تبصرہ:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کر تے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں۔ اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو ان کو رفع کرنے کے لئے حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور حب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے۔ اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں ''تامل یا تدبر'' کہہ کر خود بری ہو جاتے ہیں، اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتاب سے مکمل شفاء نہیں ہوتی۔

لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ "ردالمحتار"، میں تو رہا ہے، مگر چونکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے "البحر الرائق" کا حاشیہ "منحۃ الخالق" اور "تنقیح الحامدیہ" بعد میں لکھا ہے، اس لئے ان کتابوں میں مسائل زیادہ منقح انداز میں آئے ہیں جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہو جاتی ہے۔

۴۔ فقہ حنفی کے متون اور ان کے الفاظ کی دلالات پر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ماہرانہ رائے:

'' فقہاء کرام نے فقہ کے جو متون مرتب فرمائے ہیں ان کی عبارتیں انتہائی جامع ومانع اور حشو زوائد سے پاک ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان متون میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے لئے اتنے ہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جتنے نا

گزیر ہوں، ان کا کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا بلکہ اس سے مسئلے کی کسی نہ کسی شرط کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء حنفیہ قرآن و سنت کی نصوص میں تو مفہوم مخالف کو حجت نہیں مانتے، کیونکہ قرآن و سنت کا اسلوب احکام کے بیان کے ساتھ ساتھ وعظ و تذکیر کے پہلو کو بھی ساتھ لئے ہوئے ہے اور اس میں بعض الفاظ اس نقطہ نظر سے بڑھائے جاتے ہیں، لیکن فقہاء کی عبارتیں صرف قانونی انداز کی عبارتیں ہیں۔ اس لئے ان عبارتوں میں مفہوم مخالف کا معتبر ہونا خود فقہاء حنفیہ نے تسلیم کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ فقہاء کے کلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے قانونی مقتضیات پر غور کر کے کوئی نتیجہ نکالا جائے۔ لیکن ان الفاظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں بعض اوقات کئی احتمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار کرنے میں ایک فقیہ اور مفتی کو اپنی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض حضرات کسی لفظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں اس کے لغوی مفہوم اور ٹھیٹھ منطقی نتائج کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے مسئلے کی علت اور اس کا صحیح سیاق پس پشت چلا جاتا ہے، اور بعض حضرات اس لفظ کے ٹھیٹھ منطقی نتائج پر زور دینے کے بجائے اس سیاق کو مد نظر رکھتے ہیں جن میں وہ بولا گیا ہے، خواہ اس سے لفظ کے منطقی نتائج پورے نہ ہوتے ہوں۔ ان دونوں میں سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق دوسرے طرز عمل کے مطابق تھا۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو سکے گی۔ فقہاء حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر نابالغ کا نکاح اس کے باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے خیار بلوغ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے ساتھ ہی در مختار وغیرہ میں ایک استثناء مذکور ہے کہ: "إذا عرف الأب بسوء الاختيار مجانة أو فسقا[27] (یعنی جب باپ فسق فجور اور لالچ کی وجہ سے اولاد کی بد خواہی میں معروف ہو تو یہ حکم نہیں ہو گا، بلکہ اس صورت میں اولاد کو خیار بلوغ حاصل ہو گا)۔

یہاں فقہاء نے صرف اتنا نہیں فرمایا کہ باپ اولاد کا بدخواہ ہو، بلکہ یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ اس بدخواہی میں معروف ہو، لہٰذا لفظ ''معروف'' کے قانونی مقتضیات پر عمل تو ضروری ہے، لیکن جو حضرات ان قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں لفظ کے ٹھیٹھ منطقی لوازم پر زور دیتے ہیں، انہوں نے اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی شخص کو ''معروف بسوء الاختیار'' (اولاد کی بدخواہی میں معروف) اسی وقت کہا جائے گا جب اس نے کم از کم ایک مرتبہ اپنی کسی اولاد کا نکاح بدخواہی سے صرف لالچ کی بناء کر دیا ہو اور جس شخص نے اب تک اپنی کسی لڑکی کا نکاح اس طرح نہ کیا ہو وہ ''معروف بسوء الاختیار'' نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا اگر کوئی باپ پہلی بار اپنی لڑکی کا نکاح لالچ سے کر رہا ہو تو وہ ''سیئ الاختیار'' تو ہے لیکن ''معروف بسوء الاختیار'' نہیں ہے، اس لئے اس کی لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر وہ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نکاح اسی طرح کرے تو چونکہ اب وہ ''معروف بسوء الاختیار'' بن گیا ہے۔ اس لئے دوسری لڑکی کو خیار بلوغ مل جائے گا۔

لیکن حضرت والد صاحب نے جواہر الفقہ کے ایک رسالے میں اس نقطہ نظر سے اختلاف فرمایا ہے، ان کا موقف یہ ہے کہ ''معروف بسوء الاختیار'' کی یہ منطقی تعبیر کہ جب تک کسی لڑکی کی کم از کم ایک بہن باپ کی بدخواہی کی بھینٹ نہ چڑھ چکی ہو، اس وقت تک اسے خیار بلوغ حاصل نہ ہوگا، اس سیاق کے بالکل خلاف ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، سیاق یہ ہے کہ اولاد کا خیار بلوغ باپ کو مظنونہ شفقت کے مد نظر ساقط کیا گیا تھا۔ لیکن جب فقہاء نے ''معروف بسوء الاختیار'' کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ بسوء اختیار کا فیصلہ محض کسی کی شخصی رائے سے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ باپ کی بدخواہی اتنی واضح ہونی چاہیئے کہ وہ لوگوں میں اس حیثیت سے معروف ہو[(28)]۔

۴۔ شریعت اور احکامِ شریعت کے متعلق مفتی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کا ماہرانہ تبصرہ:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ شریعت کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اور آپ اس بات سے بھی واقف تھے کہ شریعتِ مطہرہ چونکہ ہر خاص وعام، عالم و جاہل کے لئے ہے، اس لئے اس کے احکامات پر عمل کے لئے کسی قسم کی تدقیقات کا مکلف نہیں بنایا گیا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنے والد محترم کے فرمودات یوں نقل کرتے ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اسلامی چونکہ صرف شہریوں اور پڑھے لکھے افراد کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ان پڑھ دیہاتی اور دور دراز علاقے کا رہنے والا بھی اس کا اتنا ہی مخاطب ہے جتنا ایک تعلیم یافتہ انسان، اس لئے شریعت کے احکام میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے لمبے چوڑے حساب و کتاب، ریاضی کے باریک فارمولوں اور فلسفیانہ تدقیقات کی ضرورت پیش نہ آئے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اپنے مضامین میں بھی تحریر فرمائی ہے، چنانچہ رسالہ ''سمت قبلہ'' میں لکھتے ہیں:

''شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے تمام احکام کی بنیاد یسر و سہولت اور سادگی و بے تکلفی پر ہے، فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں، کیونکہ دائرہ حکومت اس شریعت کا تمام عالم کے بحر و بر، اسود واحمر، شہری و دیہاتی آبادیوں اور ان کے مکان پر حاوی ہے۔ اسلامی فرائض نماز و روزہ وغیرہ جس طرح شہریوں اور تعلیم یافتہ طبقات پر عائد ہیں۔ اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑ کے دروں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ و ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اس درجہ عام ہوں، ان میں مقتضاء عقل و حکمت و رحمت کا یہی ہے کہ ان کو تدقیقات اور قواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے، تاکہ ہر خاص و عام، خواندہ و ناخواندہ بآسانی اپنے فرائض انجام دے سکے۔ رمضان کے روزوں کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے، حسابات ریاضیہ پر نہیں، مہینے قمری رکھے گئے ہیں جن کا

مدار رؤیت ہلال پر ہے۔ شمسی مہینے جن کا مدار خاص حسابات ریاضیہ پر ہے، عام احکام شرعیہ میں ان کو نہیں لیا گیا، اسی طرح احکام اسلامیہ کے تتبع سے بکثرت اس کے نظائر معلوم کئے جا سکتے ہیں"(29)۔

ا۔ مستفتی کے سوال کے مقصد کو جاننا:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مستفتی کے سوال کے مقصد کو جاننا اور پہچاننا از حد ضروری ہے، اس لئے کہ بعض اوقات سوال کا مقصد جانکاری نہیں، بلکہ فتنہ پروری ہوتا ہے، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''جس طرح کسی مسئلے کا معلوم کرنا ایک اہم کام ہے۔ اسی طرح فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جس کے لئے بہت سی مفید باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں؟ اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں، بلکہ اپنے کسی مخالف کو زیر کرنا ہے، یا حالات ایسے ہوں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب ہوتا ہے، مثلاً ایک مرتبہ سوال آیا کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انہیں ایسا کرنا چاہیئے یا نہیں؟ سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ غالب گمان ہو گیا کہ اس استفتاء کا مقصد امام صاحب کو حق کی دعوت دینا یا فہمائش کرنا نہیں، بلکہ ان کی تحقیر اور ان کے بعض خلاف احتیاط امور کی تشہیر ہے۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کے ہیں، ان سے کہئے کہ وہ تحریراً یا زبانی معلوم فرمالیں اور اس طرح یہ ممکنہ فتنہ فرو ہو گیا''(30)۔

فتویٰ نویسی کے لئے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی خاص ہدایات:

فتویٰ نویسی ایک مشکل فن ہے اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت اس فن میں امام کی سی ہے، اس لئے ذیل میں فتویٰ نویسی کے متعلق مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی خاص ہدایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں، تاکہ اس سے ان کے فتویٰ نویسی کے اسلوب اور اس باب میں ان کے مذاق و مزاج پر روشنی پڑ سکے:

۲۔ بے مقصد سوالات کے جوابات دینے سے پرہیز:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے اس باب میں طرزِ عمل کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو، ان کی ہمت شکنی کی جائے، کیونکہ ایک عرصے سے لوگوں میں یہ مزاج ابھرا ہے کہ دین کے وہ عملی مسائل جن پر زندگی کی درستی اور آخرت کی نجات موقوف ہے، ان سے تو غافل اور بے خبر رہتے ہیں، اور بے فائدہ نظریاتی بحثوں میں نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں، بلکہ ان کی بنیاد پر باقاعدہ محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے سوالات کے جواب میں فتویٰ لکھنے کے بجائے ایسی نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پید ہو۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ "یزید کی مغفرت ہوگی یہ نہیں؟"، آپ نے جواب دیا "یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہیئے" ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کی کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا کہ "کیا وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہو گئے؟" آپ نے فرمایا۔ "مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف اطمینان نہیں ہوا میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟" غرض اگر عوام

کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضہ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پاگئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا یا نہیں؟ اصحاب کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟

آنحضرت ﷺ کے والدین مومن تھے یا نہیں؟ آپ کے فضلات طاہر تھے یا نہیں؟ اور والد صاحب کو اندازہ ہوتا کہ یہ سوالات بلاضرورت محض بحث ومباحثے کی خاطر پوچھے جارہے ہیں تو عموماً جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے تھے کہ:

''ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان و عمل کا مسئلہ موقوف نہیں، ان مسائل پر بحث ومباحثے میں وقت خرچ کرنے کے بجائے وہ کام کیجئے جو آخرت میں کام آئے'' اور بعض اوقات صرف اتنے جواب پر اکتفا فرماتے کہ ''نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''مِنْ حُسنِ إسلامِ المَرْءِ تَرْكُهُ مَا لا يَعْنِيْهِ"[31]، یعنی انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے"[32]۔''

۳۔اختلافی مسائل میں حتی الامکان جواب سے احتراز:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس بات سے واقف تھے کہ اختلافات کا حل مناظرے یا ایک دوسرے کے خلاف فتوی لکھنا نہیں ہے، بلکہ اس سے اختلاف کو مزید جلا ملتی ہے اور دوریاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے آپ ان مواقع پر بھی حکمت وبصیرت سے کام لے کر معاملہ کا تصفیہ کرنے کی کوشش کرتے، چنانچہ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ ملک میں ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے مسئلے پر بحث ومباحثہ کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ بستی بستی مناظرے منعقد ہونے لگے، اور فریقین کی طرف سے مناظرانہ کتابوں کا ایک انبار تیار ہو گیا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس مسئلے پر سوالات کی بھرمار ہوئی تو اس زمانے میں آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر سوال کسی ذی علم شخص کی طرف سے آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے کسی شبہے کو دور کرنا یا

واقعتہً علمی تحقیق کرنا ہے تو آپ اس کا جواب حسب ضرورت اجمال یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے، لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے ان کا جواب یہ دے دیتے کہ حیات النبی کے مسئلے کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس بحث میں پڑنے کے بجائے شریعت کے عملی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجئے"[33]۔

۴۔ فتویٰ کے بجائے مشورہ:

ایک عالم دین کا کام دینی معاملات میں لوگوں کو رہنمائی فراہم کرنا ہے، چاہے وہ فتوی کی شکل میں ہو، یا مشورہ کی شکل میں ہو یا وعظ تذکیر کی شکل میں ہو، اگر کوئی فتوی طلب کرے تو ضروری نہیں کہ اسے جواب فتوی کی ہی صورت میں دیا جائے، بلکہ اس کے مناسب حال جواب دیا جائے چاہے وہ مشورہ کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرز کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس فتوے کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا؟ چنانچہ بعض اوقات کسی مسئلے کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے، لیکن اس کی کھلی چھوٹ دے دینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی، اور لوگ اپنی حدود پر قائم نہیں رہیں گے ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو، اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتوے کے بجائے مشورے کے طور پر لکھنا چاہیے۔ ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ "فلاں عمل مناسب نہیں۔ یا درست نہیں۔" یا "اس سے پرہیز کرنا چاہیئے"[34]۔"

۵۔ زمانے کے بدلاؤ کا فتویٰ پر اثر:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس باب میں کیا نقطۂ نظر تھا، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

'' ایک مرتبہ فرمایا کہ اس قسم کے فتوے بعض اوقات زمانوں کے اختلاف سے بالکل بدل جاتے ہیں، اس کی بناء پر بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ علماء اپنی مرضی سے احکام شریعت میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ شرعی احکام کی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ حالات کے لحاظ سے نسخے اور تدبیر کی تبدیلی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ سے کسی نے کہا کہ ''حضرت! یہ کیا بات ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا تو اکابر علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کے فتوے دیئے۔ لیکن اب آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ مفاسد سے اجتناب کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات ارشاد فرمائی وہ لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ فرمایا کہ ''یہ شرعی حکم کی تبدیلی نہ تھی، بلکہ بات یہ ہے کہ جب کسی علاقے پر کسی وباء کے مسلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اطباء ایسی تدبیریں بتاتے ہیں جن سے اس وبا کو روکا جاسکے، لیکن جب وبا آجاتی ہے تو پھر معالجوں کی تدبیریں بدل جاتی ہے، اور اس وقت ایسے نسخے بتائے جاتے ہیں جن کے ذریعے وہ بیماری آنے کے بعد شفاء حاصل ہو، بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہوا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جدید علم وفنون یا کسی زبان کی تحصیل کو بذات خود کبھی کسی نے حرام نہیں کہا، لیکن اس وقت چونکہ علماء کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ علوم وفنون یا انگریزی زبان تنہا نہیں آئیں گے، بلکہ ملحدانہ عقائد ونظریات اور دین بیزاری کی وبا ساتھ لائیں گے جن کا مشاہدہ بعد میں سب کو ہو گیا، اس لئے شروع میں انہوں نے اس وبا کو روکنے کی تدبیر کی اور بہت سے مسلمانوں کو بچالیا لیکن جب یہ وباء عالمگیر ہو گئی

تو پھر تدبیر بدل گئی، اور وہ یہ کہ ان علوم وفنون یا اس زبان کو حتی الوسع ان بیماریوں سے پاک کر کے حاصل کرنے کی کوشش جائے۔ غرض یہ مختلف حالات تدبیریں تھیں، ٹھیٹھ معنی میں شرعی حکم کی تبدیلی نہیں"[35]۔

٦۔ جواب دینے میں فقہی اصطلاحات سے اجتناب:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی باریکیاں برقرار رہیں، اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فتویٰ نویسی کے انداز میں بھی عام روش سے ہٹ کر اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اہم تبدیلیاں فرمائی ہیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کو یہ بات بھی مد نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کے فتوے کو مخاطب ٹھیک ٹھیک سمجھ لے، اور نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو، پہلے زمانے میں چونکہ علم دین کا چرچا تھا اور علماء کی کثرت تھی، اس لئے لوگ علمی و فقہی اصطلاح واسلوب سے اتنے نامانوس نہ تھے، چنانچہ مفتی حضرات اپنے جوابات میں بلا تکلف فقہی اصطلاحات استعمال کر لیتے تھے۔ مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا تھا۔ اس لئے بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا، اور اگر کوئی بات خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے افراد موجود تھے جو اسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکیں۔ اب ہماری شامت اعمال سے حالت یہ ہو گئی ہے، کہ علم دین اور فقہ سے مناسبت باقی نہیں رہی، اور اہل علم کی تعداد بھی کم ہو گئی ہے، اس لیے اب اگر سوال کرنے والا کوئی عام آدمی ہو تو جواب کی عبارت اس کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیئے۔

مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملہ لکھتے رہے ہیں کہ "مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقے پر تقسیم ہو گا۔" اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر

پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوتا تھا، لیکن اب اگر یہ جملہ کسی گریجویٹ بلکہ پی ایچ ڈی کے سامنے بھی آجائے تو اس کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا، اور اب نہ لوگوں کو ''حقوق متقدمہ علی الارث'' کا مطلب معلوم ہے، اور نہ ان کے مصداق کا پتہ ہے، اس لئے حضرت والد صاحب نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی کہ:

''صورت مسؤلہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی، زیور، جائیداد یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر مرحوم کے ذمے کچھ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ بھی دین میں شامل ہے، اس کو ادا کیا جائے، پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر وارث کے حق میں کی ہو تو ایک تہائی (۱/۳) کی حد تک اس کے مطابق تقسیم کیا جائے''[36]۔

۷۔ فتویٰ میں احکام و دلائل میں امتیاز:

جن سوالات کا جواب تفصیلی ہوتا ہے عام طور پر اس میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ مسئلے کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات پورے فتوے کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا طرز اس سے کچھ مختلف تھا، اس حوالے سے آپ کا انداز اور طرز عمل مفتی محمد تقی عثمانی صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں:

''آپ فرماتے تھے کہ فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو، وہ بہ آسانی حکم معلوم کرلے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے۔ فتوے میں عام آدمی کے لئے صرف حکم ہی ہوتا ہے، اور دلائل اہل علم کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک عام آدمی کو فتوے کے شروع میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہونی چاہیئے کہ جس چیز کے بارے میں

سوال کیا گیا ہے اس کا مختصر جواب کیا ہے ؟اس جواب کے بعد اہل علم کے لئے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دے دیئے جائیں۔

چنانچہ حضرت والد صاحب کے فتوؤں میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ فتوے کے شروع یا آخر میں بالکل نمایاں اور ممتاز طریقے پر مسئلے کا واضح جواب لکھ دیتے ہیں اور زیادہ تر یہ جواب شروع میں ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ قدیم فقہاء اور مفتی حضرات کا طریقہ یہی تھا اور ایک روز احقر کو غالباً حضرت شاہ جلال صاحب تھانسیری کے بعض فتاویٰ دکھائے جو اپنے موضوع پر مفصل فتاویٰ تھے، لیکن ان کا طریقہ یہی تھا کہ سائل نے کسی چیز کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ: "هل يجوز؟" اس پر حضرت شاہ جلال صاحب نے شروع میں لکھا تھا: "الجواب: نعم، يجوز" اور اس کے بعد دلائل کی مفصل بحث فرمائی تھی، حضرت والد صاحب نے اس کو بطور مثال پیش کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب ہے کہ پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ایک ہی لفظ سے مل گیا۔ اب اگر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے اور نہیں پڑھنا چاہتا تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لئے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہیں"[37]۔

۸۔ جواب میں ترتیب و تہذیب:

سوال کرنے والا اپنی صلاحیت کے مطابق مافی الضمیر کو بیان کرتا ہے، کبھی آداب و ترتیب کا خیال رکھتا ہے اور کبھی نہیں، اس قسم کے سوالات کا جواب دینے کے متعلق آپ کا طرز مفتی محمد تقی عثمانی صاحب یوں بیان فرماتے ہیں:

"سوال بعض اوقات تہہ در تہہ ہوتا ہے، اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو گڈ مڈ کر کے پوچھتا ہے، ایسے مواقع پر حضرت والد صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ جواب میں پہلے سوال کا تجزیہ خود فرما لیتے اور یہ تنقیح فرما دیتے کہ اس

مسئلے میں فلاں فلاں باتیں قابل غور ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر نمبر وار بحث فرماتے تھے، اس طرح مسئلے کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتے تھے، اور مسئلے کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہتی تھی"[38]۔

۲

فصلِ دوم

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور علمِ حدیث

فصل دوم: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور علم حدیث

علومِ اسلامیہ میں دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ علمِ حدیث کو بہت اہمیت حاصل ہے، یہ اہمیت اس لئے بھی ہے کہ حدیث شریف مآخذ شریعت میں سے قرآن پاک کے بعد دوسرا بڑا مأخذ ہے، اس علم میں کمزوری کسی فقیہ کے لئے روا نہیں، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ایک جید مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ محدث بھی تھے، علمِ حدیث میں آپ کی تدریسی وتالیفی خدمات آپ کی اس علم میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں، ذیل میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمِ حدیث میں خدمات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا علومِ حدیث میں اشتغال اور آپ کے اساتذہ کا آپ پر اعتماد:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے علومِ حدیث میں اشتغال واعتناء اور اس علم میں آپ کے خصوصی ومشفق اساتذہ کرام کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی رقمطراز ہیں:

> "علم حدیث وہ علم ہے جس کے بارے میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ:
>
> "اس سے میرا اشتغال بہت کم رہا"۔
>
> لیکن حضرت کی یہ حسرت ان کے اپنے مقام کے اعتبار سے تھی، ورنہ اس علم میں بھی آپ سے ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ ہم طالب علموں کو حیرت ہو جاتی تھی۔
>
> سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے علم حدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا جن کو اپنے زمانے کا حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

دورۂ حدیث بڑے ذوق وشوق اور اہتمام کے ساتھ پڑھا، اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بخاری اور تقریر ترمذی درس کے دوران ہی عربی زبان میں قلم بند فرمائی۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی محبت تھی اور درس کے دوران آپ سے خصوصی خطاب فرمایا کرتے تھے، والد صاحب نے بارہا سنایا کہ:

ایک مرتبہ درس کے آغاز میں، میں نے کسی حدیث پر بحث کے دوران یہ سوال کیا کہ:

''حضرت! یہ تو ثقہ کی زیادتی ہے، اس لئے مقبول ہونی چاہیے۔''

حضرت شاہ صاحب نے اس پر مفصل تقریر فرمائی اور بتایا کہ: ''زيادة الثقة مقبولةٌ'' کا قاعدہ[39] اتنا عام نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جاتا ہے، اور حافظ زیلعی نے ''نصب الرایہ'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور اس کے اصول بتائے ہیں"[40]۔

والد صاحب فرماتے ہیں کہ:

"احقر کو اطمینان ہو گیا لیکن اس کے بعد پورے سال یہ معمول رہا کہ جہاں کسی ثقہ کی زیادتی پر کوئی جرح ہوتی، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجھے خطاب کر کے فرماتے: کہاں گیا وہ ثقہ کی زیادتی والا؟''[41]۔

علم حدیث کے حصول کے دوران اپنے اساتذہ کی تقاریر کا ضبط:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے دوران تعلیم حدیث کے اسباق میں اپنے اساتذہ کی تقاریر ضبط کرنے کا بھی اہتمام کیا تھا، جس سے آپ کا علمِ حدیث میں شوق وذوق نمایاں نظر آتا ہے، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بخاری جو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ضبط فرمائی تھی وہ تو کسی ''صاحب ذوق'' کی بدمذاقی کی نذر ہو گئی۔ البتہ تقریر ترمذی محفوظ رہی۔ بعد میں جب ''العرف الشذی'' اور ''الکوکب

الدری'' چھپ کر آئیں تو حضرت والد صاحب نے احقر کے عم محترم حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق استاذ حدیث دار العلوم دیوبند سے اس کو صاف نقل کرایا اور اس کے حواشی پر ''العرف الشذی'' اور ''الکوکب الدری'' کی زائد باتیں نقل کروادیں۔

اس طرح یہ ایک بڑا مفید مجموعہ تیار ہو گیا ہے اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ نے ایک مرتبہ اسے خصوصی فرمائش کر کے منگوایا، اور اس سے استفادہ فرمایا۔ احقر نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اسے شائع کرنے کی درخواست کی تو فرمایا کہ اس پر نظر ثانی کر کے دیکھنا ہے کہ ''العرف الشذی''، ''الکوکب الدری'' اور ''معارف السنن'' کے منظر عام پر آجانے کے بعد اس کی اشاعت مفید بھی ہو گی یا نہیں، لیکن پھر اس کی نوبت نہ آسکی"[42]۔

۳

فصلِ سوم

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تدریسی خدمات

فصل سوم: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تدریسی خدمات

تدریس علوم حدیث:

علوم حدیث کی تحصیل کے بعد آپ نے جب درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تو دوسرے علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ حدیث اور علوم حدیث کی تدریس بھی آپ کے حصہ میں آئی، چنانچہ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے علم حدیثِ کی تدریس کا آغاز کیا اور ڈابھیل میں بھی تدریس کی، پھر پاکستان ہجرت کے بعد دارالعلوم کراچی میں علوم حدیث کی تدریس کی خدمات سرانجام دیں، حدیث شریف کی جو کتب آپ کے ہاں زیر درس تھیں، ان میں کتب ستہ، موطاامام مالک، موطاامام محمد اور شرح معانی الآثار شامل ہیں، مفتی محمد تقی عثمانی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کافی عرصے تک حضرت والد صاحب قدس سرہ کو حدیث کی تدریس کی نوبت نہیں آئی اور پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کی تحریک پر آپ نے دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث شروع فرمایا جس کا واقعہ میں اپنے دوسرے مضمون حضرت کے شیوخ واکابر میں لکھ چکا ہوں۔ چنانچہ یہاں آپ نے شروع میں موطاامام مالک، موطاامام محمد، سنن نسائی اور طحاوی شریف کا درس دیا۔
>
> اس زمانے میں ابو داؤد کا درس حضرت میاں صاحب مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہ کے سپرد تھا۔ ایک مرتبہ آپ علیل ہو گئے تو ان کی جگہ آپ نے ابو داؤد کا درس دیا۔ اس کے بعد کئی سال تک یہ سلسلہ رہا کہ ابو داؤد کا آغاز حضرت میاں صاحب فرماتے اور ابتدائی چند ابواب کے بعد اس کی تکمیل حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ عملاً یہ درس بھی سالہا سال آپ کے پاس رہا۔

دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ (جو اس وقت ڈابھیل میں صحیح بخاری کا درس دیتے تھے) علیل ہوگئے تو آپ نے اپنی جگہ صحیح بخاری کی تدریس کے لئے حضرت والد صاحب کا انتخاب فرمایا، چنانچہ آپ ڈابھیل تشریف لے گئے ور حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم مقام کی حیثیت سے وہاں چند ماہ صحیح بخاری کا درس دیا۔

پاکستان بننے کے بعد جب آپ نے دارالعلوم کراچی کی بنیاد ڈالی تو گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر سال حدیث کا کوئی نہ کوئی سبق آپ نے اپنے پاس رکھا۔ دارالعلوم کراچی کے سب سے پہلے سال یہاں دورہ حدیث کا انتظام نہ تھا۔ اس سال مشکوٰۃ شریف آپ ہی نے پڑھائی اور اس کے بعد جب دورہ حدیث کا آغاز ہوا تو اپنی ہمہ جہتی مصروفیات کے سبب بخاری شریف کی تدریس آپ کے لئے ممکن نہ تھی، اس لئے عموماً مؤطا امام مالک آپ پڑھاتے رہے۔ لیکن جب دارالعلوم کورنگی میں منتقل ہوا اور آپ ملکی مصروفیات سے کنارہ کش ہوگئے تو پھر صحیح بخاری کا درس کئی سال تک آپ کے پاس رہا"(43)۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی چند خصوصیات:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک محقق محدث تھے، آپ کی تدریس کا انداز روایتی تدریسی انداز سے قدرے مختلف تھا، آپ کے درس کی خصوصیات کے حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

ا۔ حدیث کے عملی پہلوؤں کی طرف توجہ:

"چونکہ حدیث میں آپ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے شاگرد رشید تھے، اس لئے درس حدیث میں تحقیقی مذاق آپ کو اپنے شیخ سے ورثے میں ملا تھا۔ لیکن آج کل ایسا بکثرت ہونے لگا ہے کہ تحقیقی مباحث کے پھیلاؤ میں حدیث کا متن، اس کے معانی و مطالب، اس کا اصل پیغام اور اس سے حاصل ہونے والے

عملی فوائد پس پشت چلے جاتے ہیں استاذ و طالب علم کی تمام تر توجہ فقہی اختلافات، سند کی بحثوں اور رواۃ کی جرح وتعدیل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ اس رجحان کے سخت خلاف تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اس طرز عمل کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کچھ لوگ آم کے درخت کے نیچے جمع ہو کر آم کی تاریخ اس کی مختلف قسموں اور اس کے رنگ وبو پر بحث کر کے اٹھ جائیں اور انھیں عمر بھر آم کھانے کی توفیق نہ ہو۔ چنانچہ اس طرز عمل کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو حدیث کے متعلقہ مشہور فقہی اور اسنادی مباحث تو یاد ہو جاتے ہیں، لیکن متن حدیث یاد نہیں ہوتا، اور بعض اوقات نہ اس کا صحیح ترجمہ کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے عملی مسائل میں اس حدیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟ حالانکہ حدیث کو پڑھانے کا اصلی مقصد یہی تھا اور باقی تمام مباحث اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہ درس میں تحقیقی مباحث کے ساتھ اس پہلو پر بھی پوری اہمیت کے ساتھ زور دیتے تھے"(44)۔

۲۔ حدیث سے زندگی کے عام مسائل کا استنباط:

"اللہ تبارک وتعالی نے حضرت کو فقہی مزاج عطا فرمایا تھا، اس لئے احادیث سے زندگی کے عام مسائل کے بارے میں جو ہدایت ملتی ہیں ان کے استنباط کا آپ کو خصوصی ذوق تھا اور آپ کے درس میں بیٹھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جن احادیث کو ہم روز مرہ پڑھتے ہیں اور ان کو محض کسی مشہور فقہی مسئلے سے متعلق سمجھ کر گزر جاتے تھے، ان میں دوسری ضمنی ہدایت کا کیا جہاں پوشیدہ ہے؟ حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "فتح الباری" میں، علامہ نودی رحمۃ اللہ علیہ نے "شرح مسلم" میں شرح حدیث کے اس پہلو کا بھی حق ادا کیا

ہے، وہ جہاں حدیث کے مرکزی موضوع پر مفصل بحث کرتے ہیں وہاں ان سے حاصل ہونے والی دوسری ہدایت پر بھی ''وفیہ''، ''وفیہ'' کہہ کر متنبہ فرماتے جاتے ہیں۔

مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معروف حدیث صحاح میں موجود ہے کہ :

«كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَسْمُرُ مَعَ أَبِي بَكْرٍ فِي الأَمْرِ مِنْ أَمْرِ المُسْلِمِيْنَ وَأَنَا مَعَهُمَا»[(45)].

یعنی رسول کریم ﷺ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے عشاء کے بعد مسلمانوں کے کسی معاملے میں گفتگو فرمایا کرتے تھے، اور میں بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ ہوتا تھا۔

اس حدیث کا اصل موضوع یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی دینی ضرورت درپیش ہو تو عشاء کے بعد گفتگو کرنا جائز ہے، چنانچہ یہ حدیث عموماً ''سمر بعد العشاء'' عشاء کے بعد باتیں کرنے کے باب میں مذکور ہوتی ہے، اور یہی مسئلہ اس میں زیر بحث آتا ہے، لیکن اس مسئلے کی توضیح کے بعد حضرت والد صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ :

''یہاں یہ بات بطور خاص دیکھنے کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں نہیں فرمایا کہ آنحضرت ﷺ مجھ سے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرماتے تھے، بلکہ یہ فرمایا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح حضرت فاروق اعظم نے یہ ادب سکھایا کہ جب کبھی ایسے کام کا تذکرہ کرنا ہو جو تم نے اپنے کسی بڑے کے ساتھ مل کر کیا ہو تو یوں نہ کہو کہ یہ کام میں نے اور میرے فلاں بزرگ نے مل کر انجام دیا، کیونکہ اس میں دونوں کی برابری کا شبہ ہوتا ہے، اس کے بجائے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ فلاں بزرگ نے یہ کام کیا اور میں بھی ان کے ساتھ تھا فرمایا کہ آج کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ذرا کسی کام سے کسی کا دامن چھو جائے تو اسے بلا شرکت غیرے اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حضرات صحابہ کرام

رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ کوئی کام واقعتہً خود کیا ہو تو بھی اسے اپنے بجائے اپنے کسی بڑے کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش فرماتے تھے''(46)۔

۳۔ درسِ حدیث میں روایۃً ودرایۃً کی تفریق کے متعلق آپ کا نقطۂ نظر:

اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آج کل اکثر بیشتر مدارس میں درس حدیث کا یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ حدیث کے جو ابواب مفصل فقہی اور اختلافی مباحث پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں تو تقریر بڑے زور شور ہوتی ہے لیکن ان کے مخصوص ابواب کے بعد درس اتنی تیزی سے چلتا ہے کہ طلبہ حدیث کے مفہوم سے بھی بے خبر رہتے ہیں، چنانچہ فضائل ومناقب، آداب واخلاق، سیر ومغازی فتن اور اشراط الساعۃ اور تفسیر جیسے ابواب عموماً اس طرح گزر جاتے ہیں کہ طالب علم استاذ کے سامنے ضروری تلاوت کرلیتا ہے، اور بس!

حضرت والد صاحب قدس سرہ اس طرز عمل کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

"درس حدیث میں ''روایۃً اور درایۃً کی تفریق عہد حاضر کے لیے بدعت ہے۔ اسلاف میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ بعض ابواب پر بحث کے دوران انتہا درجے کی تحقیق کا مظاہرہ کیا جائے اور بعض کو تشریح مفہوم کے قابل بھی نہ سمجھا جائے۔ اس کے بجائے درس شروع سال سے معتدل انداز سے ہونا چاہیئے کہ تمام ابواب کے تحت ضروری معلومات طالب علم کے سامنے آجائیں اور درس حدیث کا اصل فائدہ حاصل ہو''(47)۔

۴۔ تحقیق ونظر کی صلاحیت پیدا کرنا:

"حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ درس حدیث میں جو فقہی اختلافات اور ان کے مفصل دلائل بیان کئے جاتے ہیں، ان کا مقصد جہاں اپنے مسلک کے دلائل کی وضاحت اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے، وہاں اصل

مقصد طالب علم میں تحقیق و نظر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تاکہ اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حدیث سے مسائل واحکام کا استخراج متعارض احادیث میں تطبیق اور احادیث میں صحیح وسقم کی تحقیق کن اصولوں کے تحت کس طرح کی جاتی ہے؟ چنانچہ سال بھر تک اس قسم کے مباحث طالب علم کے سامنے آتے رہتے ہیں تو اس سے ایک مزاج پیدا ہو جاتا ہے جس کے ذریعے وہ آئندہ اپنی بساط کے مطابق تحقیقی کام کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان مباحث کے دوران استاذ کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھتا رہے کہ طالب علم میں یہ مزاج پیدا ہوا کہ نہیں، استاذ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنا طالب علم کی کامیابی کے لئے ضروری نہیں۔ لیکن جن اصولوں کے تحت یہ مباحث ہوتے ہیں ان کا محفوظ ہو جانا ضروری ہے''[(48)]۔

۵۔ فقہی واجتہادی اختلافات کے متعلق آپ کی رائے:

"اور چونکہ ان مباحث کا مقصد وہ ہے جو اوپر بیان ہوا، اس لئے ان مباحث میں جو مسائل ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات سے متعلق ہیں، ان کو بیان کرتے وقت یہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہیئے جیسے حق و باطل کے درمیان معرکہ درپیش ہے۔ یہ اختلافات مکمل طور سے اخلاص اور علمی دیانتداری پر مبنی ہیں۔ اور ان کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطاء'' اور دوسرے کے مسلک کو ''خطا محتمل الصواب'' قرار دیا جائے۔

لہٰذا ان مسائل پر گفتگو کے دوران فریق ثانی کے احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھنا لازمی ہے اور اس سلسلے میں مناظرانہ انداز سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔ جو حضرات جوش تقریر میں امام بخاری، امام دارقطنی، امام بیہقی، یا حافظ ابن حجر کی تردید کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیتے ہیں جو ان حضرات کے شایان شان

نہیں ہوتے، حضرت والد صاحب ان پر سخت نکیر فرمایا کرتے تھے، اور اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ:

''حافظ ابن حجر ہوں یا علامہ عینی'' یہ سب حضرات صدیوں پہلے جنت میں اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں، ان کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو"(49)۔''

٦۔ مسلکی تعصب سے بیزاری:

"اسی طرح حضرت والد صاحب قدس سرہ اس طرز عمل کے بھی سخت مخالف تھے کہ کسی خاص مسلک کا دفاع کرتے ہوئے کسی حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر اس مسلک پر فٹ کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے دوراز کار تاویلات کا راستہ اختیار کیا جائے۔

اس کے بجائے آپ کا طرز یہ تھا کہ اگر قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں حدیث کی کوئی بے تکلف توجیہ ہو سکتی ہو تو اسے اختیار کیا جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو واضح طور پر یہ اعتراف کر لیا جائے کہ اس سے فلاں مجتہد کا مسلک ثابت ہوتا ہے، البتہ اس کے مقابلے میں اپنے امام کی دلیل اور ان کے قول کا ماخذ بھی بیان کر دیا جائے، اور اس کی جو بے تکلف وجوہ ترجیح موجود ہوں انھیں واضح کر دیا جائے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ائمہ مجتہدین کا اختلاف تو ہوا ہی اس مقام پر ہے جہاں دلائل کی رو سے دونوں راہوں کی گنجائش موجود ہوتی تھی، لہٰذا یہ ثابت کرنے کی فکر کہ دوسرا مسلک بلادلیل ہے، بڑی نادانی کی بات ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دلائل دونوں طرف موجود ہیں، اور کسی ایک مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں دلائل متعارض ہوں، اس لئے اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ مان لیا جائے یہ شافعیہ یا حنابلہ یا مالکیہ کے

مسلک پر دلالت کرتی ہے تو یہ واقع کے عین مطابق ہو گا، کیونکہ اگر اس مسلک پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہ حضرات اسے اختیار ہی کیوں فرماتے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ میں نے ۵۴ھ میں جو پہلا حج کیا تو وہاں حرم مکی میں حدیث کے مختلف درس ہوا کرتے تھے، ان میں شرکت کی تو ان کا طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ حدیث میں تاویلات کرنے کے بجائے ایک ہی باب کی مختلف احادیث آئیں تو ایک حدیث کے تحت فرماتے: ''**فيه حجة ساداتنا المالكية**''، پھر اس کے مخالف دوسری حدیث آتی ہو تو فرماتے: ''**فيه حجة ساداتنا الحنفية**'' (50)۔

تدریسی زندگی کی ابتداء:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تدریسی زندگی کی ابتداء کے متعلق مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تدریس کا سلسلہ دار العلوم دیوبند میں ابتدائی کتابوں سے شروع فرمایا، پھر سالہا سال اوپر کے سب درجات میں تمام علوم وفنون اپنے باکمال اساتذہ کے زیر سایہ پڑھائے۔ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ:

''دار العلوم کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹے کی پابندی تھی مگر میں روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا'' (51)۔

درس حدیث اور انتہائی درجات کی کتب کی تدریس:

ابتدائی کتب کی تدریس کے بعد آپ نے انتہائی درجے کی کتب کی تدریس بھی کی، مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"بآلاخر بزرگوں کی خواہش وایماءپر آپ کو درجہ علیا(دورہ حدیث) کے اساتذہ میں شامل کر لیا گیا۔ جس کا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جب سلہٹ میں تشریف فرما تھے وہاں حدیث پڑھانے کے لئے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی جس کے لئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو بذریعہ خط دعوت دی، آپ نے عذر کیا کہ ''اس وقت تک دار العلوم میں مجھے کبھی حدیث پڑھانے کا اتفاق نہیں ہوا، میرا مشغلہ زیادہ تر ادب اور دوسرے فنون رہے۔''اس پر تقاضے کا خط آیا کہ ایسا کیوں کیا؟ حدیث کی تعلیم کو ضروری سمجھو، پھر دیوبند تشریف آوری کے وقت دوبارہ تقاضا فرمایا، آپ نے عرض کیا'' جہاں استاذ محترم حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث دیتے ہوں وہاں ایسا احمق کون ہوگا جو مجھ سے حدیث پڑھنے کو گوارا کرلے۔''فرمایا کوئی نہ کوئی کتاب حدیث کی ضرور پڑھایا کرو۔'' بارہا تقاضا فرمایا۔ بآلاخر دار العلوم کی طرف سے سب سے پہلے "موطا امام مالک" کا درس آپ کے سپرد ہوا اس کے بعد دورہ حدیث کی دوسری کئی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی''[(52)]۔

درس سنن ابوداؤد:

درجۂ دورہ حدیث میں پڑھائی جانی والی مشہور متداول کتاب سنن ابوداؤد کی تدریس کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''سنن ابوداؤد آپ کے استاذ مہربان، ولی زاہد حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ پڑھاتے تھے۔ ۱۳۵۴ھ میں انہیں دوران سال سفر پیش آیا ابوداؤد کا درس آپ کے سپرد فرما کر تشریف لے گئے۔ پھر استاذ موصوف کی خواہش پر مستقل طور سے یہ درس آپ ہی کی طرف منتقل ہو گیا اور سالہا سال جاری رہا۔

یوں تو ہر علم و فن میں آپ کا درس بہت مقبول رہا۔علوم عقلیہ منطق، فلسفہ وغیرہ کی انتہائی کتابوں میں آپ کا درس بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔لیکن آپ کے دو درس خصوصیت سے بہت مشہور ہوئے۔ایک دورہ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد شریف کا اور دوسرا عربی ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری کا۔ان کتابوں کے درس میں شرکت کو مختلف ممالک کے نہ صرف طلبہ بلکہ علماء کرام بھی اپنی سعادت شمار کرتے تھے"[53]۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس:

دار العلوم دیوبند میں ایک عرصہ تدریس کے بعد وہ وقت بھی آیا جب آپ دار العلوم سے مستعفی ہو کر ڈابھیل چلے گئے اور وہاں تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"۲۶ سالہ خدمات کے بعد دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہو کر بھی آپ نے درس حدیث کا سلسلہ بالکلیہ ترک نہیں فرمایا۔آپ کے استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں درس بخاری دیتے تھے، سخت علیل ہو کر دیوبند تشریف لے آئے تو غالباً تعلیمی سال کے اختتام میں تین ماہ باقی تھے۔اس وقت جامعہ کے مہتمم صاحب ان کی جگہ آپ کو لینے کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ان کے اصرار اور شیخ الاسلام کے ارشاد پر آپ نے تین ماہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بخاری شریف کا درس دیا"[54]۔

پاکستان میں تدریس کی ابتداء:

پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ابتداء آپ نے باقاعدہ تدریس نہیں کی، بلکہ متفرق طور پر کچھ طلباء کو پڑھایا، یہ سلسلہ دار العلوم کراچی کی تاسیس تک جاری رہا، مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں کوئی دینی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں یہ سلسلہ جاری کیا جاسکتا۔ مگر کچھ منتہی طلبہ یہاں بھی آگئے۔ان کو آپ نے اور حضرت مولانا شاہ بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع مسجد جیکب لائن میں بعض اسباق پڑھائے۔ان طلبہ میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب کے صاجزادے مولانا آفتاب عالم صاحب بھی شامل تھے''(55)۔

دارالعلوم کراچی میں تدریس:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم کراچی کی تاسیس کے بعد دارالعلوم ہی میں تدریس شروع فرمائی، اس حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''پھر شوال ۱۳۷۰ھ میں آپ نے دار العلوم کراچی کی تاسیس فرمائی تو اس میں بھی کئی سال تک بخاری شریف کے درس سے طلبہ کو مشرف فرمایا۔جب قویٰ میں انحاط اور ملی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو کئی سال بخاری شریف کا درس اس طرح جاری رکھا کہ بخاری کتاب الوضوء تک آپ پڑھاتے اور باقی کتاب دار العلوم کے دوسرے اساتذہ پڑھاتے تھے،زندگی کے آخری چار سال جن میں آپ صاحب فراش رہے،ان میں یہ سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا مگر طلبہ واساتذہ دارالعلوم کے اصرار پر ہر سال بخاری شریف کا پہلا اور صحاح ستہ کا آخری درس آپ ہی دیا کرتے تھے۔دار العلوم کراچی میں بخاری شریف کے علاوہ موطا امام مالک اور شمائل ترمذی کا درس بھی کئی سال جاری رہا۔خوش قسمتی سے ناچیز راقم الحروف کو اور برادر عزیز مولانا محمد تقی سلمہ کو بھی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے کئی کتابیں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی،احقر نے بچپن میں قاعدہ بغدادی بھی حضرت والد ماجد سے پڑھا تھا اس وقت آپ دار العلوم دیوبند میں صدر مفتی اور استاذ حدیث تھے۔مجھے اپنے ساتھ دار الافتاء لے جاتے اور وہیں قاعدہ بغدادی پڑھایا کرتے تھے۔روزانہ سبق کے بعد پیسے دیتے اور جب دیکھتے کہ میرا دل پڑھنے میں نہیں

لگ رہایاذہن بوجھل ہونے لگاہے تو کھیلنے کے لئے چھوڑدیتے۔ میں وہیں مولسری کے نیچے کھیل کود کرتازہ دم ہو کر واپس آتاتو سبق پڑھاتے، کبھی یاد نہیں کہ میرے ذہن پر بوجھ ڈالاہو، پورا قاعدہ کھیل کھیل میں پڑھادیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد رات کو مجھے اور برادر بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب کو انبیاء کرام علیہم السلام اور بزرگان دین کے واقعات نہایت دلنشین انداز میں سنایا کرتے تھے۔ جو بحمد اللہ لوح قلب پر آج تک کندہ ہیں۔ یہ واقعات بعد میں بارہا کتابوں میں پڑھنے پڑھانے کی نوبت آئی مگر اب بھی جب ان کی تفصیلات یاد آتی ہیں تو کتابوں کے بجائے آپ ہی سے سنی ہوئی تفصیلات ایسی سامنے آجاتی ہیں گویا اب سنا رہے ہوں، اس کے بعد آپ نے ایک چہل حدیث جو آپ ہی کی تالیف تھی، اس کی پوری چالیس حدیثیں مع ترجمہ احقر کو یاد کرادی تھیں جب دارالعلوم کراچی میں ناچیز کا اور برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کا دورہ حدیث شروع ہواتو دیگر طلبہ کے ساتھ ہم دونوں بھائیوں کو بھی آپ سے مؤطاامام مالک اور شمائل ترمذی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دورہ حدیث سے فراغت کے بعد آپ نے ہمیں شرح عقود رسم المفتی اور مقدمہ درمختار مع حاشیہ شامی اور الاشباہ والنظائر بھی جو فتویٰ کی کتابیں ہیں خصوصی اہتمام سے پڑھائیں اور کئی سال فتویٰ نویسی کی مشق بھی آپ ہی نے کرائی"(56)۔

آپ کے درس کی خصوصیات:

مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ناچیز راقم الحروف میں یہ اہلیت تو نہیں کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے درس مبارک کی خصوصیات احاطۂ تحریر میں لاسکے۔ تاہم جس حد تک فہم ناقص کی رسائی ہوئی عرض کرتاہوں۔

(۱) آپ کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سبق کے دوران طالب علم کے ذہن کو کبھی بوجھل نہ ہونے دیتے تھے، مشکل سے مشکل بحث ایسی سادگی اور سہولت سے مختصر وقت میں ذہن نشین کرادیتے کہ طلبہ کو اس کے مشکل ہونے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ بسا اوقات پورا درس دوران درس ہی خوب یاد ہو جاتا تھا۔

(۲) غیر ضروری اور غیر متعلقہ مباحث اور نکات کے بیان سے اجتناب فرماتے، حل کتاب پر پوری توجہ دیتے اور اصل توجہ مضامین مقصودہ کی طرف رہتی، طلبہ کو بھی اسی طرف متوجہ رکھتے۔

(۳) کوئی ضروری بحث یا مسئلہ مناسب تفصیل کے ساتھ ذہن نشین کرائے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔

(۴) آپ کے درس سے طلبہ کو صرف کتاب یا حواشی سے نہیں بلکہ فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔

(۵) درس کی رفتار ہمیشہ معتدل ہوتی اور کتاب کے اول سے آخر تک یکساں رہتی تھی۔

(۶) آپ کا درس رسمی مباحث کا پابند نہ تھا بلکہ جس زمانے میں جن مباحث کی زیادہ ضرورت محسوس فرماتے ان پر زیادہ زور دیتے تھے۔

(۷) طلبہ کو درس کے مباحث اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں متحرک، زندہ اور رچے بسے نظر آتے، وہ زندگی سے اپنی درسیات کا ربط نمایاں طور پر محسوس کرتے اور درس کی اہمیت گہرائی اور وسعت کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے جو ان پر مطالعہ کے ذوق شوق اور محنت و کامیابی کے دروازے کھول دیتا تھا۔

(۹) آپ کے درس کا خاص اثر یہ تھا کہ طلبہ کے دلوں میں انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور بزرگان سلف کی عقیدت و محبت جاگزیں ہو جاتی تھی۔

(۱۰) دوران درس جن کتابوں کے حوالے آتے بسا اوقات ان کا اور ان کے مصنفین کا مختصر تعارف بھی کرادیتے تاکہ طلبہ میں ان کے مطالعہ کی بھی رغبت پیدا ہو۔

(۱۱) کوئی طالب علم سوال کرتا تو اس کا سوال پوری توجہ سے سنتے اور اس کی ہمت افزائی فرماتے، کوئی معقول اعتراض کرتا تو اپنی بات کی پچ کبھی نہ بھرتے، اعتراض کو قبول فرمالیتے، کسی سوال کا جواب فوراً مستحضر نہ ہوتا تو فرماتے کہ تحقیق کرکے اس کا جواب دوں گا۔

(۱۲) درس حدیث میں تفقہ کا رنگ غالب رہتا تھا"[57]۔

٤

فصلِ چہارم

دار العلوم کراچی کی بنیاد و تاسیس

فصل چہارم: دارالعلوم کراچی کی بنیاد وتاسیس

دارالعلوم کراچی کا مختصر تعارف:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات میں سب سے نمایاں کارنامہ دارالعلوم کے نام سے ایک جدید یونیورسٹی کا قیام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ اسلامی درس گاہ ''جامعہ درالعلوم کراچی'' کا شمار اس وقت عالم اسلام کے بہترین مذہبی تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کو پوری دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیم حاصل کر کے عالم یا مفتی بننے والوں کی پہلی ترجیح جامعہ دارالعلوم کراچی سے مذہبی تعلیم مکمل کر کے یہاں کی ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے اور آج بھی دنیا کے گوشے گوشے سے علوم نبوی کے شیدائی آکر جامعہ سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

آج کل اسلامی دینا کی اس قابل فخر اسلامی درس گاہ جسے اب اسلامی یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے کے مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مفتی محمد رفیع عثمانی ہیں جنہیں اس وقت مفتی اعظم پاکستان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

کراچی میں دارالافتاء کا قیام:

دارالعلوم کی بنیاد و تاسیس سے پہلے آپ نے کراچی میں ایک دار الافتاء کی بنیاد رکھی، اس کی مفصل روداد مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب یوں تحریر کرتے ہیں:

"ہجرت پاکستان کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دو کاموں کو اپنا مقصد زندگی بنالیا تھا۔ایک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد، دوسرے کراچی میں یہاں کے شایان شان دارالعلوم کا قیام۔

ابتدائی دو سال تو قرارداد مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجہد جو انتہائی بے سروسامانی میں ہورہی تھی اسی کی مشغولیت اتنی رہی کہ دارالعلوم کے قیام میں کامیابی نہ ہوسکی۔

جیکب لائن سے آپ کی رہائش آرام باغ کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہوئی تو مسجد باب الاسلام کے احاطہ میں دروازہ کے اوپر آپ نے ایک کمرہ دارالافتاء کا تعمیر کرایا، تاکہ فتوی حاصل کرنے والوں کو سہولت ہو، نقل فتاوی اور دارالافتاء کے انتظام کے لئے ایک صاحب تنخواہ پر رکھ لیا اور فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لئے احقر کے استاد محترم حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی اور حضرت مولانا امیر الزماں صاحب کشمیری کو مقرر فرمایا، یہ دونوں حضرات والد ماجد کے شاگرد ہیں، اسی سال احقر کے حفظ قرآن کی تکمیل ہوئی تھی، دوسرے طلبہ کے ساتھ برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اور ناچیز راقم الحروف نے فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھنی شروع کیں"[58]۔

"نانک واڑہ" میں دارالعلوم کی بنیاد:

دارالافتاء کے قیام کے بعد اللہ تعالی نے دارالعلوم کے قیام کا بھی بندوبست فرمادیا، دارالعلوم کراچی کا موجودہ ادارہ جو اس وقت کورنگی میں واقع ہے، اس حوالے سے مفتی رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"پھر اللہ تعالی نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ محلہ "نانک واڑہ"[59] میں انگریزوں کے زمانہ کے سکھوں کے ایک اسکول کی خالی عمارت دارالعلوم کے لئے عطا فرمادی، حضرت والد صاحب نے ہمارے بہنوئی جناب مولانا نوراحمد صاحب کو ساتھ لے کر چندے کی اپیل یا ساز و سامان کے بغیر نہایت سادگی سے اس عمارت میں مدرسہ قائم

فرما دیا، ایک استاد اور چند طلبہ سے اس مدرسہ کا محض اللہ کے بھروسہ پر آغاز ہوا۔ اس وقت تک کراچی میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے سوا کوئی مدرسہ نہ تھا، بلکہ پورے پاکستان میں گنے چنے ہی مدارس تھے، علوم دینیہ کے طلبہ پریشان تھے۔ یہ مدرسہ کھلا تو ملک کے اطراف واکناف سے طلبہ آنے شروع ہو گئے اور چند مہینے کے اندر اندر یہی مدرسہ ''دار العلوم کراچی''بن گیا۔ اب دار الافتاء بھی یہی منتقل ہو گیا، حضرت والد صاحب کا جو وقت دستوری جدوجہد سے بچتا تھا وہ درس و فتوی اور دار العلوم کی انتظامی نگرانی میں یہیں صرف فرمانے لگے۔ حضرت والد صاحب دار العلوم کے صدر تھے اور آخر تک صدر رہے، جناب مولانا نور احمد صاحب دار العلوم کے سب سے پہلے ناظم تھے جن کو اللہ نے غیر معمولی صلاحیتیں عطاء فرمائی ہیں وہ نہایت جانفشانی سے دار العلوم کا انتظام کئی سال تک چلاتے رہے''[60]۔

دار العلوم کراچی کی تاسیس وبنیاد کے حوالے سے حافظ اکبر شاہ بخاری تحریر کرتے ہیں:

"مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دینی علوم کے فروغ کا بڑا احساس تھا، انہوں نے 1370ھ میں نہایت بے سروسامانی کے عالم میں اس کام کا یوں آغاز کیا کہ محلہ "نانک واڑہ" کی ایک عمارت میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا، جس میں صرف ایک استاد اور چند طلباء تھے، چند ماہ بعد یہ مدرسہ دار العلوم بن گیا اور آج کورنگی میں یہ شاندار دینی درسگاہ ہے، جس میں تقریباً دو ہزار طلباء[61] تحصیل علم میں مصروف ہیں، یہاں قرآن مجید، حدیث، فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی، علم کلام وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے[62]۔

دار العلوم کی کورنگی میں منتقلی:

نانک واڑہ میں مدرسہ کے قیام کے بعد طلباء کا ہجوم رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، حتی کہ اس کی توسیع کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی، تب اللہ تعالی نے اس کا بندوبست بھی احسن طریقے سے کیا، مفتی رفیع عثمانی صاحب اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

"دارالعلوم کے ہر شعبہ میں کام جس رفتاری سے بڑھ رہا تھا، اس کے سامنے موجودہ عمارت بہت تنگ محسوس ہونے لگی، ادھر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثانی کی وفات کے بعد حضرت والد صاحب کی دلی تمنا تھی کہ ان کی یادگار کے طور پر ان کے شایان شان دارالعلوم قائم ہو، اس کے لئے وہ احاطہ زمین جس میں شیخ الاسلام کا مزار ہے، شب و روز کی جدوجہد سے باضابطہ حاصل فرمایا اور دارالعلوم کو وہیں منتقل کرنے کے خیال سے نقشہ منظور کرا کے تعمیر کا کام شروع کر دیا، مگر بعض لوگوں کی مزاحمت کے باعث کھدی ہوئی بنیادیں اسی حال میں محض جھگڑا ختم کرنے کے لئے چھوڑ کر واپس نانک واڑہ تشریف لے آئے۔ حکومت نے اور رفقاء کار نے بہت زور دیا کہ تعمیر جاری رکھی جائے مگر حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ :

''دارالعلوم بنانا فرض کفایہ اور مسلمانوں کو جھگڑے سے بچانا فرض عین ہے، فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ میں لگنا دین کی صحیح خدمت نہیں، میں جھگڑا مول لے کر یہاں ہر گز دارالعلوم نہ بناؤں گا''۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد اللہ تعالی نے کورنگی میں والد صاحب کو چھپن ایکڑ زمین دارالعلوم کے لئے عطاء فرما دی تو جدید تعمیرات بقدر ضرورت مکمل ہو جانے کے بعد دارالعلوم یہاں منتقل فرما دیا اور نانک واڑہ کی عمارت میں دارالعلوم کے چند شعبے رہ گئے''(63)۔

دارالعلوم کراچی کی تاسیس اور اس کے مختلف مراحل کے حوالے سے مفتی تقی عثانی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

''تقسیم ہند کے بعد ہمارے شیخ حضرت مفتی رحمہ اللہ نے پاکستان کی طرف ہجرت کی اور یہ وہ اولین وقت تھا جب کہ وطن عزیز کے بڑے بڑے شہروں سمیت بالخصوص دارالحکومت شہر کراچی میں کوئی بھی ایسا دینی مدرسہ نہیں تھا، جہاں سے اسلامی علوم اور معارف دینیہ کی اشاعت کا کماحقہ اہتمام ہو۔ لہذا پاکستان بننے کے بعد اول درجہ میں اس کی شدید ضرورت تھی کہ نئی آنے والی پود کی عملی زندگی کو

تمام تر شعبہات زندگی میں اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے اور ان کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ان کے اذہان اسلام کے خوبصورت قالب میں ڈھل جائیں۔اور یہی مقصد تھا جس کے پیش نظر ایک آزاد خود مختار مملکت کے حصول کی امید باندھی گئی تھی۔

پس ہمارے شیخ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے محض اللہ کی توفیق اور مدد نصرت سے کراچی میں ایک وسیع ادارے کی بنیاد رکھی اور یہی وہ ادارہ ہے جو آج ''دارالعلوم کراچی'' کے نام سے مشہور و معروف ہے جو آج بلاشبہ پاکستان کے دینی علوم کے جملہ مراکز میں سب سے بڑا مرکز شمار ہوتا ہے اور حضرت شیخ رحمہ اللہ کے اخلاص کی برکت سے یہ ادارہ ایک خوشگوار ٹھنڈے پانی کا سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے پاکستان سمیت دنیا بھر کے مختلف ممالک سے جوق در جوق آنے والے طلبہ کرام کو اپنے فیضان علم سے سیراب کررہاہے اور یہ رجوع اس قدر بڑھتارہا کہ جگہ کی بے حد تنگی ہوگئی جس کے بعد صحیح معنوں میں تعلیمی ودینی ضروریات رجوع اس قدر بڑھتارہا کہ جگہ کی بے حد تنگی ہوگئی، چنانچہ یہ مدرسہ کورنگی میں ایک وسیع مقام پر منتقل ہوگیا'' (64)۔

دارالعلوم کا خصوصی مزاج:

دارالعلوم کراچی کے خصوصی مزاج کے حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''آپ نے دارالعلوم کراچی قائم فرمایا تو اسے شروع ہی سے ایک خاص مزاج میں ڈھالنے کے لئے غیر معمولی ذہنی اور عملی محنت اٹھائی۔آپ کی تمام کوشش کا محور یہ تھا کہ یہ ادارہ ان اکابر دیوبند کے اصلی مزاج و مذاق کی تصویر ہو جنہوں نے آخری دور میں صدق واخلاص، تواضع وللٰہیّت اور توسط واعتدال کی انمٹ مثالیں قائم فرمائی ہیں۔آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ ادارہ نمود و نمائش کے رسمی مظاہروں اور شور وشر سے الگ رہ کر خاموشی سے دین

کے مخلص خادم پیدا کرنے میں لگا رہے، یہاں ایسے اللہ والے جمع ہوں جو اخلاص اور سلامت فکر کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں''(65)۔

دارالعلوم میں روایتی مناصب مقرر کرنے سے اجتناب:

مفتی شفیع عثمانی صاحب کے زندگی مدارس میں گذری جس کی وجہ سے آپ کو مدارس کے نظم نسق کا خاص تجربہ تھا، آپ نے دارالعلوم کراچی میں جو ضوابط مقرر کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ یہاں روایتی مناصب کی تعیین نہ تھی، چنانچہ اس حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''چونکہ آپ کو مدارس کی زندگی کا طویل تجربہ تھا،اس لئے آپ نے یہاں کے نظم ونسق میں بہت سے ایسے اصول مقرر فرمائے جو دوسرے مدارس کے مقابلے میں بعض اوقات اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی افادیت روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ نے یہاں ''صدر مدرس'' یا ''شیخ الحدیث'' کا کوئی منصب نہیں رکھا، بلکہ تمام اساتذہ مل جل کر کام کرتے ہیں''(66)۔

دارالعلوم میں شکایات کے حل کا انتظام:

دارالعلوم کے نظم وضبط کو درست کرنے اور اس کے نظام کو بہتر کرنے کے لئے آپ نے جو ترتیب قائم کی اس حوالے مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''آپ نے یہاں شروع سے یہ پر زور ڈالا ہے کہ کوئی شخص انفرادی طور شکایت یا مطالبہ پیش کرے تو اس پر فوراً ہمدردی سے غور کر کے شکایت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اجتماعی طور پر کوئی مطالبہ کرنے یا جتھے بنا کر شکایات پیش کرنے کی ہمیشہ ہمت شکنی فرمائی''(67)۔

طلباء اور اساتذہ کی محض تعداد بڑھانے کی حوصلہ شکنی:

مدرسہ بنانے سے مفتی شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد محض لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کرنا یا ایک خاص نظریات کا جتھا بنانا نہیں تھا، بلکہ آپ کا مقصد صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات کا فروغ تھا، اس لئے آپ اس بات کے خلاف تھے کہ ہمارے پاس طلباء کی کثرت تو ہو مگر معیار تعلیم و تربیت نہ ہو، اس حوالے مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''آپ نے محض طلباء کی تعداد بڑھانے کے لئے کوئی اقدام کبھی نہیں کیا، بلکہ جو اقدام دیانت داری سے یہ دیکھ کر کیا کہ وہ مدرسہ کے مقاصد سے کس حد تک ہم آہنگ ہے اس لئے جن مدرسین کی شہرت طلباء کے لئے باعث کشش ہو سکتی ہے، ان کو جمع کرنے کے لئے کبھی اصول صحیحہ کو قربان نہیں کیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو استاذ کسی مدرسے میں پڑھا رہا ہے، اسے وہاں پڑھانے کے دوران اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دینا اصول کے خلاف ہے، اول تو اس میں "سوم علی سوم أخيه" (سودے پر سودا) کا گناہ ہے۔ دوسرے ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرا مدرسہ آباد کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہوتا کہ کوئی صاحب اس مدرسے سے الگ ہو گئے ہیں یا الگ ہونے کا ارادہ ہے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات فرماتے وہ یہ تھی کہ ''اگر آپ اس مدرسے کو خود چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہوں تو دارالعلوم حاضر ہے''(68)۔

دارالعلوم کا فنڈ:

دارالعلوم کے مالیاتی وسائل کیا تھے، اس کے لئے مفتی شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل کیا تھا، اس حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''دار العلوم کے چندے کے لئے آپ عمر بھر کبھی کسی کے پاس تشریف نہیں لے گئے، کم آمدنی والے حضرات کے چندے کی آپ زیادہ قدر فرماتے، اور اسے باعث برکت قرار دیتے، جو تاجر حضرات اخلاص کے ساتھ خدمت دین کی نیت سے دار العلوم کی اعانت میں حصہ لیتے ان کی ہمت افزائی فرماتے، لیکن جن صاحب کے چندے میں احسان جتلانے کا کوئی شائبہ نظر آتا ان کا چندہ قبول کرنے سے خوش اخلاقی کے ساتھ معذرت فرما لیتے ،اور اگر کسی صاحب کے بارے میں کبھی یہ معلوم ہوتا کہ انہوں نے اپنے چندے کے زعم میں دار العلوم کے کسی فرد کے ساتھ کوئی اہانت آمیز رویہ اختیار کیا ہے تو یہ بات آپ کے لیے قطعاً ناقابل برداشت ہوتی، اور موقع ملنے پر ان صاحب کا ٹھیک ٹھیک علاج فرما دیتے، اور اس معاملے میں کبھی کسی بڑے سے بڑے ذی وجاہت شخص کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے''[69]۔

چندہ وصول کرنے میں استغناء واحتیاط:

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو استغناء کی دولت سے نوازا تھا، لیکن یہ استغناء کبھی بداخلاقی کی حدود میں داخل نہیں ہوا، چنانچہ آپ ہر شخص کا مناسب اکرام بھی فرماتے، اور جن صاحب کا چندہ آپ کو مدرسے کے لئے مناسب معلوم نہ ہوتا اسے ایسی طرح رد فرماتے کہ جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ دارالعلوم کی کسی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، انھیں مدرسے کی کسی ضرورت کی طرف اس طرح متوجہ بھی فرما دیتے کہ اگر ان کی وسعت میں ہو تو اس کام میں حصہ لے سکیں، لیکن طبیعت پر کوئی بار بھی نہ ہو، اور جن حضرات کے چندے میں خدشہ نظر آتا ان کے پوچھنے پر بھی مدرسے کی کسی ضرورت کا اظہار نہ فرماتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ دار العلوم کا تعمیری کام جاری تھا، اور اس کے لئے رقم کی ضرورت تھی، ملک کے ایک مشہور سرمایہ دار والد صاحب کے پاس تشریف لائے، اور پہلے کچھ رقم بطور ہدیہ دینے کی پیش

کش کی جس سے آپ نے خوبصورتی کے ساتھ معذرت فرمالی، اس کے بعد انہوں نے دار العلوم کی تعمیرات میں مؤثر حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی، اور وہ اس مالی حیثیت کے آدمی تھے کہ دار العلوم کے اس وقت کے تمام تعمیری منصوبے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن حضرت والد صاحب کو اپنی فراست سے اندازہ ہو گیا کہ ان کی یہ اچانک آمد اور پیش کش بلاوجہ نہیں ہے، چنانچہ آپ نے اس پیش کش سے بھی یہ کہہ کر معذرت فرمالی کہ بحمد اللہ فی الحال تو مدرسے کا کام چل رہا ہے، آپ تکلیف نہ فرمائیں، چنانچہ وہ صاحب ناکام تشریف لے گئے، اور بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحب کا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا۔

آپ افریقہ تشریف لے گئے، وہاں لوگوں نے مختلف ہدیے تحفے بھی لانے شروع کئے اور دار العلوم کے چندے کی بھی پیشکش کی، لیکن آپ نے یہ عام اعلان فرمادیا کہ میں یہاں دین کی کچھ باتیں سنانے کے لئے آیا ہوں، سب حضرات اس سننے کی طرف متوجہ ہوں، کوئی صاحب نہ مجھے ذاتی طور کوئی ہدیہ پیش کریں اور نہ دار العلوم کے لئے یہاں چندہ دیں، جو صاحب دار العلوم کی اعانت کرنا چاہتے ہوں، وہ براہ راست اپنی رقم دار العلوم کراچی کے پتے پر ارسال فرمادیں، چنانچہ تقریباً دو ماہ کے اس سفر میں آپ نے ان باتوں پر سختی کے ساتھ عمل فرما دیں، چنانچہ تقریباً دو ماہ کے اس سفر میں آپ ان باتوں پر سختی کے ساتھ عمل فرمایا، اور چند انتہائی بے تکلف حضرات کے سوا جن سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے، نہ کسی سے کوئی ہدیہ قبول کیا، اور نہ دار العلوم کے لئے چندہ وصول فرمایا"[(70)]۔

دار العلوم کراچی-خدمتِ دین کا ایک ادارہ:

دار العلوم کراچی روایتی اداروں کی طرح کا ایک ادارہ نہ تھا، بلکہ اسے مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی مضبوط بنیادوں پر استوار فرمایا تھا اور اس میں باقاعدہ اصول و ضوابط وضع فرمائے تھے جن کا مختصر تذکرہ اوپر آچکا، اپنی زندگی میں مفتی صاحب نے اس پر

سختی سے عمل درآمد کیااور پھر اپنے بعد اس پر عمل درآمد کروانے کی وصیت بھی کر گئے تھے۔اس اس حوالے سے مفتی رفیع عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مذکورہ بالا اصولوں کے بارے میں حضرت والد صاحب نے تمام منتظمین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ :

"ہم نے دار العلوم کی شکل میں دکان نہیں کھولی، بلکہ خدمت دین کا ایک ادارہ قائم کیا ہے، جب تک آپ حضرات اس ادارے کو صحیح اصولوں پر اور اللہ تعالٰی کی رضا کے مطابق چلا سکیں، چلائیں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ اسے صحیح اصولوں پر چلانا ممکن نہ رہے تو میرے نزدیک اسے بند کر دینا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ اسے غلط اصولوں پر چلایا جائے""[71]۔

۵

فصلِ پنجم

بورڈ آف تعلیمات اسلام اور لاء کمیشن کی رکنیت

فصل پنجم: بورڈ آف تعلیماتِ اسلام اور لاء کمیشن کی رکنیت

پاکستان کے قیام کے بعد مفتی شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اس میں اسلامی قانون کو رائج کرانا تھا، اسلامی قانونی سازی کی کوششوں میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عظیم جدوجہد بورڈ آف تعلیمات اسلام کے قیام کی تھی، چنانچہ اس حوالے سے مفتی رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے باقاعدہ آئین سازی کا کام شروع کیا تو قائدِ ملت لیاقت علی خان مرحوم نے ایک "اسلامی مشاورتی بورڈ" بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کر کے پیش کرے اور اس کی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے۔ یہ بورڈ مندرجہ ذیل چھ حضرات پر مشتمل تھا۔

۱۔ حضرت سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ - صدر

۲۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ - رکن

۳۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب - رکن

۴۔ جناب پروفیسر عبد الخالق صاحب (مشرقی پاکستان) - رکن

۵۔ مولانا جعفر حسین صاحب مجتہد - (شیعہ عالم) - رکن

۶۔ جناب ظفر احمد انصاری - سیکرٹری

مگر علامہ سید سلیمان ندوی اس وقت تک ہندوستان میں تھے پھر پاکستان تشریف لانے کے بھی کافی عرصہ بعد ۱۹۵۲ء میں آپ نے عہدۂ صدارت سنبھالا اس وقت تک یہ بورڈ صدر کے بغیر ہی اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا۔

یہ بورڈ ۹/اگست ۱۹۴۹ء سے اپریل ۱۹۵۴ء تک تقریباً ساڑھے چار سال قائم رہا۔ اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع سے آخر تک اس کے ممتاز رکن رہے۔ اس بورڈ نے نہایت عرق ریزی کے بعد دستورِ پاکستان کے لئے جو سفارشات پیش کی تھیں اگرچہ ۵۶ء و ۱۹۷۳ء کے دستوروں میں اس کی جھلک کسی حد تک موجود تھی لیکن افسوس کہ اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام روبہ عمل لائی گئیں، نہ انھیں ارباب وحل وعقد نے شائع کیا"(72)۔

لاء کمیشن میں شمولیت:

بورڈ آف تعلیمات اسلام کے بعد آپ کو لاء کمیشن کی رکنیت بھی دی گئی، اس حوالے سے مفتی رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

"بورڈ آف تعلیماتِ اسلام کا تعلق تو صرف دستور کی حد تک تھا۔ پاکستان کے موجودہ قوانین سے اس کا تعلق نہ تھا موجودہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے علامہ سید سلیمان صاحب ندوی نے حکومت پر زور دیا تو ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ایک لاء کمیشن بنایا گیا جس میں علماء کرام میں سے ابتداءً صرف علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کو ممبر بنایا گیا۔

جسٹس رشید اور جسٹس میمن ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کئے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ شیخ الاسلام علامہ عثمانی کی وفات کئی ماہ قبل ہو چکی تھی جو حضرت والد صاحب کے استاد بھی تھے اور پھوپھی زاد بھائی بھی۔

حضرت سید صاحب نے محسوس فرمایا کہ اسلامی قانون کے ماہر کے حیثیت سے لاء کمیشن میں حضرت مفتی صاحب کی شرکت ناگزیر ہے، انہوں نے لاء کمیشن میں اپنی شرکت باقی رکھنے کے لئے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ مفتی صاحب کو بھی کمیشن کا رکن بنایا جائے۔ بالآخر آپ کو اس کی بھی رکنیت قبول کرنی پڑی۔

یہ کمیشن دو سال تک قائم رہا لیکن وزارتوں کے تغیر اور برسر اقتدار طبقہ میں کئی ایسے افراد کی طرف سے مسلسل رکاوٹوں کے باعث جو اس ملک میں اسلامی نظام دیکھنے کے روادار نہ تھے، اس کمیشن کی مساعی کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔

ایک موقع پر اس کمیشن کی ایک میٹنگ میں حضرت والد صاحب نے کمیشن کے چیئرمین کو جو ایک جسٹس تھے مخاطب کر کے فرمایا:

"قانون سازی کے کام کو اسلام کے رخ پر آپ چلنے نہیں دیتے اور غلط پر میں چلنے نہیں دوں گا نتیجہ یہ ہوگا کہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی"(73)۔

خلاصۃ الباب

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات متنوع ہیں، آپ نے فتاوی نویسی، تصنیفات، خطبات و مواعظ، مدارس کا قیام اور پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ میں عملی کوششیں کی، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ پاکستان کے ایک مایہ ناز مفتی تھے، آپ نے اپنی زندگی میں جو اصلاحی، علمی، تدریسی اور ملی خدمات سرانجام دیں ان کی بدولت آپ کا شمار ملک کے نامور فقہاء و مفتیان عظام میں ہوتا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تادم حیات فتوی نویسی کی خدمت سرانجام دی، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوی و فقہی رسائل میں جیسے علماء و اہل علم حضرات کے لئے بیش قیمت مواد موجود ہے، اسی طرح وہاں عام لوگوں کے لئے بھی رہنمائی موجود ہے، یہ کسی خاص شخص اور خاص طبقہ کو مد نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے، بلکہ مفتی صاحب نے ان میں وہ جواہر و لعل پرودئے ہیں کہ جن سے تاقیامت استفادہ ہوتا رہے گا۔

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ باوجود ایک علمی شخصیت ہونے کے اپنے آپ کو کسی مسئلہ میں "تفرد" (دوسرے علماء سے ہٹ کر کوئی ذاتی موقف اختیار کرنے) سے حتی الامکان اس سے بچاتے تھے، مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب کو فتوی نویسی کے دوران مصادر کی طرف مراجعت کا بہت اہتمام تھا، فتوی لکھنے کے دوران آپ کو کسی مسئلہ میں ادنی سا شبہ بھی ہوتا تو آپ بغیر کتب کی مراجعت کے اور بغیر دلی اطمینان کے اس کا جواب نہیں دیتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ موصوف کو اللہ تعالی نے ذوقِ سلیم بھی عطا فرمایا تھا، مفتی محمد شفیع صاحب اپنی فقاہت، ذوق سلیم اور مزاج شریعت سے واقفیت کی بناء پر ابتداء ہی وہ بات ارشاد فرمایا کرتے تھے جو ایک عام عالم

بیسیوں کتب کھنگالنے اور درجنوں عبارات کا مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ نکالتا، آپ اس فن کی باریکیوں سے خوب واقف تھے، فتوی نویسی میں آپ کا ایک خاص طرز تھا۔

فتاوی نویسی میں آپ کے اسلوب میں مستفتی کے سوال کے مقصد کو جاننا، بے مقصد سوالات کے جوابات دینے سے پرہیز، اختلافی مسائل میں حتی الامکان جواب سے احتراز، بعض اوقات مستفتی کو فتوی کے بجائے مشورہ دینا، زمانے کے بدلاؤ کا فتوی پر اثر کو مد نظر رکھنا، جواب دینے میں فقہی اصطلاحات سے اجتناب، فتوی میں احکام ودلائل میں امتیاز، جواب میں ترتیب وتہذیب شامل ہیں۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ایک جید مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ محدث بھی تھے، علمِ حدیث میں آپ کی تدریسی وتالیفی خدمات آپ کی اس علم میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے دوران تعلیم حدیث کے اسباق میں اپنے اساتذہ کی تقاریر ضبط کرنے کا بھی اہتمام کیا تھا، جس سے آپ کا علمِ حدیث میں شوق وذوق نمایاں نظر آتا ہے، علوم حدیث کی تحصیل کے بعد آپ نے جب درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تو دوسرے علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ حدیث اور علوم حدیث کی تدریس بھی آپ کے حصہ میں آئی، چنانچہ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے علم حدیثِ کی تدریس کا آغاز کیا اور ڈابھیل میں بھی تدریس کی، پھر پاکستان ہجرت کے بعد دارالعلوم کراچی میں علوم حدیث کی تدریس کی خدمات سرانجام دیں، حدیث شریف کی جو کتب آپ کے ہاں زیر درس تھیں، ان میں کتب ستہ، "موطاامام مالک"، "موطاامام محمد" اور "شرح معانی الآثار" شامل ہیں، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک محقق محدث تھے، آپ کی تدریس کا انداز روایتی تدریسی انداز سے قدرے مختلف تھا، دارالعلوم دیوبند میں ایک عرصہ تدریس کے بعد وہ وقت بھی

آیا جب آپ دارالعلوم سے مستعفی ہو کر ڈابھیل چلے گئے اور وہاں تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ابتداء آپ نے باقاعدہ تدریس نہیں کی، بلکہ متفرق طور پر کچھ طلباء کو پڑھایا، یہ سلسلہ دارالعلوم کراچی کی تاسیس تک جاری رہا۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات میں سب سے نمایاں کارنامہ دارالعلوم کے نام سے ایک جدید یونیورسٹی کا قیام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ اسلامی درس گاہ "جامعہ درالعلوم کراچی" کا شمار اس وقت عالم اسلام کے بہترین مذہبی تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کو پوری دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیم حاصل کر کے عالم یا مفتی بننے والوں کی پہلی ترجیح جامعہ دارالعلوم کراچی سے مذہبی تعلیم مکمل کر کے یہاں کی ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے اور آج بھی دنیا کے گوشے گوشے سے علوم نبوی کے شیدائی آکر جامعہ سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

مدرسہ بنانے سے مفتی شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد محض لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کرنا یا ایک خاص نظریات کا جتھا بنانا نہیں تھا، بلکہ آپ کا مقصد صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات کا فروغ تھا، اس لئے آپ اس بات کے خلاف تھے کہ ہمارے پاس طلباء کی کثرت تو ہو مگر معیار تعلیم و تربیت نہ ہو، دارالعلوم کراچی روایتی اداروں کی طرح کا ایک ادارہ نہ تھا، بلکہ اسے مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی مضبوط بنیادوں پر استوار فرمایا تھا اور اس میں باقاعدہ اصول و ضوابط وضع فرمائے تھے جن کا مختصر تذکرہ اوپر آچکا، اپنی زندگی میں مفتی صاحب نے اس پر سختی سے عمل درآمد کیا اور پھر اپنے بعد اس پر عمل درآمد کروانے کی وصیت بھی کر گئے تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد مفتی شفیع عثمانی صاحب کا مقصد اس میں اسلامی قانون کو رائج کرانا تھا، اسلامی قانونی سازی کی کوششوں میں مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عظیم جدوجہد بورڈ آف تعلیمات اسلام کے قیام کی تھی، بورڈ آف تعلیمات اسلام کے بعد آپ کو لاء کمیشن کی رکنیت بھی دی گئی۔

مصادر، مراجع وحواشی بابِ سوم

(1) تقی عثمانی، مفتی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج۱، ص: ۳۷۶-۳۷۸)۔

(2) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۷۶)۔

(3) تقی عثمانی، مفتی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج۱، ص ۳۶۳)۔

(4) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۴۴)۔

(5) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۴۴، ۴۵)۔

(6) حوالہ بالا (ص: ۴۵)۔

(7) محولہ بالا ص: ۴۵)۔

(8) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج۱، ۳۶۴، ۳۶۵)۔

(9) شفیع عثمانی، مفتی، جواہر الفقہ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۰ء، (ج: ۳، ص ۳۹۸)۔

(10) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۴۹، ۵۰)۔

(11) نور البشر، مولانا، سرمایہ گراں مایہ، کراچی، مکتبہ معہد عثمان بن عفان، ۲۰۱۴ء، (ص: ۵۱)۔

(12) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۵۱، ۵۲)۔

(13) حوالہ بالا (ص: ۵۱، ۵۲)۔

(14) محولہ بالا (ص: ۵۱، ۵۲)۔

(15) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج۱، ۳۶۹)۔

(16) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۵۱، ۵۲)۔

(17) حوالہ بالا (ص: ۵۲)۔

(18) محولہ بالا (ص:۵۴)۔

(19) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ا، ص ۳۷۱، ۳۷۲)۔

(20) تقی عثمانی، مفتی ، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۵۵، ۵۶)۔

(21) ایضاحوالہ سابقہ (ص:۵۶)۔

(22) ایضامحولہ بالا (ص:۵۷)۔

(23) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص:۵۷)۔

(24) ایضاحوالہ سابقہ (ص:۶۳، ۶۴)۔

(25) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ا، ۳۸۰)۔

(26) ایضاحوالہ بالا (ج ا، ۳۸۱-۳۸۲)۔

(27) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عابدین، الشامی، ردالمحتار، بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۲ء، (ج:۳، ص:۵۷۳)۔

(28) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ا، ۳۸۳)۔

(29) تقی عثمانی، مفتی ، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص:۶۹، ۷۰)۔

(30) ایضاحوالہ سابقہ (ص:۷۰، ۷۱)۔

(31) ایضامحولہ بالا (ص:۷۱)۔

(32) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص:۷۱)۔

(33) حوالہ سابقہ (ص:۷۲)۔

(34) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ا، ۳۸۶)۔

(35) الترمذی، محمد بن عیسی بن سَوْرۃ، الترمذی، أبو عیسی، سنن ترمذی، مصر، شرکۃ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبي، ۱۹۷۵ء، (ج۵، ص۵۵۶، رقم:۲۳۱۷)۔

(36) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۷۳، ۷۴)۔

(37) ایضا حوالہ سابقہ (ص: ۷۵)۔

(38) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ۱، ۳۸۹)۔

(39) علی بن (سلطان) محمد، ابو الحسن نور الدین الملا الهروی القاری (المتوفی: 1014ھ)، شرح شرح نخبۃ الفکر، بیروت، دار الارقم (زیادۃ الثقۃ، ص ۳۲۳)۔

(40) نصب الرایہ میں ہے: "والزيادة من الثقة مقبولة، قلنا: ليس ذلك مجمعًا عليه، بل فيه خلاف مشهور، فمن الناس من يقبل زيادة الثقة مطلقًا، ومنهم من لا يقبلها، والصحيح التفصيل، وهو أنها تقبل في موضع دون موضع، فتقبل إذا كان الراوي الذي رواها ثقةً حافظًا ثبتًا، والذي لم يذكرها مثله، أو دونه في الثقة،...".

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: عبد الله بن يوسف، الزيلعي، نصب الراية، لبنان، مؤسسة الريان للطباعة والنشر، 1418هـ/ 1997م، (ج ١ ص٣٣٦، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، أحاديث الجهر بالبسملة).

(41) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۷۷، ۷۸)۔

(42) حوالہ سابقہ (ص: ۷۸)۔

(43) محولہ بالا (ص: ۷۸، ۷۹)۔

(44) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۷۸، ۷۹)۔

(45) محمد بن عیسی بن سَوْرۃ، الترمذی، أبو عیسی، سنن ترمذی، مصر، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۷۵ء، (ج: ۱، ص ۳۱۵، رقم الحدیث: ۱۶۹)۔

(46) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۸۰، ۸۱)۔

(47) حوالہ سابقہ (ص: ۸۱)۔

(48) ایضا محولہ بالا (ص: ۸۲)۔

(49) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ۱، ۳۹۴، ۳۹۵)۔

(50) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۸۳)۔

(51) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۱۰۱)۔

(52) حوالہ سابقہ (ص ۱۰۱، ۱۰۲)۔

(53) ایضا محولہ بالا (ص ۱۰۲)۔

(54) رفیع عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ۱، ۱۴۵)۔

(55) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۱۰۳)۔

(56) حوالہ سابقہ (ص ۱۰۳، ۱۰۴)۔

(57) ایضا محولہ بالا (ص ۱۰۴، ۱۰۵)۔

(58) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۱۸۱، ۱۸۲)۔

(59) "نانک واڑہ" شہر کراچی (صدر) میں واقع ایک محلہ کا نام ہے۔

(60) حوالہ سابقہ (ص ۱۸۲)۔

(61) طلباء کی یہ تعداد کتاب لکھے جانے کی وقت تھی اور اب یہ تعداد اس سے کئی گنا بڑھ کر بارہ ہزار (۱۲۰۰) سے زائد ہو چکی ہے (از: مقالہ نگار)۔

(62) اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، (ص ۱۳۰، ۱۳۱)۔

(63) ایضا محولہ بالا (ص ۱۸۲، ۱۸۳)۔

(64) تقی عثمانی، مفتی، مقالات عثمانی، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۷ء، (ص ۴۹۹، ۵۰۰)۔

(65) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۱۶۴)۔

(66) حوالہ سابقہ (ص: ۱۶۴)۔

(67) ایضاً محولہ بالا (ص: ۱۶۴)۔

(68) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء، (ج ۱، ۴۶۸)۔

(69) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۱۶۵)۔

(70) حوالہ سابقہ (ص: ۱۶۵، ۱۶۶)۔

(71) ایضاً محولہ بالا (ص: ۱۶۶، ۱۶۷)۔

(72) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء، (ص ۱۷۳، ۱۷۴)۔

(73) حوالہ سابقہ (ص ۱۷۵، ۱۷۶)۔

٤

بابِ چہارم

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ملی و سیاسی خدمات

- فصل اول: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور سیاست۔ نظریات و تجربات
- فصل دوم: قیام پاکستان سے قبل سیاسی جدوجہد
- فصل سوم: قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ
- فصل چہارم: قیام پاکستان کے بعد آپ کی خدمات

١

فصلِ اوّل

مفتی محمد شفیع اور سیاست۔ نظریات وتجربات

﴿بابِ چہارم: مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ملی وسیاسی خدمات﴾

فصل اول: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور سیاست - نظریات و تجربات

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ایک خالصتاً علمی شخصیت تھے، تصنیف وتالیف، تدریس، مطالعہ اور فتوی نویسی ہی آپ کا خاص شغل تھا، آپ کا میلان طبعاً سیاست کی طرف نہ تھا، مگر بعد میں آپ اس میدان کے شاہ سوار بنے، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مزاج طبعی طور پر سیاسی نہیں تھا، اور نہ انہوں نے کبھی سیاست کو اپنا محور عمل بنایا، لیکن سیاست بھی دین کا ایک اہم شعبہ ہے، اور اس شعبے میں بھی مسلمانوں کی اجتماعی بہود کی فکر ایک عالم دین اور داعیٔ حق کے فرائض میں شامل ہے، اس لئے جب کبھی مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہوئی تو آپ نے محدود مقاصد کے تحت اس شعبے میں بھی عظیم خدمات انجام دیں، لیکن اس انداز کے ساتھ کہ ان خدمات کے معروف ہونے کے باوجود آپ کبھی سیاسی شخصیت کی حیثیت سے معروف نہیں ہوئے''(1)۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی نظریات:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو چونکہ سیاست کا ایک طویل تجربہ تھا، اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک متبحر مفتی بھی تھے، اس لیے دینوی اور دنیوی دونوں اعتبار سے اس خار دار وادی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے، آپ کے تجربات اور تجزیے ہر دور میں قابل تقلید رہیں گے، ذیل میں آپ کے سیاسی نظریات اور تجربات کے کچھ نمونے مفتی محمد تقی عثمانی کی کتاب "میرے والد میرے شیخ" سے پیش کیے جاتے ہے:

ا۔علماءاور سیاست:

''علماء کے لیے سیاست میں حصہ لینے کو حضرت والد صاحب اس حد تک تو بہتر سمجھتے تھے کہ ملک میں اسلامی قوانین کے لیے جتنی جہد وجہد ضروری ہو وہ کی جائے، لیکن اس سلسلے میں آپ دو باتوں پر بہت زور دیتے تھے:

ا۔سب سے پہلی بات یہ کہ دینی اداروں کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے،ان اداروں کے اساتذہ وطلباء کو ملک کے سیاسی حالات سے نظری طور پر واقف تو رہنا چاہیئے، لیکن عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔اور جب تک کبھی کسی تعلیمی ادارے سے تعلق والا کوئی عالم یہ محسوس کرے کہ اس کا عملی سیاست میں حصہ لیناضروری ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ پہلے اس ادارے سے مستعفی ہو جائے،اور پھر سیاسی خدمات انجام دے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اکابر علماءدیوبند کا طریقہ یہی رہاہے کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہنے کی حالت میں انہوں نے عملی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن جب حضرت شیخ الہند آزادیٔ ہند کے سلسلے میں تحریکات خلافت میں مؤثر حصہ لینے لگے تو دارالعلوم دیوبند سے الگ ہوگئے۔خود حضرت والد صاحب اور شیخ الاسلام علامہ شبیر صاحب عثمانی نے بھی جب تحریک قیام پاکستان میں سرگرمی سے عملی حصہ لیناشروع کیاتو پہلے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے،اس کے بعد عملی جہد وجہد شروع کی"[2]۔

۲۔علماءکے سیاست میں حصہ نہ لینے کی وجوہات(فوائد و نقصانات):

"اس طرز عمل کی وجوہ بہت سی ہیں۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی تعلیمی ادارہ خود یااس کے اساتذہ وطلبہ عملی سیاست میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہ علمی انہماک مفقود ہو جاتاہے جو تحصیل علم کے لیے ناگزیر ہےاور اس کی وجہ سے تعلیم و تعلم کا معیار گرجاتاہے اور استعدادیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔علم یکسوئی چاہتاہے اور سیاسی

مشاغل کو یکسوئی سے بیر ہے، چنانچہ جو لوگ زمانہ طالب علمی کے دوران عملی سیاست میں لگ جاتے ہیں عموماً ان کی استعداد ناقص رہ جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ علم و عمل کا صحیح مذاق پیدا کئے بغیر جب ناپختہ ذہن طلباء سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو وہ حدود قائم نہیں رکھ پاتے جو اسلام نے سیاسی جہد وجہد کے لئے مقرر کی ہیں اور حدود کی مسلسل پامالی سے بالآخر دینی حلقوں کی سیاست بھی لادینی سیاست کے رخ پر پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نیز پختہ دینی تربیت کے بغیر جب انسان سیاست کے خارزار میں داخل ہوتا ہے تو پندار و نقلی، نام نمود حب مال و منصب اور اسی طرح کی دوسری باطنی بیماریوں سے حفاظت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسرے تقسیم کار کا اصول کا تقاضا بھی یہ ہے کہ تمام اہل علم سیاست ہی کے نہ ہو رہیں، بلکہ کچھ لوگ تعلیم و تعلم اور خالص دعوت وارشاد کے کام سے وابستہ رہیں، تاکہ دینی ضرورت کے تمام کام توازن کے ساتھ چلتے رہیں، اور کسی شعبے میں کوئی خلا پیدا نہ ہو۔

چوتھے دینی مدارس کی صلاح و فلاح اس میں ہے کہ وہ نہ تو حکومت کے اتنے قریب ہوں کہ اس کے دست نگر ہو کر رہ جائیں، اور نہ حکومت سے ایسی مخاصمت قائم کریں کہ ان کے کام میں رکاوٹ پڑنے لگے، حکومتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں، لیکن ان اداروں کا کام ٹھوس، مثبت اور متواتر ہے۔ اس لئے حکومتوں کے قرب و بعد سے اس سے برا اثر نہ پڑنا چاہیے۔ ان کو ہر حالت میں اپنے دور رس تعمیری کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ اور یہ ادارے عملی سیاست میں داخل ہوں تو ان کی حیثیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

۳۔ شعبۂ تدریس سے غیر ملحق علماء کے لیے سیاست:

"جو اہل علم تعلیمی اداروں سے وابستہ نہ ہوں ان کے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں بھی حضرت والد صاحب قدس سرہ کا رجحان اس طرف تھا کہ شدید ضرورت کے بغیر وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں تو بہتر ہے، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے ایک مرتبہ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''ارباب اقتدار اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ ملا اقتدار چاہتا ہے، میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم کبھی اقتدار میں آنا نہیں چاہتے، لیکن ارباب اقتدار کو ''تھوڑا سا ملا'' بنانا ضرور چاہتے ہیں"[(3)]۔

۴۔ علماء کا سیاست میں حصہ لینے کا طریقہ:

"حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت والد صاحب کے ذہن میں علماء کے سیاست میں حصہ لینے کا جو نقشہ تھا وہ یہ کہ ایک طرف تمام مکاتب فکر کے علماء متحد ہو کر ملک میں اسلامی شریعت کی نفاذ کے لیے رائے عامہ کو ہموار کریں، اس کے لئے تقریر و تحریر اور علم و تحقیق کے جس کام کی ضرورت ہو اسے انجام دیں، یہاں تک کہ یہ عوامی مطالبہ محض ایک نعرے کی شکل میں نہیں، بلکہ ایک ٹھوس اور مثبت پروگرام کی شکل میں، اتنی قوت اختیار کر جائے کہ کسی بھی حکومت کو اس سے سرتابی کی جرأت نہ ہو۔ اور دوسری طرف وہ دیندار، سلیم الفکر اور مخلص افراد کی ایسی ٹیم تیار کریں جو الیکشن میں حصہ لے کر حکومت کے ایوانوں تک پہنچے اور اس عوامی مطالبے کو علماء کے زیر ہدایت عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے، چنانچہ جس زمانے میں ''جمعیت علمائے اسلام'' کی ذمہ داری حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب قدس سرہ اور حضرت والد صاحب وغیرہ کے پاس تھی، اس دور میں ''نظام اسلام پارٹی''، جمعیت ہی کی طرف سے اسی مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی۔

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ سیاسی حکمت عملی جو ان حضرات نے اختیار فرمائی تھی، کامیاب نہیں ہو سکی، اور اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، لیکن احقر کی ناقص رائے میں اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حکمت عملی غلط تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چند در چند وجوہ کی بناء پر سیاسی جدوجہد کا یہ نقشہ بروئے کار آہی نہیں سکا، ورنہ اگر یہ نقشہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ بروئے کار آتا تو غالباً اس کے نتائج آج کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتے'' (4)۔

۵۔ حکمرانوں کے ساتھ طرز عمل

"حضرت والد صاحب کے سیاسی مذاق کا دوسرا اہم جزیہ تھا کہ علماء کو حکومت اور حکمرانوں کے ساتھ کس قسم کا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟۔ اس سلسلے میں آپ کی سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ علماء کو نہ تو حکرانوں سے اتنا قرب اختیار کرنا چاہیے جس سے ان کے علمی وقار واستغناء پر آنچ آئے، یا حق گوئی میں رکاوٹ پیدا ہو، اور نہ ایسا بعد رکھنا چاہیے کہ وہ ذاتی یا سیاسی خصومت کی شکل اختیار کر جائے، بلکہ علماء کا منصب ایک ایسے آزاد، مستغنی، مگر خیر خواہ ادارے کا ہونا چاہیے جو حکومت کے اچھے کاموں میں اس کے ساتھ تعاون بھی کرے، اور اس کے غلط کاموں پر ہمدردی و خیر خواہی اور حکمت ودل سوزی کے ساتھ تنقید واحتساب کا فریضہ بھی انجام دے۔

برصغیر میں انگیریز کے دو سو سالہ عہد اقتدار کے دوران چونکہ مخلص اور باضمیر مسلمان ہمیشہ انگریز حکومت سے بیزار اور آزادی ہند کے لئے کوشاں رہے، اس لئے مسلمانوں کے سیاسی مزاج میں دو سو سال تک حکومت کی مخالفت کا رجحان غالب رہا۔ اور ہر اس تحریک کو قبول عام حاصل ہوا جو حکومت کی مخالفت میں اٹھی ہو، یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر حریت پسند مسلمانوں کی ہمدردیاں ہٹلر تک سے وابستہ ہو گئیں، کیونکہ اس کی طاقت اور فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ انگریز کی شوکت توڑنے اور اس کے جمے ہوئے اقتدار کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شاید یہ اسی دو سالہ سیاسی مزاج کے باقی ماندہ اثرات ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں بھی منفی انداز سیاست پروان چڑھا،اور تقسیم سے پہلے کی طرح اب بھی حکومت کی ہر مخالفت نہ صرف قابل تعریف بلکہ بذات خود مقصد بن کر رہ گئی،اور جو شخص حکومت کے مقابلے میں جتنے زور اور جتنے تشدد سے سامنے آتا، عوام میں اسے اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوتی۔اس رجحان کو حکمرانوں کے اس طرز عمل سے بھی تقویت ملی جو واقعتاً قابل مخالفت تھا، لیکن بہر حال! واقعہ یہی ہوا کہ ہماری سیاست میں منفی انداز فکر ترقی کرتا چلا گیا۔

حالانکہ ، واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہماری سیاسی حکمت عملی بھی تبدیلی کی محتاج تھی،اب انگریزی دور کی طرح حکومت کی مخالفت بذات خود مقصد نہ بنی چاہیے تھی،بلکہ ہر مرحلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ ملک وملت کے استحکام اور اسلامی طرز حیات کے فروغ کے لئے کونسا طرز عمل مفید ہوگا؟اس طرز فکر کے نتیجے میں جہاں بعض مواقع پر حکومت کے مقابلے میں ڈٹ جانا مفید ہوتا،وہاں بعض مواقع پر اس کی حوصلہ افزائی اور اس کے قریب پہنچنا بھی زیادہ سود مند ثابت ہوتا چنانچہ ملکی سیاست میں کئی مراحل ایسے بھی آئے کہ جن میں حکومت سے سیاسی مخالفت کی فضا پیدا کرنے کے بجائے اس کے ساتھ باوقار تعاون اور اسے دور دور سے برا کہنے کے بجائے قریب جا کر اصلاح کی فکر شاید ملک وملت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی"[5]۔

۶۔ حکومت کے ساتھ تعاون اور مخالفت کے متعلق آپ کا نظریہ:

"شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مخلصانہ فکر کے ساتھ ملکی سیاست میں حصہ لیا تھا، چنانچہ پاکستان میں ان کی مختصر سی سیاسی زندگی میں حکومت کے ساتھ تعاون اور اس کی مخالفت دونوں کی متوازن مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اس دور میں جو جماعتیں ملک کے سیاسی منظر پر زیادہ نمایاں تھیں وہ بدستور ''اقتدار چھوڑ'' کی اسی سیاست پر عمل پیرا رہیں جو تقسیم ہند سے پہلے کی سیاست تھی۔ بلکہ بعض حضرات کی طرف سے حضرت

علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے طرز عمل پر یہ اعتراضات بھی ہوئے کہ وہ جرأت و عزیمت اور بیباکی و شجاعت سے محروم ہے اور حضرت والد صاحب سنایا کرتے تھے کہ ایک ایسے اعتراض کے جواب میں حضرت علامہ عثمانی قدس سرہ نے فرمایا تھا: ''اگر دل میں اخلاص ہو تو بعض اوقات حکومت کے قید برداشت کرنے کے مقابلے میں عوام کی کالی جھنڈیوں کو برداشت کرنا زیادہ جرأت و عزیمت چاہتا ہے، اور جس طرح قید و بند سے ڈر کر اپنے صحیح طرز عمل کو بدل لینا بزدلی اور مداہنت ہے اسی طرح کالی جھنڈیوں سے ڈر کر اپنے ضمیر کی آواز کو دبالینا بھی بدترین مداہنت ہے۔اس میں اگر حکومت کی خوشامد یا رضا مطلوب ہے تو اس میں عوام کو خوش کر کے ہیرو بننا مقصود ہے، اور اللہ کو راضی کرنے کی فکر دونوں میں نہیں۔''

البتہ اس طرز عمل کا لازمی جز یہ ہے کہ حکومت کے قرب کو ایک تو سہل نگاری یا عافیت کوشی کی بناء پر نہیں بلکہ دینی ضرورت کے تحت اختیار کیا جائے، چنانچہ جہاں ضرورت داعی ہو وہاں حق گوئی سے ادنی باک نہ ہو اور دوسری طرف اس قرب کو خالصتاً بوجہ اللہ اختیار کیا جائے اور اس میں ذاتی مفادات کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو، کیونکہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی تباہی ہے، اور ایسے قرب سے بعد ہزار درجہ بہتر ہے"(6)۔

۷۔ حکومت کے ساتھ تعاون اور مخالفت کے متعلق آپ کا طرزِ عمل:

حضرت والد صاحب قدس سرہ کا حکمرانوں کے ساتھ جو طرز عمل رہا وہ ان تمام حدود کی رعایت سے عبارت تھا آپ نے کبھی کسی حکمران کے سامنے مداہنت سے کام نہیں لیا، اور ضرورت کے مواقع پر سخت سے سخت بات کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا، لیکن ساتھ ہی آپ نے مخالفت برائے مخالفت کے بجائے ضرورت کے وقت حکومت سے تعاون اور اچھے کاموں میں اس کی حوصلہ افزائی میں بھی بخل کا مظاہرہ نہیں فرمایا۔ آپ کو دینی مقاصد کے تحت زیرِ عتاب بھی رہنا پڑا۔ایک طرف آپ کے وقار و استغناء اور دوسری طرف للہیّت اور ہمدردی و دلسوزی

کی وجہ سے حکمرانوں پر یہ بات واضح رہی کہ آپ کو نہ خریدا جا سکتا تھا، نہ ضمیر کے خلاف کسی قول و فعل پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی معاملے میں آپ کی حمایت کو تعلق یا مخالفت کو عناد پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ جس زمانے میں آپ بورڈ تعلیمات اسلام کے رکن تھے، اس دور میں آپ نے ایک دینی ضرورت کے تحت حکومت کے خلاف ایک اخباری بیان دے دیا۔ اس پر ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار نے آپ سے کہا کہ ''مفتی صاحب! آپ نے بورڈ کا ممبر ہوتے ہوئے ایسا بیان دیا، حالانکہ یہ بورڈ حکومت ہی کا قائم کردہ ہے۔'' اس پر حضرت والد صاحب نے فرمایا: ''اول تو بورڈ۔ کے ارکان حکومت کے ملازم نہیں اگر ملازم بھی ہوں تو یہ ملازمت شاید ان حضرات کے لئے تو حق گوئی میں رکاوٹ بن سکتی ہو جن کا ایک سوٹ کم از کم دو سو روپے میں بنتا ہے، اور جوتے، ٹوپی پر مزید سو روپے خرچ ہوتے ہیں، اس لئے ملازمت میرے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ رہا بورڈ کی رکنیت کا معاملہ تو شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں بفضلہ تعالیٰ اس عہدے سے استعفاء جیب میں لئے پھرتا ہوں، جب یہ رکنیت کسی دینی ضرورت کی انجام دہی میں رکاوٹ ثابت ہو گی تو انشاءاللہ استعفا دینے کے لئے چند منٹ بھی درکار نہیں ہوں گے''[7]۔

۸۔ حکمرانوں کے ساتھ آپ کا میل جول:

"حکمرانوں سے ملاقات یا ان سے میل جول بڑھانے کی باقاعدہ کوشش کرنا آپ کو بالطبع ناپسند تھا، جہاں کوئی دینی فائدہ نظر آتا وہاں بقدر ضرورت ملاقاتیں کرتے، لیکن جہاں ان ملاقاتوں سے کوئی دینی فائدہ متصور نہ ہوتا، وہاں حتی الامکان اس سے پرہیز ہی فرماتے۔

ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کے ایک بڑے دینی مدرسے کا جلسہ تھا جس کے مہتمم صاحب سے حضرت والد صاحب کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے، اس جلسے میں انہوں نے اس وقت کے صدر مملکت کو بھی مدعو کیا تھا، اتفاق سے اس وقت کے سربراہ مملکت ایک ایسے صاحب تھے جن سے حضرت والد صاحب کو دینی معاملات میں کسی خیر

کی توقع نہ تھی، اس لئے آپ نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ مجھے ان صاحب سے کبھی ملاقات نہیں کرنی، جب جلسے کا دن آیا اور صدر صاحب کی آمد آمد ہوئی تو حضرت والد صاحب نے مدرسے کے مہتمم صاحب سے فرمایا کہ ''میں ان صاحب سے نہ ملنا چاہتا ہوں، نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ ان سے میرا سامنا ہو، اس لئے آپ مجھے کوئی ایسا کمرہ بتا دیجئے جہاں میں سو جاؤں۔'' انہوں نے ایک کمرہ حضرت والد صاحب کے لئے مخصوص کر دیا، اور آپ وہاں سو گئے۔ جب صدر صاحب تشریف لائے اور انھیں مدرسے کا معائنہ کرایا گیا تو معائنے کے دوران مہتمم صاحب انھیں اس کمرے پر بھی لائے، اور اندر اشارہ کر کے فرمایا: ''اس میں مفتی محمد شفیع صاحب سو رہے ہیں''۔

صدر صاحب کے جانے کے بعد جب مہتمم صاحب نے حضرت والد صاحب سے اس واقعے کا تذکرہ فرمایا تو آپ نے کہا: ''اگرچہ میں نے آپ سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ آپ انھیں میری اس انداز سے موجودگی جتائیں، لیکن یہ اچھا ہوا، انھیں معلوم تو ہوا کہ ملک میں ایسے ''کج دماغ لوگ'' بھی موجود ہیں"[8]۔

۹۔ حکمرانوں سے استغناء اور ان کی اصلاح:

"حکمرانوں سے استغناء کے اس انداز کے باوجود ہر حکومت کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ رہا کہ آپ نے غلطیوں پر تنقید کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح اور اچھے کاموں پر حوصلہ افزائی میں کبھی اپنی انا کو آڑ نہیں بننے دیا، ان کے اچھے کاموں کی کھلے دل سے تعریف کی، اور جن حکمرانوں سے خیر کی توقع تھی ان سے ملاقاتیں کر کر کے ان سے ایسے کام کرائے جو ملک و ملت کے لیے مفید تھے، البتہ ان تعلقات میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ وہ کسی ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہ بنیں۔ چنانچہ متعدد مواقع پر آپ کو اعلیٰ سرکاری حکام کی طرف سے ذاتی مفاد کی پیش کش ہوئی، لیکن آپ نے اسے خوبصورتی کے ساتھ رد فرمادیا"[9]۔

۱۰۔ حکومتِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنا:

"آپ کی اسی للٰہیت، اخلاص، اور سلامت فکر کا ثمرہ تھا کہ سرکاری حکام اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپ سے زور کے ذریعے کوئی ناجائز مطلب برآری کی جاسکتی ہے۔ ایک مرتبہ کراچی میں علماء کا ایک اجتماع ہونے والا تھا جو حکومت کے منشاء کے خلاف تھا۔ چنانچہ ایک سرکاری عہدادار نے کراچی کے علماء کو فرداً فرداً بلا کر اجتماع میں بلانے کی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی، بعض علماء سے ان کی گفتگو ہوئی اس کا علم حضرت والد صاحب کو بھی ہو چکا تھا۔ اسی دوران انہوں نے آپ کو بھی ملاقات کے لیے بلایا۔ والد صاحب اسی خیال سے تشریف لے گئے تھے کہ اسی موضوع پر بات چیت ہو گی۔ لیکن جب آپ وہاں جا کر بیٹھے تو انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں، والد صاحب نے پوچھا بھی، کہ بلانے کا مقصد کیا تھا؟ لیکن انہوں نے کہا"جی ہاں! ابھی عرض کروں گا۔" اور پھر کوئی دوسری غیر متعلق بات شروع کر دی، والد صاحب نے پھر پوچھا کہ بات کیا تھی؟ انہوں نے پھر ٹلا دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، آخر جب تیسری بار والد صاحب نے اصرار فرمایا تو اتنا بول سکے۔

"یہ فرمایئے کہ شہر کا کیا حال ہے؟"

حضرت والد صاحب نے برجستہ فرمایا:"بہت برا حال ہے"۔

"کیوں" انہوں نے پوچھا

حضرت والد صاحب نے فرمایا:

"اس لئے کہ جس ملک کے عوام کو حکومت پر اعتماد نہ ہو اس ملک کا حال کبھی اچھا نہیں ہو سکتا اور پھر اس عدم اعتماد کی وجوہ بیان فرمائیں۔

غرض ان صاحب کو آخر تک اصل مطلب کی بات کہنے کی جرأت نہ ہو سکی، یہاں تک کہ چلتے وقت حضرت والد صاحب نے پھر پوچھا کہ " مجھے ابھی تک اپنے یہاں آنے کا مقصد معلوم نہیں ہو سکا۔" اس پر انہوں نے فرمایا" دیر کافی ہو گئی ہے، انشاءاللہ پھر کبھی آپ سے عرض کروں گا۔"اس سارے مکالمے اور پوری ملاقات کو "نصرت بالرعب" کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟جو انبیاء علیہم السلام کے صدقے میں وارثان نبی ﷺ کو بھی عطا ہوتی ہے۔

حکومت کے حلقوں سے میل جول کے دوران حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے طرز اور وضع پر مضبوطی سے قائم رہے، اور یہ اختلاط معمولی معمولی باتوں میں کبھی آپ کے طرز میں ادنی تبدیلی پیدا نہ کر سکا، سرکاری اجتماعات اور تقریبات میں گروپ فوٹو اجتماعات کا لازمی حصہ بن کر رہ گیا ہے لیکن حضرت والد صاحب ہمیشہ ایسے موقع پر الگ ہو جاتے، شروع شروع میں بعض ناواقف لوگوں نے شمولیت پر اصرار بھی کیا، لیکن جب حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ :" میں اسے شرعاً ناجائز سمجھتا ہوں۔"تو پھر لوگوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا، بلکہ مزاج شناس حکام آپ کی موجودگی میں گروپ فوٹو کھینچوانے سے کترانے لگے۔

سرکاری تقریبات میں کھڑے ہو کر کھانے کی بد مذاقی شروع سے جاری ہے، حضرت والد صاحب ایسی تقریبات میں ہمیشہ اپنا مختصر سا کھانا پلیٹ میں نکال کر دور کسی جگہ جا بیٹھتے، اور وہاں تناول فرماتے۔ایک مرتبہ شہید ملت لیاقت علی خاں صاحب مرحوم کی طرف سے دعوت تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کھانے کا انتظام تھا جسے حضرت والد صاحب "کھیل کھڑا" فرمایا کرتے تھے، حضرت والد صاحب حسب معمول اپنا کھانا لے کر کہیں جا بیٹھے، آپ کو دیکھ کر بعض دوسرے حضرات بھی وہیں آ گئے، یہاں تک کہ وہ ایک محفل سی بن گئی۔لیاقت علی خان

صاحب مرحوم دعوت میں عام مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے، کھانے کے اختتام پر وہ حضرت والد صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے:

''مفتی صاحب! کھانا کھایا تو آپ نے ہے، ہم نے تو چرا ہے''[10]۔

۱۱۔حکمرانوں کو تذکیر و تبلیغ:

''حضرت والد صاحب کا معمول تھا کہ جن حکمرانوں کے بارے میں آپ کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ہزار علمی اور فکری غلطیوں کے باوجود اسلام دشمن نہیں ہیں، ان کو خاص خاص مواقع پر دینی معاملات سے متعلق خطوط تحریر فرما دیتے تھے، یہ خطوط عموماً تبلیغی انداز کے ہوتے، اور ان میں آپ نہایت شائستگی کے ساتھ مخاطب حکمران کی بنیادی فکری اور عملی غلطیاں واضح فرما دیتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ چونکہ اپنی زندگی میں دین اور اہل دین سے دور رہے ہیں، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ دین کی ضروری باتیں تبلیغی انداز میں ان تک پہنچائیں''[11]۔

۱۲۔حکمرانوں سے تبلیغی ملاقاتیں اور ان کے نام خطوط:

''حضرت والد صاحب کا یہ معمول در حقیقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی ایک ہدایت کے مطابق تھا، جب حضرت تھانوی قدس سرہ نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کی حمایت کا فیصلہ فرمایا تو اس فیصلے کے ساتھ ساتھ علماء کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ باقاعدہ مقصد بنا کر مسلم لیگ کے رہنماؤں سے تبلیغی ملاقاتیں کرتے رہیں، اور انھیں دینی تقاضوں کے مطابق عمل کی متواتر تلقین جاری رکھیں، چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کے بعد قائد اعظم محمد علی صاحب کے پاس علماء کے کئی وفود روانہ فرمائے جن میں سے ایک میں حضرت والد صاحب قدس سرہ بھی شامل تھے، آپ اپنے شیخ کی اس ہدایت پر آخر تک کاربند رہے۔۵۸ء کے بعد چونکہ آپ کی مصروفیات دار العلوم اور اس کے ذریعے مختلف تعلیمی و تبلیغی امور انجام دہی میں سمٹ گئی

تھیں، اور دار الحکومت اسلام آباد منتقل ہو جانے کی بنا پر آپ کے لئے ملاقاتوں کا اہتمام ممکن نہ رہا تھا، اس لئے ملاقاتوں کے بجائے آپ نے ضرورت کے مواقع پر خطوط لکھ کر اس ہدایت کی تعمیل فرمائی۔ان میں سے ایک مکتوب جو عائلی قوانین سے متعلق صدر ایوب صاحب کو لکھا گیا تھا، آپ کی کتاب ''عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ'' میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

ان خطوط کا کوئی فوری فائدہ ظاہر ہو یا نہ ہو، لیکن حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ داعی کا کام بات پہنچانا ہے، اور اگر صحیح بات، صحیح نیت اور طریقے سے پہنچائی جائے تو کسی نہ کسی صورت میں وہ مؤثر ضرور ہوتی ہے، اور اس کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ اپنا ایک دینی فریضہ ادا ہو جاتا ہے، تبلیغی ملاقاتیں ہوں یا خطوط، یہ حکومت کی غلطیوں کی اصلاح کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرنے کے منافی نہیں، بلکہ ایک راستہ یہ بھی ہے کہ جسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

حضرت والد صاحب کے تبلیغی خطوط کا سلسلہ صرف پاکستان تک محدود نہیں رہا، بلکہ ۱۹۶۴ء میں آپ حج کے لئے تشریف لے گئے، برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم اور یہ ناکارہ بھی ہم سفر تھے، تو وہاں بہت سے ایسے منکرات سامنے آئے جنہیں دیکھ کر آپ کا دل دکھا، اس موقع پر آپ نے ایک مفصل یاداشت شاہ فیصل مرحوم اور وہاں کے دیگر ذمہ داروں کو پیش کی جو بعد میں شائع بھی ہوئی"[12]۔

۲

فصلِ دوم

قیام پاکستان سے قبل سیاسی جدوجہد

فصل دوم: قیام پاکستان سے قبل سیاسی جدوجہد

سیاست میں عملی طور پر حصہ:

"عملی طور پر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے میدانِ سیاست میں کب قدم رکھا؟ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی زندگی میں چار مواقع ایسے آئے جب آپ نے سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا، سب سے پہلے تحریک خلافت کے زمانے میں، دوسرے تحریک قیام پاکستان میں، تیسرے پاکستان کے قیام کے بعد یہاں اسلامی دستور نافذ کرنے کی جدوجہد میں، اور چوتھے ۱۹۷۰ھ کے الیکشن سے پہلے سوشلزم کی تردید میں"(13)۔

ا۔ تحریک خلافت میں حصہ:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی میدان میں پہلا عملی قدم تحریک خلافت میں جدوجہد تھا، مگر یہ ایک ابتدائی کوشش تھی، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

"جہاں تک تحریک خلافت کا تعلق ہے، یہ آپ کی نوعمری کا زمانہ تھا، اور چونکہ آپ کا حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے خصوصی تعلق تھا، اس لئے انہی کی سرپرستی میں انہی کے ایک معتقد د منتسب کی حیثیت سے آپ نے اس تحریک میں کام کیا، لیکن یہ کام بہت محدود بھی تھا اور نوعمری کی بناء پر اس دور کے تفصیلی حالات محفوظ نہیں رہ سکے"(14)۔

٣

فصلِ سوم

قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ

فصل سوم: قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کا دوسرا اہم باب قیام پاکستان کی تحریک میں جدوجہد تھا،اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''البتہ جب قیام پاکستان کے لیے ملک گیر تحریک شروع ہوئی تو یہ آپ کا عہد شباب تھا،اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی سرپرستی میں انہی کے ایما کے مطابق آپ نے تحریک میں بھرپور حصہ لیا جس کے قدرے مفصل حالات برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم نے "حیاتِ مفتی اعظم" میں اور جناب منشی عبد الرحمٰن خان صاحب نے اپنی مشہور کتاب "تحریک پاکستان اور علماء ربانی" میں ذکر کیے ہیں۔ نیز قیام پاکستان کے بعد آپ آخر وقت تک یہاں اسلامی دستور قانون کے نفاذ کی عملی جہد وجہد میں حصہ لیتے رہے،شروع کے تقریباً دس سال تو شب وروز اس کوشش میں گزرے،بعد میں زیادہ توجہ تعلیمی اور تصنیفی مشاغل کی طرف ہوگئی،اور عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے،لیکن نفاذ اسلام کی کوشش سیاست سے علیحدہ رہ کر بھی جاری رہیں''(15)۔

۲۔ تحریک قیام پاکستان میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا ناقابل فراموش کردار:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک قیام پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی تقریر، تحریر اور عملی جدوجہد سے اس تحریک کو جلا بخشی،آپ اس تحریک کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، تحریک قیام پاکستان میں آپ کی جدوجہد کا پس منظر تحریر کرتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

''حضرت شیخ رحمہ اللہ کے دار العلوم کے تدریسی زمانہ سے ہی وہ کڑا وقت آچکا تھا جب کہ مسلمان مغربی استعمار کے ظلم و ستم تلے پس رہے تھے اور دار العلوم کے علماء ابتداء ہی سے اس کے لیے کوشاں رہے کہ مسلمانوں کو مغربی استعمار کے ظلم و سربریت سے نجات دلائیں، اس جد وجہد میں شیخ الہند حضرت محمود حسن رحمہ اللہ وہ اولین شخصیت تھے، جنہوں نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنی پوری زندگی وقف فرمادی اور اسی ناکردہ جرم کی سزا میں آپ نے جزیرہ ''مالٹا'' میں سخت ترین قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی اور ظلم و ستم سہتے رہے، آپ رحمہ اللہ کی یہ جد وجہد تاحیات جاری رہی اور آپ اس دار فانی سے کوچ فرما کر رحمت الٰہیہ کی طرف منتقل ہو گئے۔

انہی اکابر کی قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں آزادی کا شعور بیدار ہوا اور ان کے دلوں میں حریت کی تمنائیں اور امنگیں پنپنے لگیں، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس حقیقی مقصد کو صحیح معنوں میں نہ سمجھ سکے، جس کے لیے ان اکابر نے یہ قربانیاں دیں تھی، اور اس پست فکری کے نتیجے میں وہ ہندوؤں کی سازش کا شکار ہو گئے اور آزادی کے بعد ہندوؤں نے جمہوریت کا ڈھنڈھورا پیٹ کر انہیں اپنے ساتھ حکومت میں شامل کر لیا''(16)۔

قیام پاکستان کے لیے سرگرم جد وجہد:

مفتی اعظم پاکستان نے اپنے اکابرین کے ہمراہ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، انہوں نے دو قومی نظریے کے فروغ کے لیے مختلف مواقع پر لوگوں کی ذہن سازی کے لیے مؤثر خطابات کیے، مضامین لکھے، اور اس عظیم مقصد کے لیے انھوں نے فتاویٰ کا سہارا بھی لیا۔ حافظ اکبر شاہ بخاری کہتے ہیں:

"قیام پاکستان کے مسئلے میں عام فتاویٰ اور متفرق مضامین کے علاوہ آپ نے 1364ھ، مطابق 1945ء میں ایک مستقل رسالہ کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ "تصنیف فرمایا، جس میں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے واضح فرمایا، اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی، جس

میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کی موالات، مصالحت اور استعانت کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام بے انتہا تفصیل سے جمع کیے گئے، دلائل میں حضرت مفتی اعظمؒ نے اپنی عادت کے مطابق قرآن وسنت اور فقہی عبارات کے نہایت معتمد شواہد پیش کیے اور عقل و سیاست کے ہر پہلو سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ حالات میں کانگریس کی حمایت سے دراصل کفر کی حمایت لازم آئے گی اور اس میں حصہ لینا قرآن وسنت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں"[17]۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف سید قاسم محمود لکھتے ہیں کہ :

"حضرت مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں اور قیام پاکستان کے بعد بھی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں، آپ نے تحریک قیام پاکستان میں اپنے شیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایماء پر حصول پاکستان کی تاریخی جدجہد میں نمایاں کردار ادا کیا، علامہ شبیر احمد عثمانی کی معیت میں مسلم لیگ کی حمایت میں پورے ہندوستان کے دورے کیے، مطالبہ پاکستان کی حمایت میں کانگریس اور مسلم لیگ کی شرعی حیثیت میں فتویٰ دیا، جس میں کانگریس کی شمولیت کو کفر کی حمایت قرار دیا گیا"[18]۔

قیام پاکستان کے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متعلقین کا نظریہ:

قیام پاکستان کے حوالے سے جو جذبہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں کارفرما تھا وہ دراصل آپ کے شیخ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عطاء فرمودہ تھا، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تلامذہ اور متعلقین کی تربیت ہی اسی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کی تھی، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

''حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ عرصہ دراز سے یہ نظریہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی دین ودنیا کی فلاح وکامرانی اسی میں ہے کہ ایک مستقل آزاد اسلامی مملکت معرض وجود میں آئے، جہاں مسلمان آزادی سے احکام شریعت پر عمل پیرا ہوسکیں اور سچے اور پکے مسلمان بن کر امن وآشتی کے ساتھ پر سکون زندگی بسر کرسکیں ،اس نظریہ کی رو سے مسلمانوں کے سامنے صرف یہی ہدف نہیں تھا کہ وہ مغربی استعمار سے آزادی حاصل کریں بلکہ درحقیقت ان کے دو میدان عمل تھے:

مغربی استعمار سے حریت وآزادی، اور ایک مستقل اسلامی مملکت کی تاسیس، جس میں نہ تو ہندو شریک ہوں اور نہ ہی کوئی اور کفریہ ملت۔

اس پیچیدہ اور سنگین صورت حال میں اس وقت جتنی آزادی کی تحریکیں تھیں ان کے پیش نظر صرف یہی ہدف تھا کہ سامراجی قوتوں سے نجات حاصل کی جائے اور آزادی کا حقیقی مقصد ذہن سے محو ہونے کے باعث ان کے مد نظر یہ رہا ہی نہیں کہ اس مشترکہ خطے کی تقسیم دو قومی نظریہ کی بنیاد پر مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہونی چاہیے جو درحقیقت ملکی تقسیم کی رو سے نہ صرف یہ فکری پستی تھی کہ بلکہ اس سے مسلمانوں میں یہ فکر اجاگر ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگ ایک قوم ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر ،اور ان کا خیال یہ تھا کہ ہم تو بس انگریزی استعمار سے آزادی چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے مومن مسلمان اور کافر ہندو دونوں کی حیثیت یکساں ہی کیوں نہ تصور کرنی پڑے اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ مسلمان علماء کی بھی ایک بہت بڑی جماعت اس نظریہ کو صحیح معنوں میں سمجھنے میں لغزش کا شکار ہوگئی اور انہوں نے اسی رائے کو یہ گمان کرتے ہوئے قبول کرلیا کہ انگریزوں سے آزادی کا اس سے سوا کوئی راستہ ہی نہیں کہ مسلمان اور ہندو مشترکہ طور پر ایک کمیونٹی کی حیثیت کے ساتھ رہیں۔

لیکن حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے فکری بلندی اور حد درجہ دور اندیشی عطا فرمائی تھی، چنانچہ وہ اس نظریہ سے کبھی متفق نہ ہوئے کیوں کہ وہ اپنی عاقبت اندیشی اور فراست وبصیرت کی روشنی میں اس بات کا بخوبی ادارک رکھتے تھے کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہندوؤں کی اکثریتی حکومت مسلمانوں پر مغربی استعمار سے زیادہ ستم ڈھائے گی اور ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور اختلاط برتنے کے نتیجے میں مسلمانوں کے عقائد وافکار، عادات واطوار، آداب واخلاق اور رفتار و گفتار پر جس خطرناک حد تک منفی اثرات مرتب ہوں گے اس کی تلافی انتہائی مشکل ہو جائے گی، اور ان کے اسلامی و دینی اقدار رفتہ رفتہ بالکلیہ ختم ہو جائیں گے، اور ایک وقت آئے گا کہ ان کی آئندہ نسلیں اپنے عظیم علمی ودینی ورثہ سے اس طرح محروم ہو جائیں گی کہ اسلام کا کلمہ طیبہ تک ان کے ذہن وادارک سے محو ہو جائے گا۔

اس دیرینہ فکر کو عملی شکل دینے کے لیے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا رہی کہ اس اسلامی نظریاتی دعوت کو عام کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک تنظیم ہو، جو اس دعوت کے ذریعے مسلمانوں کی فکری تعمیر کرے اور وطن کے ان بتوں کی بیخ کنی کرے جنہیں نبی کریم نے صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا''(19)۔

''جمعیت علماء اسلام'' کی بنیاد:

جیسا کہ گزشتہ تحریر میں ذکر ہوا کہ قیام پاکستان مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تمنا تھی، جس کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنی زندگی میں جدوجہد کی اور اپنے تلامذہ کی ایک جماعت تیار کی جو بعد میں جا کر قیام پاکستان کی تحریک کے رہنما بنے۔ اسی جدوجہد کی ایک کڑی "جمعیت علماء اسلام" کی بنیاد رکھنا تھا۔ مفتی محمد تقی عثمانی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تمنائیں بر آئیں اور علیحدہ ریاست ''پاکستان'' کا نعرہ لے کر "مسلم لیگ'' میدان میں اتری، تو آپ نے تمام مسلمانوں اور علماء کو اس کی حمایت کے لیے دعوت فکر دی، اور آپ کی دعوت پر مسلمانوں

اور علماء کی ایک بہت بڑی تعداد نے لبیک کہا، جس کے ہر اول دستہ میں شیخ الاسلام داعیٔ کبیر مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور شیخنا و مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ قائدانہ حیثیت سے شامل تھے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے علماء کرام کی تنظیم ''جمعیت علمائے اسلام'' کی بنیاد رکھی اور یہی وہ سب سے پہلی تنظیم تھی جس نے اس راستے میں بڑی جدوجہد اور مسلمانوں کی حفاظت دین کے لیے بالخصوص باہمی اتحاد و یگانگت کا درس دیا اور علیحدہ وطن پاکستان کی تشکیل کے لیے ان کی فکری تعمیر کی''[20]۔

''جمعیت علماءاسلام'' کی تشکیل کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''نومبر ۱۹۴۵ء تقریباً ۶۴ھ میں کلکتہ میں جمعیت علماء اسلام کی بنیاد ڈالی گئی جس کے مقاصد میں سرفہرست یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان کے لئے موثر جدوجہد کی جائے اور جو مسلمان مطالبہ پاکستان سے منحرف یا تردد کی حالت میں کھڑے ہیں انہیں قیام پاکستان کی مجاہدانہ جدوجہد میں شریک کیا جائے۔ اس جمعیت کے سب سے پہلے صدر غائبانہ طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی چنے گئے۔

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری نے والد ماجد کو اس جمعیت میں شرکت کی دعوت دی تو آپ نے یہ جواب دیا کہ کہ ہنوز میرا اس پر شرح صدر نہیں۔ خوف یہ ہے کہ علماء کے ایک طبقہ سے کانگریس غلط فائدہ اٹھا رہی ہے، باقی طبقہ علماء مسلم لیگ غلط طور پر آلہ کار بنالے، اس طرح کہیں علماء دین کی آزادی ضمیر دوسروں کی دست نگر ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی تردد کی بناء پر تحریک پاکستان کی مکمل حمایت کے باوجود آپ ایک عرصہ تک اس جمعیت کے باضابطہ رکن نہیں بنے۔

مگر تحریک پاکستان کی روزافزوں ضرورت نے اس حالت پر دیر تک قائم رہنے نہ دیا۔ اور جو خدشات آپ کے دل میں تھے، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی جیسی عظیم قیادت کی موجودگی میں ان کی بھی کوئی وجہ نہ رہی

چنانچہ جمعیت کے اجلاس کانپور میں جمعیت کی باضابطہ رکنیت اختیار فرمائی اور ساتھ ہی آپ کو عاملہ کارکن بھی نامزد کر دیا گیا''[21]۔

تقسیم ہند کے نظریہ میں علماءِ دیوبند کے دو گروہ:

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب تحریک قیام پاکستان چلی تو اس وقت علماء دو جماعتوں میں منقسم ہو گئے، علماء کی ایک جماعت اس تحریک اور تقسیم ہندوستان کی حامی تھی، اور دوسری جماعت اسے مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتی تھی، اس حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رقم طراز ہیں:

''جس زمانہ میں حضرت والد صاحب دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی اور تدریس کے منصب جلیل پر فائز تھے، اسی زمانہ میں مسلم لیگ نے کانگریس کے علی الرغم مسلمانان برصغیر کے لئے ایک آزاد و خود مختار وطن پاکستان کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر اکابر دیوبند اپنی دیانت دارانہ رائے کی بناء پر دو مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ جمعیت علمائے ہند کے سرکردہ زعماء کا تھا جو کانگریس کے ہم آواز ہو کر متحدہ قومیت کا حامی اور تقسیم ہند کے خلاف۔ اور مطالبہ پاکستان کو مسلمانوں کے لئے مضر سمجھتا تھا۔

دوسرا گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اور حضرت والد صاحب وغیرہ ہما پر مشتمل تھا، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی رائے کے مطابق مسلمانان ہند کو کافروں کی غلامی اور استبداد سے نجات دلانے کے لئے قیام پاکستان کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتا تھا اور جس طرح کا اشتراک اب بعض مسلم جماعتیں کانگریس کے ساتھ کرنے لگی تھیں اسے درست نہ سمجھتا تھا۔

شروع میں یہ اختلاف آپس کے تبادلہ خیالات، علمی مباحثوں اور دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود رہا۔ لیکن پاکستان کے لئے ہونے والا الیکشن جوں جوں قریب آ رہا تھا مخالفین کا یہ پروپیگنڈا زور پکڑتا جا رہا تھا کہ مسلم لیگ

بے دین امراء کی نمائندہ جماعت ہے، اسے علماء کی تائید حاصل نہیں۔ادھر ارباب مسلم لیگ بھی محسوس کر رہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علماء کرام بھرپور تعاون نہ فرمائیں پاکستان کا قیام ممکن نہیں''[22]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا تحریک پاکستان کی خاطر دارالعلوم دیوبند سے استعفاء:

قیام پاکستان کے نظریہ کے اس اختلاف کا اثر علماء دیوبند پر بھی پڑا اور دار العلوم دیوبند کے علماء بھی دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے، جیسا کہ گذشتہ تحریر میں اس کا تذکرہ ہو چکا۔اس موقع پر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بہت بڑی قربانی دی اور دار العلوم دیوبند سے استعفاء دے دیا، جس کی سرگذشت مفتی محمد رفیع عثمانی یوں تحریر فرماتے ہیں:

''اب وقت آگیا تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو عوام کے سامنے لایا جائے اور پاکستان کا مطالبہ سیاسی و شرعی حیثیت سے جیسا کہ حق بجانب، بروقت اور ضروری ہے، اس کا صرف اظہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی آواز پوری قوت سے پہنچائی جائے۔دار العلوم دیوبند میں رہتے ہوئے اس اختلاف کا مسلسل اظہار نظم دار العلوم کے لئے مناسب نہ تھا۔اس لئے حضرت تھانوی کے مشورہ سے دار العلوم سے علیحدگی کا فیصلہ فرمالیا۔

یہ فیصلہ ان حضرات کے لئے جتنا صبر آزما تھا، اس کا اندازہ ہر ایک کو نہیں ہو سکتا، ان حضرات نے اپنے بچپن، جوانی اور کہولت کے شب و روز اسی چہار دیواری میں گذارے تھے، زندگی کی ولولہ انگیز توانائیاں اسی کی تعمیر میں صرف کی تھیں، ان حضرات کے لئے یہ صرف ایک درسگاہ نہیں بلکہ دنیا و آخرت کی امیدوں کا مرکز تھا، دار العلوم ان کا وطن بھی تھا، آغوش مادر بھی۔لیکن ملک و ملت کی خاطر اب اس آغوش مادر سے ضابطہ کا تعلق باقی رکھنا ممکن نہ تھا۔بالآخر ۱۶ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ کا وہ دن آپہنچا، جب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب آپ کے برادر عم زاد حضرت مولانا ظہور احمد صاحب، جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب اور دیگر و علمائے کرام جن کے اسماء

گرامی اس وقت یاد نہیں، دار العلوم کی خدمات سے مستعفی ہو گئے۔ان میں سے ایک غالباً مولانا محمد مسلم صاحب عثمانی تھے۔

استعفاء کے بعد آپ کی تھانہ بھون حاضر ہوئی تو حضرت تھانوی نے دیکھتے ہی "دیوان حماسہ "کا ایک مصرعہ کچھ تصرف کر کے اس طرح پڑھا:

أَضَاعُوْكَا وأَيَّ فَتَى أَضَاعُوْا[23]

ترجمہ: "لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھ سے کھو دیا اور وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے"۔

۱۳۳۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تدریس وافتاء کی ۲۷ سالہ خدمات کے بعد جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو مشاہرہ ۶۰ روپے تھا۔ مسلم لیگ کی تحریک جو دو قومی نظریہ پر مبنی تھی، حکیم الامت حضرت تھانوی اس کی حمایت ۱۳۵۶ھ (تقریباً ۱۹۳۷ء) ہی سے اپنی تحریروں کے ذریعہ فرمارہے تھے"[24]۔

دار العلوم دیوبند سے استعفیٰ کے بعد قیام پاکستان کی جدوجہد میں تسلسل:

دار العلوم دیوبند میں قیام کے دوران تحریک پاکستان میں آپ کی جدوجہد واجبی سی تھی، مگر دار العلوم دیوبند سے استعفاء کے بعد گویا آپ نے اپنے آپ کو اس کام لیے وقف کر دیا تھا، مفتی محمد رفیع عثمانی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"تحریک پاکستان میں والد صاحب کا حصہ بھی شروع میں محض علمی خدمات تک محدود رہا، دار العلوم سے استعفاء کے بعد آپ نے پوری طرح کھل کر اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور کچھ عرصہ بعد تو قیام پاکستان کی جدوجہد ہی شب روز کا مشغلہ بن گئی تھی"[25]۔

نیز مفتی محمد تقی عثمانی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ دن رات اسی تگ ودو میں لگے رہے اور ان کا مطمح نظر تشکیل پاکستان کے لیے سیاسی جدوجہد پر مرکوز ہو کر رہ گیا، کیوں کہ وہ اس بات کا ادارک کر چکے تھے کہ مغربی استعمار سے مسلمانوں کی نجات کا یہی راستہ ہے، دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اکابر علماء کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو نظریہ پاکستان کا حامی نہیں ہے، تو انہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے دار العلوم میں افتاء وتدریس کے مشغلے کے لیے اس نازک وقت کو مناسب نہیں سمجھا اور اس کے علاوہ فی الوقت درس وتدریس اور افتاء کے اس عظیم مشغلہ کو چھوڑنے کے سوا اپنے لیے کوئی چارہ کار نہیں سمجھا، جس کے لیے آپ نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ وقف کیے رکھا اور بالآخر ۱۳۶۲ھ میں آپ نے افتاء وتدریس کو موقوف فرما کر اپنا سارا وقت پاکستان کی تشکیل کے لیے مختص فرمایا اور اس غرض سے ہندوستان واطراف میں تسلسل کے ساتھ دورے کیے اور زبان وقلم ہر دو ہتھیاروں سے مسلمانوں میں فکری بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں کفار کے مکر وفریب اور مکروہ عزائم سے باخبر کیا''[26]۔

کانگریسی نظریہ کی تردید اور پاکستان کی حمایت میں تصانیف:

چونکہ تحریک قیام پاکستان اور اس کے متوازی نظریے میں آپ قیام پاکستان کے پرجوش حامی تھے، اس لیے آپ نے اس موضوع پر متفرق مضامین کے ذریعے علماء اور عام لوگوں میں ایک جذبہ پیدا کیا، اس حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اس مسئلہ میں عام فتاوی اور متفرق مضامین کے علاوہ آپ نے ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں ایک مستقل رسالہ ''کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ ''تصنیف فرمایا۔ جس میں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے واضح فرمایا، اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی جس میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کی موالات، مصالحت اور استعانت کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام اتنی خوبی اور تفصیل سے جمع کئے گئے

،دلائل میں حضرت والد صاحب نے اپنی عادت کے مطابق قرآن وسنت اور فقہی عبارات کے نہایت معتمد شواہد پیش کئے اور عقل وسیاست کے ہر پہلو سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ حالات میں کانگریس کی حمایت سے دراصل کفر کی حمایت لازم آئے گی اور اس میں حصہ لینا قرآن وسنت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں۔ یہ رسالہ اسی وقت بڑی تعداد میں شائع ہوا۔

علاوہ ازیں اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی کے دس رسائل، متفرق مضامین اور ملفوظات ومکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کر کے کتابی شکل میں ''افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ'' کے نام سے شائع فرمایا۔ یہ مجموعہ بھی اس موضوع پر بہت موثر ثابت ہوا''[27]۔

تحریک پاکستان کے لیے بروقت ایک اہم فتویٰ:

۱۹۴۵ء کے انتخابات سرپر تھے، سہارنپور اور مظفر نگر کے عوام اور علماء ابھی کانگریس ومسلم لیگ کو ووٹ دینے میں متذبذب تھے، اس موقع پر آپ نے ایک بہت ہی اہم فتوی دیا، جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کو واضح کامیابی حاصل ہوئی، اس حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات تحریک پاکستان کے لئے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

سہارنپور اور مظفر نگر وغیرہ کے حلقہ انتخاب سے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی جانب سے قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم کھڑے ہوئے جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے، یہاں مسلم لیگ کی کامیابی سب ہی کو مشکل نظر آرہی تھی مگر حضرت والد صاحب کے ایک فتوے نے فضا یکسر بدل دی۔ مجھے یاد ہے کہ یہ فتوی پوسٹروں کی شکل میں پورے حلقہ انتخاب میں چسپاں کیا گیا جس کا بڑا عنوان یہ تھا ''کانگریس کی حمایت کفر کی

حمایت ہے'' یہ پورا پوسٹر احقر کے پھوپی زاد جناب مولانا حامد حسن انصاری صاحب فاضل دار العلوم دیوبند سہارنپور سے دیوبند بھی لائے اور پولنگ سے ایک روز قبل راتوں رات دیوبند میں چسپاں کئے گئے۔

جناب خواجہ آشکار حسین صاحب نے جو مسلم لیگ کی ہائی کمان کی جانب سے اس حلقہ کا جائزہ لینے پر مامور تھے۔ماہنامہ نقاد (کراچی) میں یہ واقعہ قدرے تفصیل سے تحریر کیا ہے اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

''سب سے سخت مقابلہ خود لیاقت علی خان کے حلقہ انتخاب میں تھا۔''

آگے فرماتے ہیں کہ:

''ہم سہارنپور پہنچے، وہاں حامیانِ لیگ نے کہا کہ یہاں مفتی محمد شفیع کے فتوے کے بغیر کام نہ چلے گا، میں نے دیوبند جاکر موصوف کا فتوی بھی حاصل کیا اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔ ۲۷ نومبر کو پولنگ ہونے والی تھی۔ ۲۴ نومبر کو لیاقت علی خان سہارنپور پہنچے۔''

فاضل مضمون نگار آگے فرماتے ہیں:

''میں فوراً ڈاک بنگلہ پہنچا۔ لیاقت صاحب بڑے جوش سے بغل گیر ہوئے اور فتوے کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ میں نے فوراً مفتی صاحب کا فتوی پیش کر دیا۔ دیکھ کر اچھل پڑے پھر حالات کے متعلق استفار کرنے لگے''(28)۔

تقسیم سے قبل دورۂ سندھ:

"جمعیت کے قیام کے بعد ہی آپ نے اس تحریک کی تقویت کے لیے تگ ودو شروع کی اور دورۂ سندھ اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو جمیعت علماء اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرس حیدر آباد سندھ میں منعقد ہوئی۔اس کی صدارت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کو کرنا تھی مگر بروقت ان کو شدید علالت پیش آگئی تو حضرت والد صاحب کو اس کانفرنس کی صدارت کے لئے سندھ روانہ کیا۔بھائی جان اس دورہ میں بھی دیوبند سے ساتھ آئے تھے۔

یہاں کے علماء وعوام کے عظیم الشان تاریخی اجتماع میں آپ نے جو خطبہ صدارت پڑھا، سیاست کے اسلامی اصولوں کا بے نظیر مرقع ہے، اس میں آپ نے سیاسی قیادت کے شرعی اصول اور غیر اصول اور غیر صالح امیر کی اطاعت کے شرعی حدود پر سیر حاصل بحث فرمانے کے بعد معترضین کے جوابات اور علماء وعوام کے فرائض دل نشین انداز میں بیان فرمائے۔ یہ خطبہ صدارت اس زمانہ میں ہزار ہا کی تعداد میں طبع ہوا لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی،،(29)۔

قائداعظم کی قیادت پر ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اسی کانفرنس میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے قائداعظم کی قیادت پر اعتراض کو بھی انتہائی مدلل انداز سے رفع کیا کیونکہ کانگریسی خیال رکھنے والے مسلمان جو گاندھی جی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت کو شرعاً جائز قرار دے رہے تھے ان کا ایک بڑا اعتراض مسلم لیگ پر یہ تھا کہ اس کے لیڈر علم دین سے بے بہرہ اور اسلامی شعائر سے بے پرواہیں۔اس لئے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے بجائے کانگریس کی حمایت کرنا چاہیے اور اسی طرح کے مزید شبہات کو بھی رفع کیا، ذیل میں آپ کے خطبہ صدارت کا ایک اہم اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"مسئلہ قیادت:

اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر و قائد ہونا اور چیز ہے اور امارت شرعیہ اور چیز ہے۔ بہت سے شبہات صرف یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دے کر اس کے احکام اس پر جاری کئے جاتے ہیں اور اس کی تمام شرائط وصفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناب کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائد اعظم قرار دیا ہے، نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں ان سے حلال و حرام کے احکام میں فتوی لیا جائے گا۔ یا اس حیثیت سے کہ وہ کوئی شیخ و مرشد ہیں ان سے اصلاح اعمال کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک مسلمان بھی یہ خیال لے کر ان کو قائد نہیں کہتا، ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لئے تسلیم کی کہ انگریز اس وقت خواہ بین الاقوامی مقتضیات سے یا اندرونی چیخ وپکار سے متاثر ہو کر جس قسم کی بھی آزادی ہندوستان کو دینا چاہتا ہے، ہندو اپنی عددی اکثریت، مستحکم، تنظیم اور بے حد و شمار سرمایہ کے بل بوتے پر اس کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم اور ہندوستان کی عام اقلیتوں کو اپنا غلام بنائے رکھے، اس کے لئے اس وقت جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں محض آئین اور قانون کی ہے۔

اور ادھر باتفاق موافق و مخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لئے مسٹر محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں نہیں بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں۔ کس قدر بدنصیبی ہے اس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کو میدان عمل میں بڑھانے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لئے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقوی وطہارت کے خاص اوصاف نہیں پاتی۔ ریل، موٹر، جہاز کا ڈرائیور اور کپتان

مقرر کرنے کے وقت بڑے سے بڑا متقی، دین دار اور دانشمند صرف اس کا اطمینان کر لینا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے یا نہیں۔ اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال وافعال کا اچھا ہونا نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہو سکتا نہ شرعاً۔

اس پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کاموں میں کے لئے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں تو اس سے گاندھی اور نہرو کی قیادت کا جواز بھی نکل آیا۔ کیونکہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کا مشاہدہ ہو جانے کے بعد ان کی مثال اس ڈرائیور کی سی ہے جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ اس نے موقع پایا تو ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس کی گاڑی میں سوار ہو کر اپنی جان اس کے سپرد کر دینا عقلاً جائز ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔

اس میں شبہ نہیں کہ تقوی وطہارت اسلام کا مقصود اعظم ہیں اور مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے اگر متقی پارسا آدمی میسر آجائیں تو بلاشبہ سعادت کبری اور موجب برکات ہے لیکن جو کام لینا ہے اس کا ماہر اگر کوئی متقی موجود نہ ہو یا وہ کام کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو یا اس کو اسباب میسر نہ ہوں تو غیر متقی ماہر فن سے وہ کام لینا آج اس شر القرون اور فسق وفجور کے زمانہ میں نہیں بلکہ خیر القرون میں بھی جرم نہیں سمجھا گیا"[(30)]۔

شرعی دلائل:

"حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "السیاستہ الشرعیہ" میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (جو جلیل القدر تابعی اور حضرت عمر فاروق کے نقش قدم پر امور خلافت کو انجام دینے کے سبب عمر ثانی کہلاتے تھے) آپ کے کسی صوبہ دار حاکم نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں ایک فوجی عہدہ کسی شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور دو آدمی میری نظر میں ہیں ایک تو نہایت قوی اور فنون حرب سے واقف ہے مگر متقی، پابندِ شرع نہیں اور دوسرا نہایت متقی پارسا ہے، مگر قوی اور ماہر فن نہیں۔

آپ فیصلہ فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو یہ منصب سپرد کروں؟

آپ نے جواب میں کہا کہ:

''قوی کی قوت تو مسلمانوں کے کام آوے گی اور اس کے برے اعمال کی خرابی اس کی ذات کو پہنچے گی اور متقی کا تقوی اس کی ذات کیلئے اور اس کا ضعف یا ناواقفیت سے جو نقصان ہوگا وہ سب مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے اس کام کے واسطے قوی غیر متقی کا انتخاب کرنا چاہیے''[31]۔

ہندو اور مسلمان دو متضاد ملتیں ہیں:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے درج بالا خطبہ میں ببانگ دہل یہ واضح کر دیا کہ مسلمان اور ہندو دو مختلف و متضاد ملتیں ہیں اور ایک ہی سرزمین پر ان کا اجتماع اب ممکن نہیں، چنانچہ آپ نے قرآن وسنت اور تاریخ کے جو ٹھوس دلائل اس مسئلہ پر ذکر کیے ہیں، قابل دید ہیں۔ غرض شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی قیادت میں ان حضرات نے انتھک جدوجہد اور مجاہدانہ سرگرمی سے کام لے کر قرآن وسنت کے دو اٹل قانون مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کر دیئے۔ ایک یہ کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک ملت ہیں اور کافر بالکل دوسری ملت۔ یہ متضاد ملتیں بھائی بھائی نہیں ہو سکتیں۔ وطن کی بنیاد پر انہیں ایک قوم یا ایک برادری نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرا یہ کہ مسلمان دینی اعتبار سے کتنا بھی گیا گزرا ہو مگر کافر و مشرک سے بہر حال بہتر ہے۔ ہندو اکثریت کی حکومت کو اپنے اوپر اپنے اختیار سے مسلط کرنا مسلمانوں کے لیے کسی حال میں جائز نہیں۔ ان اکابر علماء کی تصانیف فتاوی اور تحریروں و تقریروں سے مسلمانوں پر جب یہ بات واضح ہو گئی کہ قیام پاکستان کا مطالبہ در حقیقت قرآن وسنت کے اصولوں پر مبنی ہے اور کانگریس کا پھیلایا ہوا کافرانہ جال مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نکال کر ہندوؤں کی بدترین غلامی میں پھانسنے کے لیے بنایا گیا ہے تو وہ جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوتے چلے گئے۔ آپ نے ایک مغالطہ کہ حضرت شیخ الہند نے بھی تو ہندوؤں کے ساتھ اشتراک کیا تھا، اب یہ اشتراک کیوں

جائز نہیں؟اپنے رسالہ "مسلم لیگ اور کانگریس" کے متعلق شرعی فیصلہ میں اس کا نہایت تفصیل جواب دیا، جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

''حضرت شیخ الہند نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کو اس لئے گوارا کیا تھا کہ اس وقت قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی ہندو اس قیادت کے پیچھے چل رہے تھے چنانچہ اگر ہندوستان اس وقت آزاد ہوا ہوتا تو حکومت مسلمانوں کو ملتی۔ ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام میں کافروں سے جزوی طور پر مدد لینا فی نفسہ کوئی ناجائز کام نہیں اور اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ کانگریس کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر پورے ہندوستان کا مرکزی اقتدار کانگریس کو ملا تو پورے ملک پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور اپنے اختیار سے کسی کافر حکومت کو اپنے اوپر مسلط کرنے کی اسلام کسی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ حضرت شیخ الہند نے بھی اسے کبھی جائز قرار نہیں دیا''[32]۔

قیام پاکستان کا تاریخ ساز فیصلہ:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور مسلمانانِ ہند کی محنتیں آخر کار رنگ لائیں اور پاکستان وجود میں آگیا، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ قائد اعظم کی دعوت پر اسی سلسلے کے ایک اہم اجلاس میں شریک ہوئے جس کی روداد مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''چنانچہ ۲۷ نومبر ۴۵ء کے انتخابات جو متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کیلئے ہوئے تھے، ان میں تمام مسلم نشتیں مسلم لیگ کو ملیں۔ یہ سو فیصد کامیابی قیام پاکستان کے لئے سنگ میل ثابت ہوئی، کیونکہ اسمبلی کو ہندوستان کا آئین بنانا اور ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ بھی بڑی حد تک اسی کو کرنا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کالوہا منوالیا اور ثابت کر دیا کہ مسلمان ہندؤوں کی غلامی کے لئے تیار نہیں۔ بالآخر انگریز، ہندو، سکھ تینوں قوموں کو مطالبہ پاکستان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا، اور تقسیم ہند کے لئے ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ طے ہو گئی۔

قیام پاکستان اور تقسیم ہند کا جو نقشہ تجویز کیا گیا تھا اس پر غور کرنے کے لئے ۹ جون ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے مرکزی اسمبلی کے تمام مسلم ارکان کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔

اگرچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت والد اسمبلی کے رکن نہ تھے، مگر خصوصی دعوت پر دونوں حضرات بھی کانفرس میں شریک ہوئے۔ اجلاس نے متفقہ طور پر قیام پاکستان کا مجوزہ نقشہ منظور کر لیا"(33)۔

پہلا جشن آزادی اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ:

قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے جشن کا جوش ولولہ دیکھنے کے لائق تھا، مفتی محمد رفیع عثمانی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"سب سے پہلا جشن آزادی منایا جانے والا تھا، اس میں شرکت کے لیے دیوبند سے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت والد صاحب کو بھی مدعو کیا گیا لیکن حضرت والد صاحب شدید علالت کے باعث سفر نہ فرما سکے۔ حضرت شیخ الاسلام کراچی تشریف لے آئے اور قائد اعظم کی خواہش پر اس تقریب میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم آپ ہی نے اپنے دست مبارک سے بلند فرمایا۔ ادھر مشرق پاکستان ڈھاکہ میں پرچم کشائی کی رسم حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے انجام دی"(34)۔

٤

فصلِ چہارم

قیام پاکستان کے بعد آپ کی خدمات

فصل چہارم: قیام پاکستان کے بعد آپ کی خدمات

سلہٹ اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم اور آپ کا دورۂ صوبہ سرحد:

ہندو انگریز گٹھ جوڑنے نے قیام پاکستان کے فیصلہ میں ایک شق یہ بڑھادی تھی کہ سلہٹ اور صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہوں یا بھارت ہیں؟اس کا فیصلہ وہاں عوام سے بذریعہ ریفریڈم (استصواب) کرایا جائے۔حالانکہ ۴۵ء کے انتخابات میں یہاں کے مسلمان بھی ووٹ پاکستان کے حق میں دے چکے تھے، مگر یہ شق پنڈت نہرو نے اس وجہ سے رکھوائی تھی کہ صوبہ سرحد میں اس وقت کانگریسی وزارت قائم تھی جو خان برادران چلارہے تھے،اس کانگریسی وزارت نے بھی گاندھی اور نہرو کے عزائم کے لئے فضا خوب بنائی تھی اور پاکستان کے حامی سیکڑوں علماء کرام کو جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔اس لئے اکثر مسلمانوں کو سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفریڈم کی بڑی فکر تھی۔

مفتی محمد رفیع عثمانی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

> ''جب تک قیام پاکستان کا فیصلہ نہ ہوا تھا،کانگریس کی طرف سے ایک ہی رٹ لگائی جارہی تھی کہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیں،ہندو مسلم،سکھ وغیرہ خواہ کسی صوبے کے باشندے ہوں،سب مل کر ایک قوم ہیں،ان کا وطن بھی ایک ہونا چاہیے لہذا مسلمانوں کی الگ حکومت پاکستان قائم کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا ۔اس پورے عرصہ میں کسی نے پختونستان کا نعرہ بلند نہیں کیا،حالانکہ ہندوستان جو چودہ پندرہ صوبوں کا ملک تھا اس میں صوبہ سرحد کی حیثیت ایک چھوٹے سے صوبے کی ہوتی اور متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں اقتدار ہمیشہ ہندؤوں کے ہاتھ میں ہوتا۔

سرحدی گاندھی اور ان کے ساتھیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے، مرکز میں ہندوؤں کا اقتدار ہو، اور صوبہ سرحد کی غیور مسلمان ہندوؤں کے زیر نگیں ہوں، لیکن جب انگریز اور ہندوؤں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا تو پاکستان کا ہر صوبہ انھیں الگ قوم نظر آنے لگا اور صوبائی قومیت کی بنیاد پر انھوں نے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مفتی اعظم محمد شفیع صاحب کے دورہ سرحد سے پہلے ہی یہاں پختونستان کا نعرہ بلند کرایا۔ چنانچہ:

''سرحد کی کانگریس پارٹی، خدائی خدمت گار اور زئی پختون کی ایک مشترکہ نشست منعقد ہوئی جس میں ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے گا۔ یہ جلسہ سوکڑی ضلع بنوں میں منعقد ہوا تھا[35]۔''

درحقیقت یہ پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لیے کانگریس کی ایک چال تھی جس نے ریفرنڈم کی شرط تو رکھوادی تھی مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ کر پریشان تھی کہ قیام پاکستان کے لیے سرحد کے غیور مسلمانوں کا جوش و خروش دوسرے صوبوں سے کم نہیں اور اس کی امید بہت کم تھی کہ کوئی بھی غیر تمند مسلمان صوبہ سرحد کا الحاق پاکستان کی بجائے بھارت کی کافرانہ حکومت کے ساتھ پسند کرے گا۔ اس لیے کانگریس نے مسلمانوں میں صوبہ وارانہ تعصب کی آگ بھڑکا کر یہ چاہا تھا کہ اگر صوبہ سرحد بھارت کو نہ مل سکے تو یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ وہ پاکستان سے بھی الگ ایک مستقل ریاست بنے جس کے دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ پاکستان کمزور ہوگا دوسرا یہ کہ پختونستان بھارت کے لیے ایسا نوالہ تر ہوگا کہ اسے ہڑپ کر جانا اس کے لیے ہر وقت ممکن ہوگا۔ اسی لیے "مستقل" ریاست کا نام پختونستان رکھا گیا تھا اور یہ نعرہ چونکہ صوبائی تعصب پر مبنی تھا اس لیے اس کے چل جانے کی امید تھی، جس کے لیے کانگریس کے پورے وسائل حرکت میں آچکے تھے۔

سرحد کے دیندار اور غیور مسلمان پختونستان کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے جن میں وہاں کے اس وقت کے مشہور مشائخ پیر مانکی شریف اور پیر زکوڑی شریف بہ طور خاص قابل ذکر ہیں مگر یہ سب حضرات اس کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ دیوبند کے اکابر علماء یہاں آکر عوام کو صحیح دینی صورتحال سے آگاہ فرمائیں۔ یہاں کے عوام دینی امور میں علماء دیوبند کے علاوہ کسی کی بات پر بھروسہ نہ کرتے تھے[36]۔

جناب مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب آگے لکھتے ہیں:

"یہ تھے وہ نازک حالات جن میں آپ نے حضرت شیخ الاسلام کی معیت میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور بظاہر حالات اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی سے بچایا۔

یوں تو قیام پاکستان کی جدوجہد میں حضرت والد صاحب نے پورے ہندوستان کے طول وعرض کے دورے کئے اور جگہ جگہ عام وخاص جلسوں سے خطاب فرمایا، آپ کا مدراس ودکن کا دورہ بھی بہت کامیاب دورہ تھا لیکن ریفرنڈم کے نازک موقع پر صوبہ سرحد کا یہ دورہ تاریخی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کانگریس نے ''پختونستان'' کے پردے میں سرحد کے غیور مسلمانوں کو غلام بنانے اور پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لئے جو خطرناک جال پھیلایا تھا وہ اسی دورہ سے تار تار ہوا۔ پیر صاحب مانکی شریف اور پیر زکوڑی شریف نے اس دورے کا انتظام کیا تھا وہ خود بھی ان حضرات کے ساتھ مجاہدانہ سرگرمی سے شریک رہے۔

یہ سخت گرمی کا موسم تھا مگر یہ حضرات صوبہ بھر میں شہر شہر، گاؤں گاؤں پھر کر کلمہ حق پہنچاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو ایسا شرف قبول عطا فرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا پاکستان کے حق میں جوش وخروش سے بھر گئی اور جب ریفرنڈم ہوا تو اس میں سرحد کے غیور مسلمانوں نے اپنا یہ قطعی فیصلہ دے دیا کہ صوبہ سرحد اور پاکستان ایک ہے اور ایک رہیں گے۔

سیاسی مبصرین کی فیصلہ کن یہ قطعی رائے ہے کہ اگر اس وقت میں شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور حضرت والد صاحب سرحد کا دورہ نہ فرماتے اور پیر مانکی و پیرز کوڑی شریف کے اپنے تاثرات پوری طرح کام نہ کرتے تو ریفریڈم میں پاکستان کی کامیابی ممکن نہ تھی۔

حضرت والد صاحب نے اس سفر سے دیوبند واپسی پر وہاں کے بہت سے ایمان افروز واقعات اور پاکستان کے لئے مسلمانان سرحد کے اس ایمانی جوش و خروش کی ولولہ انگیز تفصیلات سنائی تھیں جن کا جگہ جگہ مشاہدہ ہوا، بھائی جان اس سفر میں بھی حضرت والد صاحب کے ساتھ تھے، ہم کبھی ان سے اور کبھی ان کے والد صاحب سے وہاں کے دلچسپ واقعات سنا کرتے تھے۔ افسوس کہ طوالت کا خوف ان کے بیان سے مانع ہے۔

ریفریڈم کا جو نتیجہ صوبہ سرحد میں سامنے آیا سلہٹ کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہ تھا، اس محاذ کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے سر کیا تھا۔

مضبوط پاکستان کے قیام میں یہی ریفریڈم کا مرحلہ باقی تھا جس میں اللہ تعالی نے اپنے ان بوریہ نشین علماء حق کے ذریعہ مسلمانوں کو سرخروئی عطا فرمائی"[37]۔

مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی قیادت:

قیام پاکستان کے ایک سال جمیعت علماءاسلام کو ایک سانحہ پیش آگیا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب وفات پاگئے اور ان کے کچھ عرصہ بعد ہی علامہ سید سلیمان ندوی صاحب بھی وفات پاگئے تو جمیعت کی قیادت بھی آپ کو سنبھالنی پڑی، اس حوالے سے اکبر شاہ بخاری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب قدس سرہ مرکزی جمیعت علمائے اسلام کے صدر منتخب ہوئے لیکن ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں

حضرت سید صاحب کی وفات کے بعد جہاں دستوری مساعی کی دوسری ذمہ داریاں مفتی صاحب کے کاندھوں پر آپڑیں اسی کے ساتھ جمیعت ت علمائے اسلام کی صدارت بھی آپ کو سونپ دی گئی لیکن یہ وہ وقت تھا جب مغربی پاکستان میں ایک اور جمیعت اسی نام سے قائم ہو چکی تھی جس کا مرکزی جمیعت سے کوئی رابطہ نہ تھا حضرت مفتی صاحب نے اسلامی دستور کی جدوجہد کے ساتھ ہی شب وروز کی مساعی سے ان منتشر جماعتوں کو مرکز سے مربوط کیا اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ خاص حضرت مفتی محمد حسن صاحب (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) نے اس شرط پر صدارت قبول فرمائی کہ جمیعت کی ذمہ داری کا تمام کام حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے انجام دیں اور اس مقصد کے لے حضرت مفتی صاحب کو جمیعت کا قائم مقام صدر بنادیا گیا"[38]۔

جمیعت کے قائم مقام سربراہ کی حیثیت سے آپ کے نمایاں کارنامے:

جمیعت کے نائب سربراہ کی حیثیت سے آپ نے پاکستان میں دستور سازی کے لیے آپ نے عوامی شعور کو بیدار کیا اور مختلف مقامات پر دورے کیے، اس حوالے سے جناب اکبر شاہ بخاری لکھتے ہیں:

> ''جتنے سرکاری اداروں میں آپ بحثییت ممبر شریک ہوئے، ان سب میں آپ نے شرکت کی اور یہ شرط ارباب حل وعقد سے ہمیشہ منوائی کہ ہم پر عوامی تقریر پر وہ پابندیاں عائد نہیں ہوں گی۔ جو سرکاری ملازمین پر عائد ہوتی ہیں چنانچہ صدارت جمیعت علمائے اسلام سے پہلے اور بعد میں آپ نے جمیعت کی جانب سے تحریک دستور اسلامی کے لیے مشرقی ومغربی پاکستان کے طول وعرض کے بار بار دورے کیے اور ضلع ضلع میں پہنچ کر دستور کے لیے عوامی شعور کو بیدار کیا مغربی پاکستان کا ایک دورہ جو ۱۸ دسمبر ۱۹۵۵ء سے ۳ جنوری ۱۹۵۶ء تک جاری رہا، اس دورے میں حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادوں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم کو بھی شرف ہمرکابی حاصل ہوا،،[39]۔

مارشل لاءاور جمعیت علماءاسلام:

پاکستان میں جنرل ایوب کے مارشل لاء کے دور میں جب ملکی جماعتوں کا اتحاد ٹوٹا تو آپ نے دوبارہ ان کی جمعیت کی بھرپور سعی کی، جناب اکبر شاہ بخاری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''قائم مقام صدر جمعیت علمائے اسلام کی حیثیت سے آپ نے تقریباً تین(۳)سال تک جمعیت کی خدمات انجام دیں آپ کی مساعی جاری تھیں کہ ملک میں انقلاب آیااور جنرل محمد ایوب خان مرحوم نے مارشل لاء لگا کر تمام جماعتوں کو کالعدم قرار دیا دوران مارشل لاء میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب صدر جمعیت علماءاسلام بھی رحلت فرما گئے۔

پھر جب مارشل لاء ہٹااور جماعتیں دوبارہ منظم ہوئیں تو''جمعیت علماءاسلام'' کے نام سے بعض علماء کرام نے ایک نئی تنظیم قائم فرمائی۔اس لیے حضرت مفتی صاحب اصل''جمعیت علماءاسلام''کی تنظیم جدید کرنے سے باز رہے تاکہ علمائے کرام کے مابین تفرقہ نہ پیدا ہواور پاکستان میں اسلامی نظام کے لئے انفرادی طور پر علمی و عملی میدانوں میں کوشش فرماتے رہے جس کی تفصیل بہت زیادہ ہے اس کی یہاں گنجائش نہیں ہے''(40)۔

پاکستان میں کمیونزم اور سوشلزم کے فتنہ کی سرکوبی:

پاکستان میں وہ وقت بھی آیا جب اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں کمیونزم اور سوشلزم کو اسلامیانے کی ہوا چلی اور مختلف قسم کے پروپیگنڈے ہوئے، مگر آپ نے اپنی حکمت وبصیرت سے اس طوفان کو رام کیا، حافظ اکبر شاہ بخاری رقم طراز ہیں:

''جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے کچھ پہلے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کے لیے پروپیگنڈا اور جلسے جلوس عام

ہوگئے تو اس مسئلہ کی نزاکت نے پھر آپ کو ''جمعیت علماء اسلام'' کے احیاء پر مجبور کر دیا، کیونکہ ضابطہ میں قائم مقام صدر آپ ہی تھے۔

چنانچہ مغربی و مشرقی پاکستان کے تمام ارکان جمعیت کا اجلاس بلا کر جمعیت کی صدارت تو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی طرف منتقل فرمادی اور خود کسی عہدے کے بغیر مرکزی جمعیت علماء اسلام کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔اسلام اور سوشلزم کے درمیان جو بنیادی خلیج حائل ہے اسے تحریر و تقریر کے ذریعہ واضح فرمایا۔آپ نے ایک رسالہ "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟" اسی دور میں تصنیف فرمائے جو کثیر تعداد میں شائع ہوئے تقریباً ایک سال جد وجہد میں صرف ہوا جس سے مسئلہ کی وضاحت تو بحمد اللہ پوری طرح ہو گئی مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زور وزر کام کرتے ہیں، انتخابات کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا، وہ آگیا''(41)۔

سیاست سے کنارہ کشی:

قیام پاکستان کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب ایک عرصہ تک ملکی معاملات میں دلچسپی لیتے رہے، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

''۱۹۵۸ء تک تو حضرت والد صاحب ملکی معاملات میں سرگرم دلچسپی لیتے رہے، اور دینی ضرورت کے مطابق سیاسی دوروں، تقریروں، اخباری بیانات اور حکام سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، اس زمانے تک آپ ان تمام سیاسی معاملات پر نظر رکھتے جو ملک کے دینی مستقبل پر اثرانداز ہو سکتے تھے، اور پھر ان کے بارے میں مختلف زاویوں سے کوشش بھی فرماتے لیکن ۱۹۵۸ھ کے مارشل لاء کے بعد سے آپ نے اپنی سیاسی جد وجہد کو بہت مختصر

کر کے زیادہ توجہ تعلیمی اور تصنیفی کاموں پر صرف کرنی شروع کر دی، اور ملک کے سیاسی مسائل میں صرف اس وقت کوئی عملی حصہ لیا جب دینی اعتبار سے وہ ناگزیر ہو گیا"(42)۔

تجدد کی تحریکیں اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ:

ملک پاکستان میں کئی تحریکیں چلیں کچھ کا تعلق چونکہ اسلام اور اسلامی تحقیق سے تھا، اس لیے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ان پر خاص نظر تھی، ان تحریکوں کے حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"صدر ایوب خان مرحوم کے زمانے میں تجدد کی جو تحریکیں سرکاری سر پرستی میں پروان چڑھیں، اور "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی طرف سے اسلام پر جو مشق ستم ہوئی اس سے حضرت والد صاحب سخت نالاں تھے، اور وقتاً فوقتاً اپنے مضامین، مقالات، اخباری بیانات اور خطوط کے ذریعے اس کی مؤثر تردید بھی فرماتے رہے۔ ان میں سے بہت سی تحریریں متعلقہ مسائل پر ہمارا بیش قیمت علمی سرمایہ بن کر آج تک محفوظ ہیں۔ "عائلی قوانین پر تبصرہ"" ضبط ولادت"" رؤیت ہلال"" اسلامی ذبیحہ"" مسئلہ سود"" قرآن میں نظام زکوۃ"" اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور "بیمہ زندگی" وغیرہ اسی زمانے کی یادگاریں ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر بعد کے مصنفین کے لئے ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں"(43)۔

زندگی کے آخری حصہ میں آپ کے علمی و سیاسی معمولات:

زندگی کے آخری حصہ میں علمی کاموں کے علاوہ دو کام ایسے تھے جو آپ نے اس دوران بھی اہتمام کے ساتھ جاری رکھے ایک یہ کہ جو دینی جماعتیں میدان سیاست میں سرگرم ہیں ان کو متحد کرنے کی کوشش، اور دوسرے وقتاً فوقتاً دینی معاملات میں حکام وقت کو تبلیغ و نصیحت۔ اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں جب کوئی شخص آپ سے دوبارہ سر گرم سیاسی جہد وجہد کا مطالبہ کرتا تو آپ یہ فرماتے کہ
''اب میری عمر آخری زمانہ ہے، قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں اور علالت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، میں عمر کے قیمتی دس سال ملکی معاملات کے لیے خرچ کر چکا ہوں، اب ان بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے صرف وہ کام کرنا چاہتا ہوں جن کا دینی فائدہ واضح اور یقینی ہو۔ اس لیے اب تعلیم وتصنیف کی راہ سے دین کی جو خدمت بن پڑے گی انجام دوں گا، اور سیاسی جد وجہد میں دوبارہ حصہ صرف اس وقت لے سکتا ہوں، جب سیاسی جماعتیں مل کر براہ راست اسلام کے نفاذ کے لئے کوئی مؤثر تحریک شروع کریں، جمہوریت اور دوسرے سیاسی مسائل کے جھنجھٹ میں مبتلا ہونے کے لئے میں اپنی مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا''[44]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو دوبارہ سیاست میں لانے کی کوشش اور آپ کا جواب:

جب آپ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے تو اسی دوران ملکی سیاست میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ جس کے نتیجے میں کچھ پرانے سیاست دانوں نے آپ سے رابطہ کیا، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''چنانچہ جب سابق وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی مرحوم نے فیلڈ مارشل ایوب خان صاحب مرحوم کے خلاف تحریک جمہوریت کا آغاز کیا اور اس غرض کے لئے تمام پرانے سیاست دانوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا تو ایک روز حضرت والد صاحب قدس سرہ کو فون کیا اور کہا: ''مفتی صاحب! پچھلے سالوں میں بہت سے مسائل میں ہمارا آپ کا اختلاف رہا، لیکن اب میں جمہوریت کی بحالی کے لئے ملک گیر تحریک اٹھا رہا ہوں، ظاہر ہے کہ بحالی جمہوریت کے مقصد سے تو آپ کو بھی اتفاق ہو گا، اس لئے اس کام میں آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔''

والد صاحب نے فرمایا: ''سہروردی صاحب! بات یہ ہے کہ میں ملا آدمی ہوں، اور جمہوریت وغیرہ کو کچھ نہیں جانتا، میں صرف اسلام کو جانتا ہوں''۔

سہروردی صاحب نے کہا۔ ''مگر اسلام نے بھی جمہوریت کی تعلیم دی ہے۔''

والد صاحب نے فرمایا کہ ''اسلام کے بغیر میں کسی جمہوریت کا قائل نہیں، اور جتنی جمہوریت اسلام میں ہے وہ اسلام کے ضمن میں خود بخود آجائے گی، اس لئے جمہوریت کے نام پر کسی تحریک میں شمولیت میرے لیے ممکن نہیں، ہاں اگر آپ اسلام کے نفاذ کے لئے صدق دل سے کوئی تحریک چلائیں تو اس میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

اس جواب پر سہروردی صاحب خاموش ہوگئے، اور رسمی گفتگو کے بعد فون بند کردیا۔

حضرت والد صاحب نے سہروردی صاحب کو جو جواب دیا وہ آپ کا سوچا سمجھا نظریہ تھا، آپ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے جمہوریت کو زینہ بنانے کا تصور سرے سے غلط ہے، اول تو مغربی طرز کی جمہوریت بذات خود اسلام کے خلاف ہے، دوسرے ''پہلے جمہوریت پھر اسلام'' کے نسخے سے سب سے زیادہ نقصان اسلام کو پہنچے گا، کیونکہ موجودہ سیاسی شعور کے ساتھ صحیح صحیح جمہوریت قائم ہونے کے لئے عمریں چاہیئں، اور اگر اس وقت تک اسلام کو روبکار لانے کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا تو ولادینی طاقتیں جو مسلسل دلوں سے اسلام کو کھرچنے میں مصروف ہیں اس وقت تک ایسی فضا تیار کردیں گی کہ اس میں اسلام کا نفاذ ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوکر رہ جائے، اور کچھ بعید نہیں کہ ''جمہور'' کو آزادی تحریر وتقریر اور آزادی انتخاب ملنے تک ''جمہور'' کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہوچکی ہو کہ وہ خود نفاذ اسلام کے نام ہی سے کترانے لگیں۔ اس لئے حضرت والد صاحب کا خیال تھا کہ ''پہلے جمہوریت پھر اسلام'' کے فارمولے کا نتیجہ اسلام سے دست براری کے سوا کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت والد صاحب تبدیلی اقتدار اور بحالی جمہوریت وغیرہ کی تحریکوں کے بجائے اس بات کے خواہاں رہے کہ کوئی مؤثر تحریک صرف اسلام کے نام پر چلے اور اس میں اسلام کے نام کو محض تبدیلی اقتدار کے بہانے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے، بلکہ اس کا اول وآخر مقصد نفاذ اسلام ہو اور وہ حکمرانوں کو اس مقصد

کے لئے عملی اقدامات پر مجبور کردے۔ چنانچہ جب صدر ایوب خاں صاحب مرحوم کے آخری دور حکومت میں ان کے خلاف تحریک چلی تو حضرت والد صاحب کو اس بات کا صدمہ تھا کہ اس کا براہ راست مقصد سوائے تبدیلی اقتدار اور ''بحالی جمہوریت'' کے کچھ نہیں ہے اور آپ کا اندازہ یہ تھا کہ اس کے نتیجے میں شاید تبدیلی اقتدار تو عمل میں آجائے، لیکن ''بحالی جمہوریت'' کی جس منزل کا ملکی سیاست میں چرچا ہے، نہ وہ حاصل ہو سکے اور نہ نفاذ اسلام کی کوشش کا نمبر آسکے گا، اس لئے اس وقت بھی آپ کی رائے یہ تھی کہ تبدیلی اقتدار کو مقصد بنانے کے بجائے نفاذ اسلام اور استحکام ملک سے متعلق کچھ معین مطالبات کو مقصد بنایا جائے، چنانچہ آپ نے اس بارے میں متعدد سیاسی رہنماؤں سے گفتگو بھی فرمائی، انھیں خطوط بھی لکھے، اور برادر مکرم جناب مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کو اپنا پیغام دے کر مختلف سیاسی جماعتوں کے پاس بھی بھیجا اور مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب اس دوران بستر علالت پر تھے تو ملک کی ایک سیاسی جماعت کے سربراہ ملاقات کے لئے تشریف لائے، آپ نے فرمایا:

''موجودہ تحریک کے نتیجے میں آپ اقتدار کی تبدیلی میں تو کامیاب ہو جائیں گے، لیکن کیا کوئی ایسا متبادل اقتدار آپ کے پاس موجود ہے جو دینی اعتبار سے بہتر ہو۔''

انہوں نے جواب میں فرمایا: ''اس وقت تو سب سے بڑا مسئلہ اس آمرانہ اقتدار کا بت توڑنا ہے، جب ہم یہ مقصد حاصل کرلیں گے تو کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکلے گی۔''

اگرچہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا، لیکن اس وقت ملک کی سیاسی فضا ایسی بن چکی تھی کہ تبدیلی اقتدار بذات خود ایک مقدس مقصد بن گیا تھا، اور تحریک کا رخ کسی مثبت مقصد کی طرف موڑنے کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ہوا وہی جس کا والد صاحب کو خطرہ تھا کہ اقتدار تو تبدیل ہو گیا، مگر نہ بحالی جمہوریت کی مزعومہ منزل حاصل ہوئی، نہ اسلامی نقطہ نظر سے کوئی بہتری پیدا ہوئی، بلکہ ملک اپنی سالمیت اور استحکام کے اعتبار سے نہ صرف برسوں پیچھے چلا گیا، بلکہ بالآخر دو نیم ہو کر رہا۔

بہر کیف! کہنا یہ تھا کہ اس دور میں حضرت والد صاحب سر گرم سیاسی جہد وجہد سے کنارہ کش ہو کر چلے تھے، لیکن ناگزیر مواقع پر حکومت اور سیاسی جماعتوں دونوں کو ملک وملت سے متعلق اپنے نقطہ نظر سے آگاہ ضرور فرماتے رہے"[(45)]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی قائدانہ صلاحیتیں:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے بہت بلند ہمتی عطاء فرمائی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے گرُ سے بھی خوب واقف تھے، مفتی محمد تقی عثمانی اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ جس کسی نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی ہے وہ بخوبی واقف ہے کہ اللہ تعالی نے ان کی شخصیت کو کس قدر مقبولیت اور کلام میں کس درجہ اثر آفرینی عطا فرمائی تھی، چنانچہ آپ رحمہ اللہ تشکیل پاکستان کی غرض سے جس جگہ تشریف لے گئے۔ اللہ تعالی نے اپنے فضل و کرم سے کامیابی و کامرانی مقدر فرمائی اور فتوحات کے دروازے کھول دے، حق تو یہ ہے کہ تعمیر پاکستان میں ان کی جدوجہد اس درجہ انتہا تک جا پہنچی تھی کہ تحریک پاکستان کے بعض قائدین اور لیڈران یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ پاکستان کے بہت سے گھمبیر نوعیت کے معاملات ایسے تھے جس میں اگر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ پیش پیش نہ ہوتے تو کبھی حل نہ ہو سکتے تھے"[(46)]۔

تاریخی کارنامہ قرارداد مقاصد:

قیام پاکستان کے مرحلے کے بعد جب اسلامی نظام قائم کرنے کی بات چلی تو مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء نے بھرپور کوششیں شروع کردیں، اکبر شاہ بخاری اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''قیام پاکستان مسلمانوں کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی نصرت وحمایت سے نوازا تھا، اب دوسرا مرحلہ یہاں اسلامی نظام حیات قائم کرنے کا تھا، اس کے لیے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بھرپور کوششیں شروع کردیں، چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور انکے رفقاء نے قیام پاکستان کے فوراً بعد اسلامی جدوجہد کا آغاز فرمادیا اور یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی دستور کا ایک اجمالی خاکہ مرتب کیا جائے تاکہ حکومت کے سامنے مطالبہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاسکے یہ خاکہ مرتب کرنے لئے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جن اکابر علماء کرام کو خصوصی دعوت دی ان میں حضرت علامہ سید سلمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور جناب ڈاکٹر حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے اسلامی دستور مرتب کر نے کے لئے شب وروز محنت کی، اور ایک اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کرکے حکومت کو پیش کردیا۔

اس کے بعد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی اعظم نے ایک تاریخی کارنامہ "قرارداد مقاصد" کے نام سے منظور کراکے سرانجام دیا۔ قرارداد مقاصد جو پاکستان کے ہر آئین میں بطور دیباچہ چلی آرہی ہے اور 1973ء کے موجودہ آئین میں بھی شامل ہے۔ یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کے مقاصد اور قومی جہد وعمل کی سمت قرآن وسنت کی روشنی میں مقرر کی گئی ہے اور ان بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پائے تھے۔ اور جن کی پا بندی دستور ساز اسمبلی اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی۔ یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا اب تک پاکستان کے دستور و قانون میں جو جو اسلامی دفعات شا مل ہوئیں یا آئندہ شامل ہوں گی وہ سب درحقیقت اسی قرارداد مقاصد کی مرہون منت ہیں۔ قرارداد مقا صد اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت کے وزیر اعظم شہید ملت لیاقت علی خان مرحوم نے پیش کی تھی،، (47)۔

قرارداد مقاصد کیا ہے؟

قرارداد مقاصد جو پاکستان کے ہر آئین میں بہ طور دیباچہ میں شامل چلی آرہی ہے اور ۱۹۷۳ء کے موجودہ آئین میں بھی شامل ہے،اس کے متعلق جناب اکبر شاہ بخاری صاحب لکھتے ہیں:

"یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کے مقاصد اور قومی جہد وجہد عمل کی سمت ،قرآن وسنت کی روشنی میں مقرر کی گئی ہے اوران کی بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے۔جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پانے تھے اور جن کی پابندی دستور ساز اسمبلی کو اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی۔یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا،اب تک پاکستان کے دستور و قانون میں جو اسلامی دفعات شامل ہوئیں یا آئندہ شامل ہوں گی وہ درحقیقت اسی قرارداد مقاصد کی مرہون منت ہیں" (48)۔

قراردادِ مقاصد کے مرتبین:

قرارداد مقاصد پر کام کی شروعات کے حوالے سے مفتی محمد رفیع عثمانی رقمطراز ہیں:

"قرارداد مقاصد اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت کے زیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان مرحوم نے پیش کی تھی مگر اس کا مسودہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اور حضرت والد صاحب نے طویل غور وخوض کے بعد مرتب فرمایا تھا،اس کی تیاری اور اس کے بعد اسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں شیخ الاسلام کو طویل علمی اور سیاسی جدوجہد کرنی پڑی۔ برسر اقتدار طبقہ کا ایک گروہ اس راہ میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا، قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم نے اس گروہ کے علی الرغم شیخ الاسلام کی حمایت کی اور اسمبلی میں ۱۲مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد خود پیش کر کے اسے منظور کرایا۔حضرت والد صاحب ان تمام مہمات میں شیخ الاسلام کے ساتھ برابر شریک رہے۔

قرارداد مقاصد کا بالکل ابتدائی کچھ خاکہ جو صرف عنوانات اور یاداشتوں پر مشتمل ہے اس کا اصل مسودہ احقر کے پاس عرصہ دراز سے محفوظ ہے''[49]۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی ایک علمی ضرورت-دارالعلوم کراچی کی تاسیس:

قیام پاکستان کے بعد جب کہ ملک میں دگرگوں صورت حال تھی، ہر شعبہ خستہ حالی کا شکار تھا، یہی حال پاکستان میں موجود مدارس کا بھی تھا، اس وقت ایک مضبوط علمی درس گاہ کی اشد ضرورت تھی اور دارالعلوم کراچی کی تاسیس دراصل اسی ضرورت کی ایک تکمیل تھی، اس حوالے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''تقسیم ہند کے بعد ہمارے شیخ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستان کی طرف ہجرت کی اور یہ وہ اولین وقت تھا جب کہ وطن عزیز کے بڑے بڑے شہروں سمیت بالخصوص دارالحکومت شہر کراچی میں کوئی بھی ایسا دینی مدرسہ نہیں تھا، جہاں سے اسلامی علوم اور معارف دینیہ کی اشاعت کا کماحقہ اہتمام ہو۔ لہذا پاکستان بننے کے بعد اول درجہ میں اس کی شدید ضرورت تھی کہ نئی آنے والی پود کی عملی زندگی کو تمام تر شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے اور ان کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ان کے اذہان اسلام کے خوبصورت قالب میں ڈھل جائیں۔ اور یہی مقصد تھا جس کے پیش نظر ایک آزاد خودمختار مملکت کے حصول کی امید باندھی گئی تھی۔

پس ہمارے شیخ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے محض اللہ کی توفیق اور مدد نصرت سے کراچی میں ایک وسیع ادارے کی بنیاد رکھی اور یہی وہ ادارہ ہے جو آج ''دارالعلوم کراچی'' کے نام سے مشہور و معروف ہے جو آج بلاشبہ پاکستان کے دینی علوم کے جملہ مراکز میں سب سے بڑا مرکز شمار ہوتا ہے اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص کی برکت سے یہ ادارہ ایک خوشگوار ٹھنڈے پانی کا سرچشمہ ہونے کی حیثیت سے پاکستان سمیت دنیا بھر کے مختلف ممالک سے جوق درجوق آنے والے طلبہ کرام کو اپنے فیضان علم سے سیراب کر رہا ہے اور یہ رجوع اس قدر بڑھتا رہا کہ جگہ کی بے

حد تنگی ہو گئی جس کے بعد صحیح معنوں میں تعلیمی و دینی ضروریات کی طرف رجوع اس قدر بڑھتا رہا کہ جگہ کی بے

حد تنگی ہو گئی، چنانچہ یہ مدرسہ کورنگی میں ایک وسیع مقام پر منتقل ہو گیا،، (50)۔

خلاصۃ الباب

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ایک خالصتاً علمی شخصیت تھے، تصنیف وتالیف، تدریس، مطالعہ اور فتوی نویسی ہی آپ کا خاص شغل تھا، آپ کا میلان طبعاً سیاست کی طرف نہ تھا، مگر بعد میں آپ اس میدان کے شاہ سوار بنے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو چونکہ سیاست کا ایک طویل تجربہ تھا،اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک متبحر مفتی بھی تھے،اس لیے دینوی اور دنیوی دونوں اعتبار سے اس خار دار وادی کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھے، آپ کے تجربات اور تجزیے ہر دور میں قابل تقلید رہیں گے، مثلا: آپ علماء کے سیاست میں حصہ لینے کے قائل تھے، مگر اس کے لیے کڑی پابندیاں آپ کے نزدیک ضروری تھیں، مثلا علماء کو نہ تو حکمرانوں سے اتنا قرب اختیار کرنا چاہیے جس سے ان کے علمی وقار واستغناء پر آنچ آئے، یا حق گوئی میں رکاوٹ پیدا ہو،اور نہ ایسا بعد رکھنا چاہیے کہ وہ ذاتی یا سیاسی خصومت کی شکل اختیار کر جائے، بلکہ علماء کا منصب ایک ایسے آزاد، مستغنی، مگر خیر خواہ ادارے کا ہونا چاہیے جو حکومت کے اچھے کاموں میں اس کے ساتھ تعاون بھی کرے، اور اس کے غلط کاموں پر ہمدردی و خیر خواہی اور حکمت ودل سوزی کے ساتھ تنفید واحتساب کا فریضہ بھی انجام دے۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی میدان میں پہلا عملی قدم تحریک خلافت میں جدوجہد تھا، مگر یہ ایک ابتدائی کوشش تھی،اس کے بعد مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک قیام پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی تقریر، تحریر اور عملی جدوجہد سے اس تحریک کو جلا بخشی، آپ اس تحریک کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، مفتی اعظم پاکستان نے اپنے اکابرین کے ہمراہ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، انہوں نے دو قومی نظریے کے فروغ کے لیے مختلف مواقع پر لوگوں کی ذہن سازی کے لیے مؤثر خطابات کیے، مضامین لکھے،اور اس عظیم مقصد کے لیے انھوں نے فتاویٰ کا سہارا بھی لیا۔

قیام پاکستان کے حوالے سے جو جذبہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں کارفرما تھا وہ دراصل آپ کے شیخ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عطاء فرمودہ تھا، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تلامذہ اور متعلقین کی تربیت ہی اسی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کی تھی، اسی مقصد کے لیے جمیعت علماء اسلام کا پلیٹ فارم بنایا گیا۔

دار العلوم دیوبند میں قیام کے دوران تحریک پاکستان میں آپ کی جدوجہد واجبی سی تھی، مگر دار العلوم دیوبند سے استعفاء کے بعد گویا آپ نے اپنے آپ کو اس کام لیے وقف کر دیا تھا، چونکہ تحریک قیام پاکستان اور اس کے متوازی نظریے میں آپ قیام پاکستان کے پرجوش حامی تھے، اس لیے آپ نے اس موضوع پر متفرق مضامین کے ذریعے علماء اور عام لوگوں میں ایک جذبہ پیدا کیا، ۱۹۴۵ء کے انتخابات سر پر تھے، سہارنپور اور مظفر نگر کے عوام اور علماء ابھی کانگریس و مسلم لیگ کو ووٹ دینے میں متذبذب تھے، اس موقع پر آپ نے ایک بہت ہی اہم فتوی دیا، جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کو واضح کامیابی حاصل ہوئی، بالآخر آپ کی کوششوں کے نتیجہ پاکستان کا قیام ہوا۔

سلہٹ اور صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے آپ نے ریفرنڈم کامیاب کرانے کی بھرپور کوششیں کیں۔

قیام پاکستان کے ایک سال جمیعت علماء اسلام کو ایک سانحہ پیش آگیا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب وفات پاگئے اور ان کے کچھ عرصہ بعد ہی علامہ سید سلیمان ندوی صاحب بھی وفات پاگئے تو جمیعت کی قیادت بھی آپ کو سنبھالنی پڑی، جمیعت کے نائب سربراہ کی حیثیت سے آپ نے پاکستان میں دستور سازی کے لیے آپ نے عوامی شعور کو بیدار کیا اور مختلف مقامات پر دورے کیے۔

پاکستان میں جنرل ایوب کے مارشل لاء کے دور میں جب ملکی جماعتوں کا اتحاد ٹوٹا تو آپ نے دوبارہ ان کی جمعیت کی بھرپور سعی کی، پاکستان میں وہ وقت بھی آیا جب اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں کمیونزم اور سوشلزم کو اسلامیانے کی ہوا چلی اور مختلف قسم کے پروپیگنڈے ہوئے، مگر آپ نے اپنی حکمت وبصیرت سے اس طوفان کو رام کیا۔

قیام پاکستان کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب ایک عرصہ تک ملکی معاملات میں دلچسپی لیتے رہے، ملک پاکستان میں کئی تحریکیں چلیں کچھ کا تعلق چونکہ اسلام اور اسلامی تحقیق سے تھا، اس لیے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ان پر خاص نظر تھی، آپ نے ان منفی تحریکوں کے سد باب کی کوششیں کیں، زندگی کے آخری حصہ میں علمی کاموں کے علاوہ دو کام ایسے تھے جو آپ نے اس دوران بھی اہتمام کے ساتھ جاری رکھے ایک یہ کہ جو دینی جماعتیں میدان سیاست میں سرگرم ہیں ان کو متحد کرنے کی کوشش، اور دوسرے وقتاً فوقتاً دینی معاملات میں حکام وقت کو تبلیغ ونصیحت۔

جب آپ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے تو اسی دوران ملکی سیاست میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ جس کے نتیجے میں کچھ پرانے سیاست دانوں نے آپ سے رابطہ کیا، مگر آپ نے ان کی سرپرستی کرنے سے انکار کر دیا۔

قیام پاکستان کے مرحلے کے بعد جب اسلامی نظام قائم کرنے کی بات چلی تو مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء نے بھرپور کوششیں شروع کیں، قیام پاکستان کے بعد جب کہ ملک میں دگرگوں صورت حال تھی، ہر شعبہ خستہ حالی کا شکار تھا، یہی حال پاکستان میں موجود مدارس کا بھی تھا، اس وقت ایک مضبوط علمی درس گاہ کی اشد ضرورت تھی اور اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے دار العلوم کراچی کی تاسیس عمل میں لائی گئی۔

حوالہ جات، مصادر و مراجع، باب چہارم

(1) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص:۱۱۶)۔

(2) حوالہ بالا (ص:۱۱۸)۔

(3) محولہ بالا (ص: ۱۱۸، ۱۱۹)۔

(4) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص:۱۱۹، ۱۲۰)۔

(5) حوالہ بالا (ص:۱۱۸)۔

(6) محولہ بالا (ص:۱۲۱، ۱۲۲)۔

(7) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۱۲۲، ۱۲۳)۔

(8) حوالہ بالا، (ص:۱۲۳، ۱۲۴)۔

(9) محولہ بالا، (ص:۱۲۴)۔

(10) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص: ۱۲۴، ۱۲۵)۔

(11) حوالہ بالا، (ص:۱۲۹)۔

(12) محولہ بالا، (ص:۱۳۰)۔

(13) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ص:۱۱۷)۔

(14) حوالہ بالا ص:۱۱۷۔

(15) محولہ بالا، ص:۱۱۷۔

(16) تقی عثمانی، مفتی، مقالاتِ عثمانی، کراچی، مکتبہ دائرۃ المعارف کراچی، ۲۰۱۷ء (ص ۴۹۴)۔

(17) اکبر شاہ بخاری، مفتی اعظم کے مشہور خلفاء و تلامذہ (ص ۴۰، ۴۱)۔

(18) قاسم محمود، سید، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، (ج2، ص١۴۴٦)۔

(19) تقی عثمانی، مفتی، مقالاتِ عثمانی، کراچی، مکتبہ دائرۃ المعارف کراچی، ٢٠١٧ء (ص۴٩۴، ۴٩۵)۔

(20) حوالہ بالا (ص۴٩۴)۔

(21) رفیع عثمانی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ٢٠١١ء (ص ١۵٢)۔

(22) حوالہ بالا (ص١۴٢، ١۴٣)۔

(23) قاسم بن علی، الحریری، المقاماتِ الحریریہ، بیروت، دار الکتب اللبنانی، ١٩٨١ء، (ص:٢٢٦) ۔

(24) محولہ بالا (ص ١۴٣، ١۴۴)۔

(25) رفیع عثمانی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ٢٠١١ء (ص ١۴۴)۔

(26) تقی عثمانی، مفتی، مقالاتِ عثمانی، کراچی، مکتبہ دائرۃ المعارف کراچی، ٢٠١٧ء (ص۴٩٦)۔

(27) رفیع عثمانی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ٢٠١١ء (ص ١۵٠)۔

(28) حوالہ بالا (ص ١۵١، ١۵٢)۔

(29) محولہ بالا (ص ١۵٣)۔

(30) رفیع عثمانی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ٢٠١١ء (ص ١۵۴، ١۵۵)۔

(31) ایضاحوالہ بالا (ص ١۵٦)۔

(32) ایضامحولہ بالا (ص ١۵٧)۔

(33) رفیع عثمانی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ٢٠١١ء (ص ١۵٧، ١۵٨)۔

(34) ایضاحوالہ بالا (ص ١٦٢)۔

(35) محولہ بالا (ص ١٦٠، ١٦١)۔

(36) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ٢٠١١ء (ص ١٦٠، ١٦١)۔

(37) ایضاحوالہ سابقہ (ص ١٦٠، ١٦١)۔

(38) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلفاء و تلامذہ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ء، (ص ۵۳)۔

(39) حوالہ بالا (ص ۵۴، ۵۳)۔

(40) محولہ بالا (ص ۵۴)۔

(41) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلفاء و تلامذہ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ء، (ص ۵۴، ۵۵)۔

(42) تقی عثمانی، مفتی، میرے والد میرے شیخ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۲۶۔

(43) حوالہ بالا، (ص: ۱۲۶)۔

(44) محولہ بالا (ص: ۱۲۶)۔

(45) تقی عثمانی، مفتی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۹۴ء، (ج ۱، ص: ۴۳۵، ۴۳۶) ۔

(46) تقی عثمانی، مفتی، مقالات عثمانی، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۷ء، (ص ۴۹۶)۔

(47) اکبر شاہ بخاری، مفتی محمد شفیع صاحب کے مشہور خلفاء و تلامذہ، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ء، (ص ۵۰، ۵۱)۔

(48) حوالہ بالا (ص ۵۰)۔

(49) رفیع عثمانی، مفتی، حیاتِ مفتی اعظم، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۱ء (ص ۱۶۹)۔

(50) تقی عثمانی، مفتی، مقالات عثمانی، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۷ء، (ص ۴۹۹، ۵۰۰)۔

۵

باب پنجم

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ۔ مشاہیر کی نظر میں

- فصل اول: مشہور معاصر علماء کی نظر میں
- فصل دوم: فرزندان اور جانشینوں کی نظر میں
- فصل سوم: معروف دانشوروں اور مفکرین کی نظر میں
- فصل چہارم: شعراء اور ادباء کی نظر میں
- فصل پنجم: قومی صحافت کی نظر میں

۱

فصلِ اوّل

مشہور معاصر علماء کی نظر میں

﴿باب پنجم: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ - مشاہیر کی نظر میں﴾

فصل اول: مشہور معاصر علماء کی نظر میں

فقیہ العصر محدثِ مصر علامہ محمد زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ:

علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک عربی مکتوب میں لکھتے ہیں:

[اردو ترجمہ]: ''میں مدت دراز سے آپ کی مبارک ذات سے متعارف ہونے کا مشتاق تھا، اس لئے میں نے آپ کی بعض یادگار اور مفید تصانیف نہ صرف دیکھی ہیں، بلکہ ان سے استفادہ کیا ہے اور استاد بنوری اور استاذ بجنوری اکثر ہماری مجلسوں کو آپ کے خوشگوار ذکر خیر سے معطر رکھتے ہیں۔۔۔۔ جہاں تک استفتاء کا تعلق ہے تو فتویٰ کے ماہر و محقق تو آپ خود ہیں۔ اور اس سلسلے میں آپ کے طویل تجربے نے آپ کو اس مقام تک پہنچادیا ہے جو صحیح معنی میں ''فقیہ النفس'' کا مقام ہے اور آپ نے اپنے مکتوب میں جو نکات اٹھائے ہیں، وہ نہایت دقیع ہیں۔۔۔(اس کے بعد اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے تحریر کر کے لکھا ہے کہ)۔۔۔ لیکن میں فتویٰ پر دستخط کرنے کی جرأت نہیں کروں گا، کیونکہ یہ آپ کی فقہی مہارت کے آگے ایک جسارت کے مترادف ہوگا۔ بس میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنی رضا کے مطابق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور آپ کو تادیر خیر عافیت کے ساتھ سلامت رکھے''۔

اس مکتوب میں علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کی صرف تعریف ہی نہیں کی، بلکہ باقاعدہ آپ کو ''صحیح معنی میں فقیہ النفس'' کا خطاب دیا ہے اور جو لوگ علامہ زاہد الکوثری کے تبحر علمی سے واقف ہیں، انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے

الفاظ کو کسی تصنع یا مبالغے پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے قلم اور ان کے کسی کی تعریف و توصیف میں محتاطانہ مزاج سے اہل علم حضرات بخوبی واقف ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ:

شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھے گئے مکتوبات اور مختلف تحریروں میں آپ کے متعلق تعریفی کلمات کہے ہیں، مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے تعلقات کب قائم ہوئے؟،اس حوالے سے شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت مفتی صاحب سے میرے تعلقات اس وقت سے تھے جب میں اور وہ نئے نئے مدرس ہوئے تھے۔ وہ دار العلوم دیوبند میں اور میں مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھاتا تھا''[1]۔

اس کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے تعلقات بڑھتے چلے گئے، شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی سرگذشت یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس کے بعد حضرت مفتی صاحب سے برابر تعلقات بڑھتے چلتے گئے اور مفتی صاحب کے الطاف اور شفقتوں میں باہمی بے تکلفی میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ حضرت مفتی صاحب جب کبھی تھانہ بھون حاضری دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو ذہابا یا ایابا خواہ تھوڑی دیر کو ہو، اسٹیشن سہارنپور سے میل ڈیڑھ میل کا سفر کر کے اس ناکارہ کی ملاقات کے لیے ضرور تشریف لاتے تھے۔
>
> جب پاکستان بن گیا اور اس کے ایک سال کے بعد حضرت مفتی صاحب کراچی تشریف لے گئے تو جب بھی کراچی سے دیوبند تشریف لاتے اس ناکارہ سے ملنے کے لیے سہارنپور ضرور تشریف لائے اور ایک شب قیام

فرمایا اس کے چند سال بعد اس ناکارہ کا حجاز مقدس آتے جاتے کراچی سے بارہا گزر ہوا تقریباً ہر مرتبہ دو تین روز کراچی میں قیام کرنے کا موقع ملا اس موقع پر حضرت مفتی صاحب اپنے لڑکوں اور اپنے دارالعلوم کے اساتذہ کے ساتھ برابر مکی مسجد تشریف لا کر ملاقات فرماتے تھے اور میں بھی موقع نکال کر ضرور دارالعلوم میں دو تین گھنٹے کے لئے جاتا تھا، اپنے ضعف اور معذوری کی وجہ سے گویا سفر لمبا ہو جاتا تھا کیونکہ مکی مسجد سے دارالعلوم بارہ تیرہ میل کے لگ بھگ ہے لیکن میں حضرت مفتی صاحب کی شفقتوں کی وجہ سے ضرور حاضری دیتا تھا۔

۱۳۹۵ھ میں یہ ناکارہ جب سہارنپور سے براہ رائے ونڈ کراچی حجاز آرہا تھا تو کراچی کے دو تین روز زمانہ قیام میں اس ناکارہ نے دارالعلوم کراچی میں حسب عادت حاضری دی حضرت مفتی صاحب اس وقت علیل تھے مجھے ان کی عیادت کے لیے جانا ضروری تھا ضعف کی حالت میں ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اس ناکارہ کو دیکھتے ہی بہت اظہار مسرت فرمایا اور ایک دوسری چارپائی اپنی چارپائی کے متصل اس ناکارہ کے لے بچھوادی احباب تو ناشتہ وغیرہ کرتے رہے اور یہ ناکارہ حضرت مفتی صاحب کے پاس برابر کی چارپائی پر لیٹا رہا میں مفتی صاحب اس طرح لیٹے تھے، کہ ایک چارپائی پر یہ ناکارہ اور دوسری پر مفتی صاحب سر دونوں کے آمنے سامنے اور پاؤں الگ الگ، مفتی صاحب نے اپنے مدرسہ کی بہت سی شکایات کیں[2] "۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ آپ کی تفسیر "معارف القرآن" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مفتی صاحب کا اصل فن تو فقہ اور فتوی کا تھا لیکن اللہ جل شانہ نے ان سے آخری عمر میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھوادی۔ یہ عظیم الشان تفسیر آٹھ (۸) جلدوں میں ان کی موجودگی ہی میں شائع ہو چکی ہے میں تو آج کل مطالعہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا، احباب جنہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس سے مستفید ہوتے رہے ہیں، انہوں نے بتایا کہ دور حاضر کے لیے یہ تفسیر بہت مفید ہے، زبان بھی سلیس اور ادبی ہے۔ فوائد و مسائل اور احکام کی

تشریحات بھی نہایت عمدہ طریقہ پر کی گئی ہیں۔ مسلک اہلسنت کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نئی اردو زبان میں واقعی تفسیر کی ضرورت تھی جو حضرت مفتی صاحب کی "معارف القرآن" سے پوری ہو گئی۔

احباب نے بتایا کہ حضرت مفتی صاحب کی تفسیر سے ان لوگوں کی نام نہاد تفسیروں کا بہت توڑا ہوا ہے۔ اور چونکہ جدید اردو زبان میں تفسیر لکھی ہے اور ساتھ ہی اہلسنت والجماعت کے مسلک کی بھی پوری رعایت ہے۔ اس لیے ہر طبقہ کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ فالحمد علی ذالک"[3]۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کی علمی استعداد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء و فضلاء میں سے تھے قوی الاستعداد اور استحضار علم کے ساتھ معروف فقہ ادب میں خاص امتیاز رکھتے تھے"[4]۔

نیز اپنے ساتھ رفاقت، تعلق اور آپ کی خدمات کے متعلق رقم طراز ہیں:

"میرا اور ان کا تعلق بھائیوں جیسا تھا اور تقریباً سارے ہی مبادیات تعلیم و تربیت میں ہم ساتھ ہی رہے، درجہ فارسی سے لے کر دورہ حدیث اور کتب عالیہ وآلیہ میں رفاقت رہی تھی، حتی کہ سیر و تفریح میں بھی رفاقت ہی رہتی تھی حج وغیرہ میں بھی اکھٹے شرکت ہوتی تھی۔ جب حضرت شیخ الہند اسارت مالٹا سے رہا ہو کر وطن واپس تشریف لائے تو ہم اکھٹے ہی ان سے بیعت ہوئے اور پھر ان کے وصال کے بعد احقر ہی کی معیت میں حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کیا اور حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت حاصل کی تعلیمی فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ذمہ داروں نے آپ کے علم و استعداد پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کا مدرس بنایا پھر آپ جلد ہی اپنی علمی قابلیت و لیاقت سے اعلی مدرسین میں شامل ہو گئے پھر آپ

کی استعداد کی کمال کی بناء پر آپ کو دارالعلوم کا صدر مفتی قرار دے دیا گیا، گویا آپ کو حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحب عثمانی کا قائم مقام بنایا گیا۔

یہ سب آپ کی لیاقت اور قوت علمی کے آثار تھے آپ تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن میں بھی کمال کو پہنچے اور اسی لیے الحمد للہ آج آپ کے متوسلین بکثرت موجود ہیں اور مخلوق کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، آپ کو تصنیف وتالیف کا ذوق بھی ابتداء سے تھا فقہ، حدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص و عوام کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی زمانہ طالب علمی سے تھا، عربی و فارسی اور اردو میں نہایت عمدہ قصائید مراثی اور واقعاتی نظمیں لکھی ہیں جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے آخری دور میں تفسیر "معارف القرآن" لکھی جو علم تفسیر میں ان کا عظیم کارنامہ ہے"[5]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "معارف القرآن" کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے علمی و روحانی جانشینوں میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا مقام بہت بلند ہے وہ حقیقت میں اپنے شیخ کی پوری ترجمانی فرما رہے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں تفسیر معارف القرآن مکمل فرمائی ہے جو تحقیقی علمی کا خزانہ ہے۔ اس تفسیر کو تصنیف فرما کر مفتی صاحب نے علماء کرام، مفسرین کرام اور پوری ملت اسلامیہ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے''[6]۔

اسلاف کی پیروی اور آپ کی وفات کے متعلق لکھتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب پاکستان میں مسلک دیوبند کے عظیم داعی اور ترجمان تھے۔ دار العلوم دیوبند کے ایک قیمتی جوہر اور عظیم فرزند تھے اور اپنی ذاتی خوبیوں اور لیاقتوں کی بناء پر سارے ہی طبقہ اہل علم کے معتمد اور مسلم تھے ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا بسا تھا، اور وہ ہر جزئی مسئلہ میں

بزرگوں کے اتباع کو ضروری سمجھتے تھے حضرت مفتی صاحب اگرچہ آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دینی خدمات زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی اور اس سے ان کی یاد ہمارے دلوں مین ہمیشہ تازہ رہے گی۔ آپ نے کراچی میں دار العلوم کے نام سے علوم دینیہ کی ایک عظیم دینی درسگاہ قائم فرمائی جو آج پاکستان میں مرکزی حیثیت کی ایک ممتاز تعلیم گاہ ہے گورنمنٹ پاکستان نے اسلامی قانون کی تدوین کی لیے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تھی آپ اس کے ممبر رہے۔ بہر حال آپ کی وفات کا صدمہ صرف ایک گھرانے کا نہیں بلکہ پورے دار العلوم اور سارے علمی حلقے کا ہے پھر بھی اس شدید غم میں وجہ تسلی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ترکہ میں جہاں ایک بڑا علم چھوڑا جو ان کی کثیر تصانیف میں محفوظ ہے وہیں الحمد للہ قابل اولاد بھی چھوڑی۔ جس سے بھرپور توقع ہے کہ ان کے آثار اور باقیات الصالحات کو من وعن باقی رکھیں گے۔ بالخصوص عزیز محمد تقی سلمہ سے ہماری امیدیں زیادہ وابستہ ہیں، اب انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مفتی محمد شفیع ہیں حق تعالی ان آرزوؤں کو پورا فرمائے حق تعالی ان کو درجات عالیہ نصیب فرمائے۔ ''آمین''[7]۔

محدثِ عصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بیماری اور علمی خدمات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''مرحوم مختلف عوارض، خصوصاً عارضۂ قلب میں کچھ عرصہ سے مبتلا ہو گئے تھے اور عارض اور امراض و تکالیف کو قابل رشک صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے اور رضا بالقضاء کے اعلی ترین مقام کے حصول اور ترقیٔ درجات سے مالا مال ہوتے گئے اور کمال یہ ہے کہ بزرگوں کی صحبت و توجہات کی برکت سے طبیعت ایسی بن گئی تھی کہ آخر وقت تک علم و دین کے مشاغل سے وابستہ رہے، افتاء کی مجلسیں بھی ہوتی رہیں، تالیف و تصنیف کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا، علمی مشاورت اور دینی مسائل میں غور خوض کا سلسلہ بھی بدستور قائم رہا''[8]۔

امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آپ کے تعلقات کے حوالے سے علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

"امام العصر حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ واستفادے کے بعد حضرت مفتی صاحب کا ہمیشہ ظاہری و باطنی تعلق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قائم رہا،انقلاب کے زمانے میں جب کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم سے جدا ہوگئے تھے۔اس وقت بھی آپ کا تعلق ایک لمحے کے لیے بھی منقطع نہیں ہوا برابر حاضری ہوتی رہی، کیا مجال ہے کہ تعلق وعقیدت وارادت میں ذرا بھی فرق آئے"[(9)]۔

نیز آپ کی بعض تصنیفات پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی زندگی میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی توجہات کا بہت بڑا دخل رہا، بالکل ابتدائی دور میں جب "معارف" اعظم گڑھ میں فوٹو کے جواز پر ایک مبسوط مقالہ آیا جو در حقیقت شیخ محمد نجیت مطیعی شیخ الازہر کے رسالہ ''اباحۃ الصور الفوتوغرافیہ'' کا چربہ تھا اور اچھا خاصہ محققانہ علمی انداز تھا، کیونکہ شیخ محمد نجیت اپنے دور میں مصر کے سب سے بڑے عالم و محقق سمجھے جاتے تھے اور مذاہب امت کے ادلہ وتفصیلات میں بقول حضرت شیخ محمد زاہد الکوثری آیۃ من آیات اللہ تھے۔

جب یہ مقالہ شائع ہوا تو حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اس کی فکر ہوئی، اپنے حلقۂ تلامذہ میں سے حضرت شیخ صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ اس کا جواب لکھیں چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے ان کی علمی راہنمائی میں "القاسم" (ماہنامہ دار العلوم دیوبند) میں اس پر ایک مفصل علمی تحقیقی مضمون لکھا جو بعد میں '' التصویر لاحکام التصویر'' کے نام سے مستقل رسالہ کی شکل میں شائع ہوا حضرت شاہ صاحب ہی کی راہنمائی میں آیت خاتم النبیین کی شرح تفسیر عمدہ اور ادیبانہ انداز سے عربی میں تالیف فرمائی جو "ہدیۃ المھدیین" کے نام سے شائع ہوئی اس پر حضرت امام العصر رحمہ اللہ کی قابل رشک تقریظ ہے اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

أما بعد: فإن صاحبنا الأحوذي المولوي محمد شفيع الديوبندي وفقه الله لما يحب ويرضاه . جمع باستدعائي رسالته "هدية المهديين في آية خاتم النبيين" جزاه الله عني وعن سائر المسلمين خير الجزاء وقد جزاه، أسرد فيه نحو مائة وخمسة وستين حديثا في انقطاع النبوة بعد ما بعث الله نبيه محمدا مصطفاه ...إلى قوله: وهاك رسالة تفسيرية،حديثية، كلامية، فقهية، وبعد ذلك كله أدبية يسري ألفاظها كسراية الروح في البدن ويقع في قلب المؤمن كحلاوة الإيمان ويجري في العروق كمحض اللبن:

هلم يا صاح إلى روضة   يجلو بها العاني صداهمه

نسيمها يعثر في ذيله   وزهرها يضحك في كمه

ترجمہ: "ہمارے رفیق دانشمند مولوی محمد شفیع دیوبندی نے۔اللہ تعالی انہیں اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے میری فرمائش پر رسالہ "ہدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین" جمع کیا ہے۔اللہ تعالی انہیں میری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائیں،اس میں اس مضمون کی قریباً ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) حدیثیں ذکر کی ہیں کہ بعثت کے بعد نبوت ختم ہو چکی ہے۔

یہ رسالہ تفسیری بھی ہے اور حدیثی،کلامی اور فقہی بھی ،اور ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہے، جس کے الفاظ روح کی طرح بدن میں سرایت کرتے ہیں، حلاوت ایمان کی طرح قلب مومن میں جاگزین ہوتے ہیں اور خالص دودھ کی طرح رگ وپے میں گردش کرتے ہیں۔

(شعر کا ترجمہ)اے رفیق! اس گلشن کی سیر کرو۔ جس سے ایک غم زدہ شخص اپنے ہموم وافکار کا زنگ دور کرتا ہے۔اس کی یاد صبا اس کے دامن سے اٹھکیلیاں کرتی ہے اور اس کی کلیاں اس کے دامن میں مسکراتی ہیں[10]۔"

نیز فرماتے ہیں:

"الغرض حضرت مفتی صاحب کی علمی طبیعت مزاج میں حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی توجہات کو بڑا داخل ہے جس طرح حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ، کی توجہات سے یہ مزاج بن گیا کہ وقت کی قدر ہو اور ضیاع وقت سے احتراز کیا جائے اور مفید عوام تالیفات سے دین کی خدمت کی جائے،

حضرت مرحوم کی خصوصیات و تالیفات اور دار العلوم کراچی کی تاسیس پر اور "ادارۃ المعارف" قائم کرنے پر لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے اور لکھتے رہیں گے مجھے تو صرف یہ لکھنا ہے کہ بیک وقت وہ دار العلوم دیوبند اور تھانہ بھون دونوں کی جامع شخصیت تھی اور دونوں کے صحیح نمائندے تھے اور علم و فضل کے ساتھ مزاج میں بے حد سادگی تھی نہایت متواضع تھے۔اہل علم و فضل کے بڑے قدر دان تھے باوقار بردبار تھے۔ ۱۳۴۴ھ سے لے کر آج ۱۳۹۲ھ تک میر ان سے تعلق رہا ابتداء سے انتہا تک جو چیز نظر آئی وہ یہ ہے کہ علمی شغف اور علمی قدر دانی میں دیوبند اور تھانہ بھون کے صحیح مسلک و مشرب کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کیا۔

حضرت مفتی صاحب کو حق تعالی نے بہت سی نعمتوں سے نوازا،اور اولاد صالح کی نعمت سے مرحوم کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں اور اپنی عمر کے آخری مراحل میں "معارف القرآن" جیسی تفسیر کے ذریعہ سے علمی و دینی حدمت انجام دے کر آخرت کے لیے بہت کچھ ذخیرہ جمع فرمایا"[11]۔

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ:

ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنے تعلق کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے خانقاہ تھانہ بھون میں وقتاً فوقتاً ملاقات تو ہوتی رہی، لیکن کسی تفصیلی تعارف یا کثرت مجالست کی نوبت نہیں آئی۔

ہاں! تعارف خاص اور خصوصی تعلق اس وقت پیدا ہوا جب میں ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب کراچی میں تشریف رکھتے ہیں، اس وقت پہلی بار میرے دل میں شدت کے ساتھ یہ داعیہ پیدا ہوا کہ حضرت مفتی صاحب کی ذات گرامی کو غنیمت سمجھنا چاہیے وجہ یہ تھی کہ اگرچہ مجھے بحمد للہ حضرت حکیم الامت سے عرصہ دراز تک تعلق کا شرف حاصل رہا، لیکن مجھے کبھی اپنی حالت پر اطمینان نہیں ہوا، میں یہ سمجھتا تھا کہ میں نے کچھ حاصل نہ کیا، اس لیے مجھ میں ایک تشنگی اور تڑپ تھی، اور اپنی حالت کو معتبر اور مستند بنانے کا ہمیشہ دھیان رہتا تھا، اس لیے کراچی پہنچنے کے بعد میں نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ، کی ذات کو اپنے لیے غنیمت سمجھ کر آپ سے تعلق قائم کیا[12]۔

ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ پر اور دارالعلوم کراچی کی تاریخ وتاسیس پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب کو حضرت حکیم الامت اور اپنے دوسرے اساتذہ ومشائخ سے نمود نمائش کے بغیر خالصۃً لوجہ اللہ خدمت دین کا جذبہ وراثت میں ملا تھا، چنانچہ پاکستان آنے کے بعد آپ کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ یہ ملک نیا نیا بنا ہے، اس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو عام کرنے اور علوم اسلامی کی نشرواشاعت کی ضرورت ہے اس غرض کے لیے آپ نے دارالعلوم کراچی قائم فرمایا۔

شروع میں یہ ادارہ نانک واڑہ کی مختصر عمارت میں تھا، لیکن جب کام وسیع ہوا اور جگہ تنگ پڑ گئی تو وسیع جگہ کی ضرورت پڑی۔ اللہ تعالی نے اس کے لیے ایک کشادہ جگہ کا بھی انتظام فرمادیا اور آجکل جس جگہ پر اسلامیہ کالج ہے، یہ جگہ جو اس وقت خالی تھی دار العلوم کے لیے الاٹ ہو گئی جگہ کشادہ اور شہر کے بہترین حصے میں ہونے کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ کے مزار سے بالکل متصل تھی، اس لیے دار العلوم کے لیے بے حد موزوں تھی، چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے اس پر دار العلوم کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ادارہ کیا اور سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ملک کے مقتدر علماء صلحاء کو دعوت دی اور ایک جلسہ بھی منعقد فرمایا لیکن عین اس وقت جب اس زمین پر اس چشمہ خیر کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی، بعض اہل غرض نے حضرت علامہ عثمانی کی محترمہ اہلیہ (رحمہا اللہ) کو کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کی بناء پر انہوں نے اس منصوبے کی مخالفت شروع کر دی اور ایک مرتبہ خود مزار پر تشریف لا کر انہوں نے اس کی مخالفت کا اعلان کیا۔

شدید غلط فہمیوں کی بناء پر جب کوئی فہمائش کارگر نہ ہوئی تو لوگوں نے حضرت مفتی صاحب سے یہی کہا کہ چونکہ مخالفت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اس لیے آپ اپنا کام جاری رکھیں تحفظ قانون کے اداروں نے بھی پورا یقین دلایا کہ آپ کسی تذبذب کے بغیر یہ کام شروع کر سکتے ہیں اور پولیس آپ کے ساتھ ہو گی لیکن حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا، حضرت علامہ عثمانی کی اہلیہ محترمہ اگرچہ شدید غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی ہیں لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے استاذ محترم کی اہلیہ کے خلاف اس معاملے میں قوت استعمال کروں اللہ تعالی مدرسے کے لئے کوئی زمین اور دے دے گا۔

اللہ اکبر! استاذ کے احترام ان کی اہلیہ کی عزت اور بے نفسی و توکل کا کیا مقام تھا کہ حق پر ہونے اور اس کو منوانے کی پوری طاقت کے باوجود اتنی بڑی زمین محض استاذ کی اہلیہ کی دل شکنی کے اندیشے سے چھوڑ بیٹھے، اس وقت دار العلوم کے لیے کوئی متبادل وسیع و عریض جگہ مل گئی کہ اس کا خواب و خیال بھی نہیں تھا، یہ جگہ شہر سے کافی دور

تھی کئی کئی میل تک آبادی نہ تھی، حضرت مفتی صاحب نے اس جنگل کو منگل بنایا، دیکھتے ہی دیکھتے یہاں وسیع وعریض درسگاہیں، طلباء کا دارالاقامہ، دارالحدیث، دارالتفسیر، دارالافتاءاور تمام ضروریات فراہم ہونے لگیں۔

آپ نے دارالعلوم صرف دین کی نشر واشاعت کے لیے قائم فرمایا تھا،اس سے آپ کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں تھا آپ نے اس کی بنیاد توکل پر رکھی، نہ پہلے کوئی اشتہار دی، نہ فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کی بلکہ توکلا علی اللہ بیٹھ گئے اور یہ توکل انسان اس وقت کر سکتا ہے جب اس کا ایمان کامل ہو۔

دارالعلوم کی بنیاد اخلاص اور اتباع سنت پر رکھی گئی، چنانچہ یہاں کے درودیوار میں جو روشنی ہے وہ حضرت مفتی صاحب کی للہیت کی نشانی ہے۔ جس طرح حضرت محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد وتقوی، طہارت اور للہیت پر رکھی تھی، انہی کی اتباع کرتے ہوئے ان کے ایک نام لیوانے اس دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس مدرسے کو ملک بھر میں منفرد شان عطا فرمائی اور اس کا وقار علمی دلوں میں جاگزین ہوگیا[(13)]''۔

تفسیر "معارف القرآن" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے ''معارف القرآن'' تالیف فرمائی،اس کے بارے میرا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب حضرت مفتی صاحب سے اللہ تعالی نے غیر معمولی طور پر لکھوائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تالیف پر مامور من اللہ تھے، یہی وجہ ہے کہ شدید علالت اور عوارض کے ہجوم میں بھی آپ کو ہر وقت اس تالیف کا دھیان رہتا تھا، مجھے یاد ہے کہ جب آپ کو پہلی بار دل کا دورہ ہوااور آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تو آپ کے ذہن پر سب سے زیادہ فکر "معارف القرآن" کی تھی، دل کی دورہ پڑا ہوا ہے ہسپتال میں داخل ہیں، اکثر اوقات غشی طاری رہتی ہے لیکن جب کبھی ہوش آتا تو فرماتے کہ "معارف القرآن" کا ڈیڑھ پارہ باقی ہے۔"

آپ یہ بات بڑی حسرت سے فرماتے اور معلوم ہوتا تھا کہ انکی یہ آرزو ہے کہ "معارف القرآن" کی تکمیل ہو جائے، کیا حضرت کے اس مقام کا اندازہ کوئی کر سکتا ہے؟ رضائے الٰہی کے حصول کا جو ذریعہ "معارف القرآن" کو بنالیا ہے، اس کا کچھ حصہ باقی رہ جانے کی خلش روح میں متحرک ہے، اللہ اکبر! جن لوگوں کو قرب و معیت الٰہی میں فنائے تام حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کے پیش نظر سوائے تصور ذات کے کوئی اور شئے نہیں ہوتی حضرت مفتی صاحب اس وقت اسی مقام لا الہ الا اللہ میں غرق تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ آرزوں پوری فرمادی"[14]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے علوم باطنی اور اخلاق کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب قدس سرہ، کو اللہ تعالیٰ نے علوم ظاہری کیساتھ علوم باطنی کی دولت بھی فروانی کے ساتھ عطا فرمائی تھی علوم باطن کے بغیر علوم ظاہر ایسے ہیں جیسے روح کے بغیر جسم، اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو جسم کے ساتھ اس کی روح بھی عنایت فرمائی تھی، آپ کی زندگی علم و عمل کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے باوجود انتہائی سادگی تھی، آپ ہر کس ناکس سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے، آپ کی بے تکلفی اور سادگی کا عالم یہ تھا کہ میں ایک روز آپ سے ملنے گیا تو دیکھا کہ حضرت کمرے میں جھاڑو دے رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں دے دوں؟ فرمایا نہیں، پورے کمرے کو جھاڑو دی، کچھ کچرا اٹھا کر پھینکا۔ پھر ہاتھ دھو کر مصافحہ کیا اور بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو باعتبار دین و دنیا بڑے مراتب عالیہ عطا فرمائے تھے مگر ان کا انداز زندگانی اسی طرح سادہ اور بے تکلف تھا اور کوئی امتیازی شان معلوم نہ تھی، ان کی ساری زندگی اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈھلی ہوئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی ذات میں بڑی محبوبیت تھی''[15]۔

آپ کی نجی زندگی کے متعلق رقم طراز ہیں:

''آپ کی نجی زندگی عام انسانوں کی طرح تھی لیکن اس میں استغناء کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، آپ نے کبھی کسی امیر یا عہدہ دار سے اس بناء پر تعلق قائم نہیں کیا کہ اس سے اپنی ذات کو بلکہ دارالعلوم کو کوئی فائدہ پہنچے۔ آپ نے کبھی کسی دولت مند سے دارالعلوم کے لیے چندے کی فرمائش نہیں کی کوئی شخص اپنی ہزار سعادت سمجھ کر رقم لے آتا بلکہ اگر کسی شخص کے چندے میں اس بات کا شائبہ بھی محسوس ہوتا کہ یہ صدق واخلاص کے بجائے احسان جتانے کی غرض سے دے رہا ہے، آپ اسے واپس فرمادیتے تھے''(16)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی صبر ورضا کے متعلق لکھتے ہیں:

''اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ، کو صبر کا بھی نہایت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ جب حضرت کے سب سے بڑے صاجزادے مولوی محمد زکی صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت مفتی صاحب شدید علالت کی وجہ سے صاحب فراش اور جسم پر آبلے پڑ جانے کی وجہ سے ناقابل بیان جسمانی کرب میں مبتلا تھے، اس حالت میں اپنے انتہائی ہونہار، سعادت مند، اور جوان بیٹے کا حادثہ وفات کوئی معمولی بات نہ تھی، ہم سب سوچ رہے تھے کہ کس عنوان سے ان کو اس حادثے کی اطلاع کی جائے۔

ایسی ہی آزمائشوں کے وقت مقربین بارگاہ کی عالی ظرفی اور قوت ایمانیہ کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی زندگی کا یہ منظر اپنی نوعیت میں بے مثال اور انتہائی ایمان افروز ہے، یہ جانکاہ خبر سن کر حضرت پر ایک خاص اضطراری کیفیت چند لمحوں کے لیے طاری ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اللہ اللہ کے الفاظ زبان پر جاری ہوگئے بہت نقاہت کے ساتھ رک رک کر اپنے تاثرات قلبی کا اظہار فرمانے لگے اور سلسلہ گفتگو دیر تک جاری رہا حضرت کی باتیں ہم سن رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں کو صبر جمیل کی تلقین فرما رہے ہیں۔

فرمانے لگے کہ اس صدمۂ جانگداز کے مقابلے میں جسمانی سوزش کی یہ اذیت بھی اللہ تعالی کی بڑی نعمت محسوس ہوتی ہے، حضرت مفتی صاحب اس وقت کچھ ایسے عالم میں تھے کہ مقام رضا بالقضا، مقام صبر جمیل، مقام معیت الہیہ مقام عبدیت کاملہ، مقام فنا الفنا، مقام فنافی اللہ ،ان میں سے ہر مقام ان کا مقام تمکین معلوم ہوتا تھا''[17]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ سے استفادے اور ان سے اپنی عقیدت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''میں نے جس مقصد کے لیے حضرت مفتی صاحب سے تعلق قائم کیا تھا،الحمدللہ وہ پورا ہوا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میرا تعلق ان کے واسطے سے اپنے شیخ کے ساتھ قائم اور مضبوط رہے کیونکہ میں اپنے آپ کو ناقص سمجھتا تھا۔ بحمد اللہ حضرت مفتی صاحب کے تعلق کے بعد وہ تعلق اور قوی اور مستحکم ہو گیا اور میں نے اپنا مقصد پالیا، لیکن قدر مردم بعد مردم، حقیقت یہ ہے کہ اب میری تشنگی کا بڑا تحسر یہی ہے کہ مجھے حضرت مفتی صاحب کی کماحقہ قدر ومنزلت اور مقامات باطنہ کے علو کا صحیح عرفان حاصل نہ ہوا اور میں ان سے معتدبہ استفادہ نہ کر سکا، مگر یہ حقیقت بھی میرے لیے نہایت مغتنم ہے کہ مجھے ان سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی اور انہوں نے میرے ساتھ نہایت محبت عقیدت کا بے مثال تعلق رکھا، اللہ تعالی کا یہ میرے اوپر عظیم احسان وانعام ہے اور انشاءاللہ میرے لئے سرمایہ آخرت ہے''[18]۔

۲

فصلِ دوم

فرزندان و جانشینوں کی نظر میں

فصل دوم: فرزندان اور جانشینوں کی نظر میں

جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو "بھیا جی" کہہ کر پکارتے تھے، موصوف اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اپنے گھر میں جب آنکھ کھولی تو حضرت والد صاحب کے لئے اپنے سب بڑے اور چھوٹے بہن بھائیوں کو ''بھیا جی''ہی کہتے سنا اور دیکھا، اس لئے احقر کی زبان پر بھی بچپن سے اپنے والد ماجد کے لئے یہی لفظ ''بھیا جی'' چڑھا ہوا تھا اور ہم سب بہن بھائی اپنے والد صاحب قبلہ مرحوم کو ''بھیا جی''ہی کہتے تھے، یہ لفظ بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا بھی معلوم ہوتا تھا اور بعض دفعہ ہمارے دوست احباب بھی ہم سے معلوم کیا کرتے تھے کہ تم اپنے والد کو بھیا جی کیوں کہتے ہو؟ بچپن میں ہمیں خود بھی اس کی وجہ معلوم نہیں تھی، لیکن جب ذرا بڑے ہو کر ہوش سنبھالا تو تب معلوم ہوا کہ ہم اپنے والد کو بھیا جی کیوں کہتے ہیں۔

دار صل آج سے تقریباً چالیس پینتالیس سال پہلے ہمارے سابقہ اصل وطن دیوبند وغیرہ کے شریف گھرانوں میں یہ عام دستور تھا کہ جب گھر میں دادا، دادی وغیرہ حیات ہوتے لفظ ابا، ابو یا ابا جان استعمال کرنا بزرگوں کی بے ادبی خیال کرتے تھے۔

چنانچہ ہم سب بہن بھائی اپنے دادا جان حضرت مولانا محمد یاسین صاحب نور اللہ مرقدہ، کو "ابا" کہا کرتے تھے ہم سب بہن بھائیوں میں صرف برادر عزیز مولوی محمد تقی عثمانی سلمہ کی زبان پر والد صاحب کے لیے لفظ

''ابا'' چڑھا ہوا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ ان کی پیدائش قبلہ دادا جان کے انتقال کے بعد ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ شروع ہی سے والد صاحب کو ابا کہتے تھے یہ ہے لفظ "بھیاجی" کی وجہ تسمیہ''[19]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی شب و روز مصروفیات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''آج سے تقریباً چوالیس سال قبل بھیاجی دارالعلوم میں میں صدر مفتی کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے اور ساتھ ہی صبح کو ایک یا دو گھنٹہ دارالحدیث میں درس حدیث بھی دیا کرتے تھے اس وقت والد صاحب کے اصل کاموں کا تو علم نہیں تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ احقر بھی دارالعلوم میں درجہ قرآن میں قاعدہ یا سپارہ پڑھتا تھا۔ اور اس وقت کسی نہ کسی بہانے اکثر والد صاحب کے پاس دارالافتاء میں حاضر ہو جاتا تھا اور احقر کو یہ جان کر اور دوسرے لوگوں سے سنکر بہت فخر اور مسرت ہوا کرتی تھی کہ ہمارے والد صاحب دارالافتاء کے صدر مفتی ہیں اور اس دارالحدیث میں درس دیتے ہیں جہاں اس وقت کے اکابرین یعنی حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات درس دیتی ہیں۔

ہمیں اس وقت صدر مفتی اور دارالحدیث میں درس وغیرہ کی اہمیت کا کچھ علم نہ تھا، بس لوگوں سے سننے سے اتنا اندازہ ہم نے کر لیا تھا کہ بھیاجی مدرسہ کے بڑے لوگوں میں سے ہیں اور ہمارے فخر اور غرور کے لیے اتنا ہی کافی تھا، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ بھیاجی بڑے لوگوں کی صف میں کیسے شامل ہوئے اور اس مقام تک پہونچنے کے لئے انہوں نے کتنے پاپڑ بیلے؟

بھیاجی مرحوم و مغفور اپنی شب و روز کی بے انتہا علمی اور دوسری مصروفیات کے باوجود عصر سے مغرب تک کا وقت ہمیشہ اپنے اہل و عیال اور بزرگوں کی صحبت کے لئے فارغ کر لیا کرتے تھے کسی بزرگ کے یہاں جانا

ہوتا تو احقر کے بڑے بھائی مولوی محمد زکی مرحوم کو یا احقر کو یا ہم دونوں کو ساتھ لے کر یا تو حضرت میاں صاحب یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کو تشریف لے جایا کرتے یا کسی اور بزرگ کی''[20]۔

اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھانہ بھون کے سفر کی سرگزشت سناتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''دار العلوم دیوبند میں سالانہ امتحانات کے بعد شعبان میں تعطیل ہوتی۔ بھیاجی اکثر تھانہ بھون میں اپنے مربی و مرشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر رمضان شریف گزارا کرتے تھے کئی بار اپنے سب اہل عیال کو بھی ساتھ لے کر گئے۔ اس طرح کے دو تین سفر جن میں ہم بھی والد صاحب کے ساتھ گئے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ تھانہ بھون میں ایک بار تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکان کے بالائی حصہ میں ہم لوگوں کو قیام کرایا اور ایک بار حضرت کے مکان سے متصل ایک بڑا مکان کرایہ پر لے کر والد صاحب نے رمضان شریف میں اپنے سب بچوں کے ساتھ قیام فرمایا''[21]۔

نیز قیام پاکستان کی جدوجہد کے سلسلے میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ لاہور (پنجاب) کے سفر کی داستان سناتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''غالباً ۱۹۴۶ء میں جس وقت تحریک پاکستان پورے زور شور سے چل رہی تھی تقسیم ہند سے تقریباً ایک سال یا چند ماہ پہلے پاکستان کے حمایت میں جمیعت العلماء اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی جس میں دیوبند سے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بہت سے حضرات بھی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے آپ کے ساتھ احقر بھی ساتھ گیا۔

لاہور میں یہ عظیم الشان اجتماع تھا کہ احقر نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا اجتماع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً اس میدان میں جلسے منعقد ہوئے جہاں اس وقت مینار پاکستان بنا ہوا ہے، ان جلسوں میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی

رحمۃ اللہ علیہ، والد صاحب اور دوسرے رہنماؤں کی بڑی ولولہ انگیز اور یادگار تقریریں ہوئیں جنہوں نے وہاں پاکستان کے حق میں فضا کو سازگار بنادیا۔ لاہور سے واپسی پر امرتسر لے گئے اور وہاں رات کو مسجد میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ خاص تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں قیام ہوا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلے احقر نے زیارت کی۔ والد صاحب نے وہاں بھی خطاب فرمایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر جالندھر پہنچے۔ وہاں تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دوسرے خلیفہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں قیام ہوا۔ احقر نے ان بزرگ کی بھی پہلی زیارت اس سفر میں کی۔ جالندھر سے اگلے روز روانہ ہو کر لدھیانہ اور پھر وہاں سے انبالہ گئے، ان سب مقامات پر متعدد بڑے بڑے جلسوں میں پاکستان کے حق میں آپ کی تقریریں ہوئیں۔

اس پورے سفر میں والد صاحب تو پاکستانی مشن کے لئے کام کر رہے تھے اور ہمیں جلسوں میں شرکت کے علاوہ مختلف شہروں کی سیر وسیاست کے خواب مواقع مل رہے تھے تقسیم ہند اور بناء پاکستان کی تحریک پورے عروج پر تھی اور بچے بچے کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ بن کے رہے گا پاکستان لے کے رہیں گے پاکستان"[22]۔

قیام پاکستان کے بعد کی صورتحال کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۴۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کے نام سے نمودار ہو چکی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل عام کا ایسا بازار گرم ہوا کہ الامان والحفیظ جن لوگوں نے تقسیم سے قبل پاکستان کی حمایت میں کچھ بھی حصہ لیا تھا ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور طرح طرح سے پریشان کیا جانے لگا تو لاکھوں مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب عام لوگوں پر یہ ستم ڈھائے جا رہے تھے تو والد صاحب نے تو پاکستان بننے سے قبل باقاعدہ بہت سرگرم حصہ لیا ان پر کئی فتوئے لاکھوں کی تعداد میں بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں اور کتابچوں کی صورت میں

شائع ہو چکے تھے اسی فتویٰ کی وجہ سے ضلع مظفر نگر کی سیٹ سے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کی کامیابی میں زبردست مدد ملی تھی"[23]۔

دیو بند سے پاکستان ہجرت کی روداد ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چنانچہ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو دیو بند سے بذریعہ ریل گاڑی دہلی پہنچے اور ایک رات قیام کے بعد وہاں سے براستہ جودھ پور، کھوکھرا پار، حیدر آباد سندھ مختلف جگہ قیام کرتے ہوئے کراچی پہنچے، یہ سفر بھی ایک یادگار، تاریخی اور دلچسپ سفر تھا، دلوں میں اپنے عزیز وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا کسی کو افسوس نہ تھا، بلکہ پاکستان کی محبت اور اس کی خدمت کا جذبہ ہر شخص کے دل میں موجزن تھا"[24]۔

پاکستان ہجرت کرنے کے بعد تعمیرِ پاکستان کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"کراچی پہونچنے کے بعد عام لوگوں، لیڈروں اور حکام میں بھی تعمیر پاکستان اور اس نو مولود اسلامی مملکت کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کا قابل قدر جذبہ ہر جگہ دیکھنے میں آتا تھا اور اسی جذبہ لگن اور محنت کا نتیجہ تھا کہ یہ بے سر و سامان مملکت مختصر سے ہی عرصہ میں ایک عظیم اور طاقت ور ملک بننے کی راہ پر گامزن ہو گئی تھی۔ لیکن ہماری شامت اعمال کہ یہ ملک قائدِ اعظم، قائد ملت اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے مخلص اور دیانت دار قائدین سے جلد ہی محروم ہو گیا اور بعد میں آنے والے نام نہاد رہنماؤں نے عوام کے اس عظیم جذبہ کو فنا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور آج جو بھی کچھ ہو رہا ہے یہ سب کچھ ہی نام نہاد لیڈروں اور رہنماؤں کی وجہ سے ہے"[25]۔

کراچی ہجرت کے بعد مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے گھریلو حالات اور ذریعۂ معاش کے متعلق رقمطراز ہیں:

''بھیا جی جب کراچی پہونچے تو ان کے ساتھ کثیر عیال تھی اور اللہ تعالی کے سوا کوئی مددگار نہ تھا اور نہ کوئی ذریعہ معاش، بھیا جی پر وہ زمانہ بہت سخت گزرا اور گھر کے مصارف بھی قرض وغیرہ سے پورے فرماتے رہے۔ لیکن خودداری کا یہ عالم تھا کہ کسی اور سے تو کیا کہتے، اپنے گھر والوں اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کبھی اس کا ذکر نہ فرمایا اور نہ تو وہ ایسا وقت کہ سامان سے بھرے ہوئے بنگلے اور زمین، جائیداد اور دوکانیں لوگ دھڑا دھڑ الاٹ کرا رہے تھے او قبضے کر رہے تھے۔ اگر بھیا جی چاہتے تو وہ بھی ایسا کر سکتے تھے لیکن آفرین ہے اس بندہ خدا مست پر کہ ایسے ذرائع سے ایک حبہ بھی حاصل کرنے کو عار سمجھا''[26]۔

کراچی میں ایک اسلامی طباعتی ادارے "دارالاشاعت" کے قیام کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

بنام خدا دارالاشاعت کے نام سے جو ادارہ حضرت مولانا سید اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ اور والد صاحب نے دیوبند میں قائم کیا تھا اسی نام سے کراچی میں عیدگاہ کے قریب ایک جگہ لے کر نہایت قلیل سرمایہ سے کام شروع کر دیا۔ دکان کا افتتاح آپ نے ۱۹۵۹ء میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے کرایا۔ سرمائے وسائل اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام ایک مدت تک نہایت سست رفتاری سے جاری رہا۔ لیکن بالآخر بھیا جی کی دعاوں اور توجہ سے کام میں ترقی ہوتی گئی اور اب ان سطور کی تحریر کے وقت اللہ تعالی نے بافراغت عزت کی روزی بھی عنایت فرما رکھی ہے اور علم دین کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے اور اب تک کم بیش دو اڑھائی سو چھوٹی بڑی کتابیں تقریباً ہر اسلامی موضوع پر احقر کے اس ادارہ سے شائع ہو چکی ہیں گو شروع میں یہ کام احقر نے بادل ناخواستہ محض تعمیل حکم کی وجہ سے شروع کیا تھا، لیکن بھیا جی کے اس قیمتی مشورہ کی حقیقت اب معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے دوسری قسم کے کاروبار دھندوں سے بچا کر کس قدر احسان عظیم اس احقر پر کیا اور کسی نہ کسی حد تک علم سے وابستہ کر دیا، یہ محض اللہ تعالی کا فضل اور بھیا جی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے''[27]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے والدین کے ساتھ تعلق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بھیاجی اپنے والدین کی ایک لائق اور قابل رشک فرمانبردار اولاد تھے اور ہمیشہ اپنے والدین کی خدمت کر کے دلی دعائیں لیتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی ہمیں آج دین و دنیا کی جتنی دولتیں حاصل ہوئی ہیں وہ محض ہماری والدین کی دعاوں کا نتیجہ ہیں اسی کے ساتھ فرماتے کہ میں نے اپنی زندگی میں ماں باپ کی خدمت کر کے دعائیں لینے والا کوئی شخص محروم نہیں دیکھا۔اس کا اجر آخرت میں تو ملتا ہی ہے اور دنیا ہی میں اللہ تعالی اس کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

ہمارے دادا جان تو احقر کے بالکل بچپن میں ہی انتقال فرما گئے تھے ان کے ساتھ تو والد صاحب کا طرز عمل احقر کو یاد نہیں والد صاحب ایک واقعہ کا ذکر ہمیشہ اپنی زندگی کے آخری تک اکثر سنایا کرتے تھے کہ میرے والد ماجد مولانا یٰسین صاحب نے ایک دن اپنی بیماری میں احقر کو بلایا اور فرمایا کہ شفیع مرنے کے بعد اپنے والدین کو بھول تو سب ہی جایا کرتے ہیں، لیکن تم جلدی نہ بھولنا، بھیاجی فرماتے تھے کہ اپنے والد کے یہ جملے بھی اسی طرح یاد ہیں جیسے آج ہی سنے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ان کے انتقال کے بعد سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ ان کے لئے ایصال ثواب نہ کرتا ہوں اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ کیسے وہ کہنے والے باپ تھے اور اس پر عمل کرنے والا کیسی عظیم اولاد تھی۔ البتہ دادی اماں یعنی بھیاجی کی والدہ نے ماشاءاللہ اچھی طویل عمر پائی اور ان کا انتقال اس وقت ہوا جب ہم سب بہن بھائی شادی شدہ اور بیوی بچوں والے ہو چکے تھے اور والد صاحب اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود دادی جان کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد و تیار رہتے تھے گھر میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے اپنے والدہ کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان کی ہر طرح کی ضروریات کا اس قدر خیال رکھتے کہ ان کاموں کو خود اپنے ہاتھ سے اس طرح انجام دیتے کہ آج ہم اور اس زمانہ کی اولاد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے''[28]۔

مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے اہل عیال کے ساتھ تعلق کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''بھیاجی کی شخصیت جہاں باوقار اور بارعب لیکن انتہائی محبوب شخصیت تھی وہاں آپ اپنے اہل واولاد کے ساتھ اس قدر بے تکلف بھی تھے کہ ہر شخص ان سے پوری بے تکلفی سے بات کرتا اور والد صاحب پوری توجہ سے بات سن کر انتہائی بے تکلفی سے جامع ومانع جواب عنایت فرماتے اور ہمارے مسائل حل فرماتے۔ بھیاجی کو اپنی اولاد سے بہت تعلق تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالی کے فضل سے دنیا کے مال اسباب سے کبھی محبت نہیں ہوئی لیکن اولاد میری سب سے بڑی کمزوری ہے اپنے اسی تعلق کی وجہ سے کسی اولاد کا جدا ہونا بھیاجی پر بہت شاق گذرتا تھا اور سب اولاد تو ہمیشہ ساتھ ہی رہی لیکن ہمارے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد زکی کیفی اپنے کاروبار کی وجہ سے پاکستان آنے کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور ایک بہن رقیہ خاتون جو بہنوں میں سب سے چھوٹی لیکن احقر سے صرف ایک یا ڈیڑھ سال بڑی ہیں (جنہوں نے مفتی اعظم نمبر میں شریک اپنے مضمون میں احقر کی جلد پیدائش کو اپنی شیر خوارگی میں احقر کی شرکت کی وجہ سے احقر کو عجلت پسند بھائی قرار دیا ہے) ان کی شادی ۱۹۵۳ء لاہور میں ہوئی جس کی وجہ سے بھیاجی کی یہ دو اولاد لاہور میں قیام پذیر تھیں۔ ان دونوں کی جدائی کا خیال بھیاجی کو بہت تھا اور ہر خوشی اور اجتماع جس میں وہ شریک نہ ہوتے ان کا ذکر ضرور کرتے۔ اتفاق سے ان دونوں سے والد صاحب کو بہت خصوصی تعلق اور محبت تھی[29]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ عصر سے مغرب تک کا وقت خصوصی طور پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ گذارتے تھے اس حوالے سے جناب محمد رضی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''عصر سے مغرب تک وہ وقت بھیاجی ہمیشہ اپنے گھر والوں کے لئے خالی رکھتے اور اکثر گھر والے اس وقت اس طرح والد صاحب کے گرد جمع ہو جاتے جیسے شمع کے گرد پروانے یہ ایک بہت لطف مجلس ہوتی جس میں گھر کا

ہر فرد حصہ لیتا۔اور مختلف موضوعات پر دلچسپ اور سبق آموز باتیں ہوا کرتیں ہم لوگ آپس میں ہنسی مذاق بھی کرتے تھے اور بھیاجی ہماری باتوں سے لطف اندوز ہوتے''[30]۔

جناب محمد رضی عثمانی صاحب ہر اتوار کے دن اپنے والد محترم کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے،اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

''احقر نے شہر میں اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے یہ معمول بنالیا تھا کہ اتوار کی تعطیل میں اکثر تو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ورنہ تنہا شام کو ٹھیک عصر کی اذان کے وقت دارالعلوم پہنچ جاتا اور عصر کی نماز وہاں مسجد میں ادا کرتے ہی حضرت والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔

بھیاجی کو ہمیشہ اس دن اور اس وقت اپنا منتظر پاتا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دروازہ پر احقر کے انتظار میں آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں۔احقر کو دیکھتے ہی ایسی خوشی کا اظہار فرماتے کہ جیسے بہت لمبے سفر سے واپس آیا ہوں۔اکثر فرماتے کہ ڈاکٹر، حکیم تقویت قلب کے لئے دوائیں اور غذائیں بتاتے ہیں بھائی میری تقویت تو اولاد کو خوش دیکھنے میں ہے اور ان کو دیکھ لیتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھی پی لیا ہے اور بالکل حقیقت تھی اور بعد عصر حاضری میں کسی وجہ سے کوئی معمولی تاخیر بھی ہو جاتی تو گھڑی دیکھتے رہتے اور کچھ زیادہ وقت گذر جاتا تو لسبیلہ ٹیلیفون کر کے دریافت فرماتے کہ بھئی ابھی تک نہیں پہونچے، کس وقت وہاں سے چلے تھے؟ کیا بات ہے؟ کس سواری سے آرہے ہیں اور جب پہنچ جاتا تو خوشی میں ڈوبی ہوئی ہلکی سے خفگی سے فرماتے بندہ خدا کہاں رہ گئے تھے۔ہم تو انتظار کرتے کرتے پریشان ہو گئے۔

اپنی زندگی کے آخری بیماری کے سالوں میں جب والد صاحب کا شہر آنا تقریباً ترک ہی ہو گیا تو اتوار کے دن کا انتظار ایک دن پہلے ہی سے شروع ہو جاتا اور اتوار کے دن صبح سے گھر میں ذکر فرمایا کرتے تھے کہ آج رضی آئے گا

اور شام کو احقر کی حاضری تک گھڑی دیکھ کر حساب لگاتے رہتے کہ اب چلے ہوں گے ،اب راستہ میں ہوں گے اور اب پہونچنے والے ہوں گے احقر کو والد صاحب کے اس انتظار واہتمام کا علم تھا اس لئے احقر بھی اپنی پوری کوشش کرتا کہ اس اندازے کے مطابق وہاں پہنچ جاؤ لیکن اگر کبھی ذرا دیر ہوتی تو وہی حال ہوتا جو اوپر ذکر کر چکا ہوں۔

اتوار کی تعطیل میں اکثر ہم سب بہن بھائی اور ان کی بیوی بچے دار العلوم میں جمع ہوتے اور کبھی لاہور سے بڑے بھائی جان اور ہمشیرہ بھی آئے ہوئے ہوتے تو بھیاجی اور ہم سب چھوٹے بڑوں کی خوشی کی کوئی حد نہ رہتی۔ ہر روز روز عید ہر شب شب برات کا سماں بندھ جاتا خصوصاً عصر کے بعد کی مجلس تو انتہائی پر لطف گزرتی اور پھر بعد مغرب بھی یہ سلسلہ چلتا۔ایسے موقعوں پر نہ تو بھیاجی ہی کسی کام میں لگتے اور نہ ہم ان کو چھوڑتے۔

بعد عشاء سب لوگ مل کر کھانا کھاتے۔ بھیاجی ایک ایک فرد کا کھانے میں خود خیال رکھتے لیکن جب سے علیل ہو گئے تو رات کا کھانا برائے نام اور پرہیزی رہ گیا تھا اس لئے والد صاحب کے ساتھ کھانے میں شرکت نہ ہوتی ۔اور ہم سب بہن بھائی علیحدہ جمع ہو کر کھانا کھاتے اور اس وقت دنیا جہاں کی باتوں اور لطائف وظرائف میں بہت وقت خراب کرتے''[31]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا عید اور بقر عید کے دن گذارنے کا کیا معمول تھا اس حوالے سے جناب رضی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اس طرح کے اجتماع تو اکثر ہوا کرتے تھے البتہ عید یا بقر عید پر خاص طور پر والد صاحب دار العلوم میں اپنی سب اولاد کو جمع فرما کر عید کی خوشیوں کو دو بالا فرما دیا کرتے تھے۔سب کے لئے خصوصی کھانا خاص اپنے اہتمام سے پکواتے اور جب سب جمع ہوتے تو اس کا انتظار فرماتے رہتے کہ سب جمع ہو کر کب عیدی کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اگر ہمارے مطالبے میں کچھ تاخیر ہوتی تو تب خود ہی چھیڑتے تو فرماتے کہ بھائی کیا عیدی نہیں لوگے ؟ یہ سنتے

ہی سب والد صاحب کے گرد جمع ہو جاتے اور والد صاحب کی نیت پہلے ہی گذشتہ سال سے زیادہ عیدی دینے کی ہوتی تھی۔ فرماتے کہ اب تم کہو گے کہ گرانی کا زمانہ ہے ہم زیادہ عیدی لیں گے بس ہمیں تو بات ہاتھ لگ جاتی اور ہم مطالبے شروع کر دیتے، کوئی کہتا دوگنی کوئی کہتا تین گنی عیدی لیں گے۔ غرض نہایت فرحت وانس اور خوشی ومسرت کے ساتھ عیدیاں تقسیم فرماتے اور ہر سال عیدی کے موقع پر آخر میں سب کو بٹھا کر گرانقدر نصیحتیں فرمایا کرتے تھے کہ یہ ضرور فرماتے کہ بھائی یہ عیدی تو تم لے لو لیکن آئندہ سال خبر نہیں ہم کہاں ہوں گے۔

عیدی سے فراغت کے بعد آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت زبان مبارک پر جو آخری کلمات جاری تھے وہ سنائے اور فرمایا کہ بس اس وقت یہ مختصر لیکن نہایت جامع نصیحت میں بھی تم کو کرتا ہوں، آنحضرت ﷺ کے کلمات کا مفہوم یہ ہے:

"نماز کا خیال رکھو۔ نماز کا خیال رکھو اور اپنے ماتحتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔" اس وقت سوائے خدائے تعالی کے کسے معلوم تھا کہ بھیاجی کے ساتھ یہ ہماری آخری عید ہے لیکن قضاوقدر کا آخری فیصلہ ہو چکا تھا اور یہی عید والد صاحب کے ساتھ آخری عید ثابت ہوئی کیونکہ اس کے ٹھیک نو دن بعد یعنی گیارہ شوال ۱۳۹۶ھ کی شب کو علم وفضل جہاں تاب غروب ہو گیا اور اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔

اللہ اکبر کیسے عظیم باپ کی شکل میں اللہ تعالی نے گھر بیٹھے کیسی دولت نصیب کر رکھی تھی جس کی ہم نے قدر نہ پہچانی،،[32]۔

محترمہ رقیبہ عفت صاحبہ:

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی اولاد (خصوصا اپنی بچیوں) کے ساتھ تعلق اور برتاؤ کے متعلق آپ کی چھوٹی صاحبزادی محترمہ رقیبہ عفت صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:

''یوں تو والد صاحب کی محبت اور تعلق ساری اولاد کے ساتھ یکساں تھا، لیکن لڑکیوں سے والد صاحب کو خاص شفقت تھی۔ہمیشہ بڑی،نرمی اور محبت سے بات کرتے ۔ہماری چھوٹی چھوٹی خواہشات بشرطیکہ جائز ہوں، بڑی خوشی سے پوری کرنے کی کوشش فرماتے۔ کبھی ترش روئی یا غصہ سے بات نہیں کی، ہم سب بہنوں کے پیار سے نام رکھے ہوئے تھے، اکثر انہیں ناموں سے مخاطب فرماتے، آج تک اس لہجے کی مٹھاس اور حلاوت کانوں میں محفوظ ہے، اگر کسی بات پر فہمائش کی ضرورت محسوس کرتے تو انداز بیان نہایت نرم اور ناصحانہ ہوتا۔ پتہ بھی نہ چلتا کہ ہم پر ڈانٹ پڑ رہی ہے اور گوشمالی بھی خوب خوب ہو جاتی تھی۔ والد صاحب کی زندگی تقوی وپرہیز گاری کا نمونہ تھی۔ حقوق العباد کا اس قدر اہتمام والد صاحب کے سوا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، اگر ہمارے آرام کا وقت ہوتا اور والد صاحب کو کوئی کام پیش آجاتا تو خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے، ہم سب سے کبھی نہیں کہتے، بعد میں شرمندگی ہوتی(33)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ دن کو تصنیفی وتدریسی خدمات کے باوجود رات کو بچوں کی خدمت کرتے، محترمہ تحریر فرماتی ہیں:

'' میں ابھی ایک سال ہی کی تھی کہ میرے ایک عجلت پسند بھائی دنیا میں آوارد ہوئے اور میری شیر خواری کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لیے، والدہ کے لیے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا، اس لیے میری پرورش کی کچھ ذمہ داریاں والد صاحب نے خود سنبھال لیں، رات کو والد صاحب کے پاس سوتی، آدھی رات کو اٹھ کر دودھ پینے کی عادت تھی، میرے دودھ اور پانی کے مخصوص برتن تھے، اگر کسی اور برتن میں کھانے پینے کو دیا جاتا تو ہرگز نہ لیتی۔ اس لیے والد صاحب میرے پسندیدہ برتن کا جملہ سامان اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔

میں آدھی رات کو اٹھتی دودھ طلب کرنے کی ایک خاص لے تھی، اس سے میں ان کو جگاتی تھی، ابا جان خود ہی اٹھتے۔ والدہ صاحبہ کو اس لیے نہیں اٹھاتے تھے کہ دن بھر بچوں کے ساتھ تھکی ہوئی ہیں۔ خود ہی اٹھتے اور

دودھ بنا کر مجھے پلاتے اور جب میں اپنی تمام ضروریات سے فارغ ہو جاتی تو تھپک تھپک کر سلا بھی دیتے تھے۔وہ عادت راسخ ہو گئی اور عرصہ تک رات کو اٹھ کر دودھ پینے کا معمول رہا یہاں تک کہ اپنے سرہانے رکھے ہوئے برتن اور رات کو اٹھنے کا دھندلا سا منظر ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔اباجان بچپن میں ان باتوں کا ذکر کرتے رہتے تھے اور فرماتے تھے "کہ تیرا دودھ مانگنے کا گیت ابھی تک کانوں میں گونجتا ہے"(34)۔

بیماروں کی بیمار پرسی اور ان کی خاطر مدارت کے حوالے سے تحریر فرماتی ہیں:

اباجان کی عادت تھی کہ متعلقین میں سے جو بیمار ہو جائے تو اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔اس کی دل جوئی اور آرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔بیمار کی یہ مدارت دیکھ کر اس پر رشک آنے لگتا اور اس توجہ کے حصول میں بیمار ہونے کو دل چاہتا۔میری اکثر عادت تھی کہ اگر میری والدہ صاحبہ سے کسی غلطی پر ڈانٹ پڑتی یا بہن بھائیوں سے ان بن ہو جاتی تو چادر لپیٹ کر ایسی جگہ لیٹ جاتی کہ آتے ہی والد صاحب کی نظر پڑے۔اباجان آتے ہی گھر والوں سے باز پرس کرتے کس نے میری بیٹی کو ستایا ہے۔اتنی بات پر تمام غم وغصہ کافور ہو جاتا اور والد صاحب کوئی نہ کوئی چیز کھانے پینے کی چیز ضرور لے آتے خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو،ایسے وقت میں حصہ کچھ زیادہ ہی مل جاتا"(35)۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ عصر سے مغرب کی مصروفیت کے حوالے سے تحریر فرماتی ہیں:

"والد صاحب کی مشغولیات حیرت انگیز تھیں۔سمجھ نہیں آتا تھا کہ اتنے کاموں کے انبار کس طرح سمیٹ لیتے ہیں۔ان تمام مصروفیات کے باوجود دن بھر ایک وقت گھر والوں کے لیے ضرور نکال لیتے تھے۔اور وہ وقت عصر سے مغرب تک کا وقفہ ہوتا تھا۔اس وقت وہ زنان خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ہم سب بہن،بھائی ،والدہ صاحبہ،بھاوجیں قریب آکر بیٹھ جاتے تھے اور یہ مجلس بڑی بے تکلف مجلس ہوتی۔والد صاحب بھی ہر ایک

کی طرف متوجہ ہوتے۔ بچوں کے لیے اکثر مٹھائی اور ٹافیاں لے کر بیٹھتے تھے۔ اس لیے بچوں کا بھی مجمع لگا رہتا۔ یہ وقت ہم سب کے لیے ایک پر بہار ہوتا۔ پہلے ہی اس وقت کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔ عجیب بات ہے، باپ کا تصور لوگوں کے دلوں میں، باادب باملاحظہ قسم کا ہوتا ہے۔ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ جھجکتے ہیں۔ اباجان کے حسن سلوک کی بدولت ہمارے جذبات ایسے نہ ہوتے تھے۔ والد صاحب قریب ہوتے تو معلوم ہوتا کہ کسی بے تکلف مربی، دوست اور غم گسار کے سائے میں ہیں"[36]۔

مفتی محمد تقی عثمانی:

آپ کے چھوٹے صاحبزادے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے آپ کی وفات پر "البلاغ" کے اداریے میں جو تاثرات قلم بند کئے ہیں وہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصر سوانح کہلائے جانے کے لائق ہیں، چنانچہ مفتی تقی عثمانی رقم طراز ہیں:

"جب پونے دو سال پہلے احقر کے برادر مرحوم مولانا محمد زکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، اس وقت حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جیسا پیکرِ صبر واستقامت بن کر دکھایا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اسی موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار یہ حکیمانہ بات فرمائی تھی کہ انسان حادثات کے موقع پر دنیا کے واقعات کو الٹا پڑھتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے، مثلاً وہ یہاں سے سوچنا شروع کرتا ہے کہ اس حادثے سے میرا کیا کیا نقصان ہو گیا؟ اور یہ حادثہ ابھی پیش نہ آتا تو کیا تھا؟ حالانکہ وہ واقعات کو سیدھا پڑھے تو اس کی سمجھ میں آئے کہ یہ حادثہ تو کسی نہ کسی وقت پیش آنا تقدیر میں لکھا تھا، لیکن اللہ تعالی نے یہ حادثہ ہمیں کتنا نرم کر کے دکھایا اور اس کے لیے کیا کیا اسباب جمع فرمائے؟ اگر انسان ان باتوں کو سوچے تو اسے صبر وسکون آئے۔

آج جب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے کھولے ہوئے اس راستے پر ذہن سوچتا ہے تو بے ساختہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر زبان پر آتا ہے، اور احساس ہوتا ہے کہ جس واقعے کو ہم صبر کا موقع سمجھ رہے ہیں وہ در حقیقت شکر کا موقع ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا یہ سانحہ کبھی نہ کبھی پیش آنا ہی تھا، حضرات انبیاء علیہم السلام سے زیادہ دنیا کو کس کی ضرورت ہو سکتی ہے؟ جب وہ حضرات وفات سے مستثنیٰ نہ ہو سکے تو کون ہے جسے اس سے مستثنیٰ سمجھ لیا جائے؟ لہذا یہ وقت تو آنا ہی تھا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حادثے کو ہمارے لیے ہلکا کرنے کے لیے کتنے تسلی کے سامان جمع فرمائے؟

کتنے لوگ ہیں جن کے باپ بچپن ہی میں سر سے اٹھ جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس وقت اس دنیا سے اٹھایا جبکہ ان کی اولاد کا سب سے کمسن فرد یعنی احقر عمر کے چونیتس سال پورے کر چکا تھا اور آہ! ابھی انتقال سے صرف پانچ دن پہلے کی بات ہے، پانچ شوال کا دن گزر چکا تھا اور ہم عشاء کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں جمع تھے، اچانک مجھے خیال آیا کہ آج پانچ شوال تھی اور یہ میرا یوم پیدائش ہے، اس لیے بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ''ابا جی آج میری سالگرہ ہے''۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چہرۂ انور پر محبت ہی محبت چھا گئی اور انتہائی دلاویز تبسم کے ساتھ پوچھا: ''اچھا؟ ماشاءاللہ اب تمہاری عمر کتنی ہو گئی؟''

''چونیتس سال پورے ہو گئے''۔ میں نے عرض کیا۔ اس پر ایک لمحہ توقف کے بعد فرمایا: "الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی عمر میں بہت سے مراحل سے گزار دیا"۔

پھر کتنے مصنفین ہیں جو اپنا کوئی خاص شروع کیا ہوا کام ادھورا چھوڑ گئے، لیکن حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے تقریباً سارے ہی کام اللہ تعالیٰ نے پورے کرا دیے۔ ان کی کوئی تصنیف جسے مکمل کرنے کا ارادہ ہو، نامکمل نہیں رہی، بلکہ کوئی تصنیف ایسی نہیں رہی جو ان کی زندگی ہی میں شائع نہ ہو گئی ہو۔

پھر ان کی وفات کا حادثہ بالکل یک بارگی پیش آتا تو خدا جانے ہماری حالت کیا ہوتی؟ لیکن گزشتہ چار سال میں قدرتی طور سے ان پر امراض و عوارض کا ایسا سلسلہ چل رہا تھا کہ ہر شخص کو ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ہر روز بیم ورجا کی کیفیت رہتی تھی، اس عرصے میں ان کا گھر سے باہر نکلنا تقریباً ختم ہو چکا تھا اور بہت سی ذمہ داریاں ہمیں انجام دینے کی عادت پڑنے لگی تھی۔

غرض یہ تو صرف چند پہلو ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس حادثے کو نرم کرنے کے لیے ایسے غیر معمولی اسباب ہمارے لیے پیدا فرمائے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔

یہ تمام حقائق اپنی جگہ ہیں اور بلاشبہ ان پر غور کرنے سے بڑا سکون بھی ملتا ہے، لیکن جس پیکرِ شفقت ورحمت کی آغوش میں عمر کے چونتیس سال اس طرح گزرے ہیں کہ دنیا کے مکروہات کا کبھی احساس نہیں ہوا، اس کی یاد ایسی چیز نہیں ہے جسے آسانی سے کم کیا جا سکے۔

اس یاد کی ٹیسیں ختم کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ گھر کی ہر چیز اور دارالعلوم کے ایک ایک کام سے ان کی سینکڑوں یادیں وابستہ ہیں اور ہر قدم پر نہ جانے کتنے نشتر دل میں چبھوتی رہتی ہیں، گھبرا کر قرآن مجید کی تلاوت شروع کرتا ہوں تو اس میں بھی کسی نہ کسی آیت کے بارے میں ان کی بتائی ہوئی کوئی بات یاد آتی ہے، لہٰذا یادوں کی اس کائنات سے کہاں اور کس طرح بھاگ سکتا ہوں؟

ایک ضروری بات یاد آگئی۔ رمضان المبارک میں حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ پر پے در پے دل کی تکلیف کے حملے ہوتے رہے اور طبیعت بہت خراب رہی، عید کے بعد جب کیفیت بہتر ہوئی تو ایک روز فرمانے لگے:

”رمضان میں جب میرے طبیعت زیادہ خراب تھی تو یہ امید تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے رمضان نصیب فرمادے۔ یہ فرما کر وہ کچھ رکے، اور میں سوچنے لگا کہ وہ رمضان کی موت کی آرزو کا ذکر کرنا چاہتے ہیں مگر معاً یہ محسوس ہوا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں اور تردد ہو رہا کہ یہ بات کہوں یا۔۔۔ نہ کہوں! پھر ذرا سے توقف کے بعد

رک رک کر فرمایا: "لیکن میرا حال بھی عجیب ہے، لوگ تو رمضان میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں، لیکن میں تمنا نہ کر سکا، اس لیے کہ مجھے یہ خیال لگا رہا کہ اگر رمضان میں یہ واقعہ ہوا تو اوپر والوں (گھر والوں اور تعزیت کرنے والوں) کو بڑی تکلیف ہو گی اور ان کے روزوں اور تراویح وغیرہ کے معمولات میں دشواری پیش آئے گی"۔

اللہ اکبر! میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سن رہا تھا اور اس ایثار مجسم کو تک رہا تھا جس کی پروازِ فکر ہمارے تصور کی ہر منزل سے آگے تھی۔ عبادت و زہد کے شیدائی بحمد اللہ آج بھی کم نہیں لیکن بستر مرگ پر ان رعایتوں کا پاس کرنے والے اب کہاں ملیں گے؟

ان کا بے ساختہ جملہ ان کی پوری زندگی کے طرزِ فکر کی تصویر ہے، وہ خود اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری

کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو [37]

۳

فصلِ سوم

معروف دانشوروں اور مفکرین کی نظر میں

فصل سوم: مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معروف دانشوروں اور مفکرین کی نظر میں

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی (صدر آل انڈیا مجلس مشاورت وناظم ندوۃ المصنفین دہلی):

مفتی عتیق الرحمن صاحب آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سے میرے دو رشتے ہیں۔ایک خاندانی رشتہ اور دوسرا روحانی اور علمی رشتہ۔

مفتی شفیع صاحب مجھ سے کئی سال پہلے دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، یاد آتا ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا محمد یاسین صاحب مرحوم کے یہاں میں متوسط کتابیں پڑھتا تھا اور وہ درجہ فارسی سے فارغ ہو رہے تھے۔اس وقت سے آخر تک زندگی کے مختلف مرحلوں میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم طالب علمی کے اس دور میں بھی غیر معمولی طور پر کم آمیز، سنجیدہ اور نیک تھے،ان کی پاک نفسی اور نیکی کی شہرت اس وقت سے تھی،طالب علمی کا پورا دور انہوں نے بڑی نیک نامی سے گذارا،فراغت کے بعد دار العلوم ہی سے منسلک ہو گئے اور ان کا شمار جلد ہی دار العلوم کے ممتاز اساتذہ میں ہونے لگا،ادب اور فقہ میں خاص طور پر ان کی شہرت تھی۔درس وتدریس کے ساتھ ان کو شروع ہی سے تصنیف وتالیف سے بھی شغف تھا''(38)۔

تقسیم ہند کے بعد مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''تقسیم ملک کے نتیجہ میں مفتی صاحب پاکستان تشریف لے گئے اور ہم جماعت کے ممتاز عالم دین کے فیض صحبت سے محروم ہو گئے۔پاکستان پہنچ کر مفتی صاحب نے نہ صرف دار العلوم دیوبند کی شاندار روایت کو

قائم رکھا بلکہ ان کو چار چاند لگائے۔اس میں کوئی شک نہیں مرحوم کا شمار اس وقت کے اکابر علماء دیوبند میں تھا۔ان کی علمی اور دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ کراچی کا دارالعلوم ان کی زندہ جاوید یادگار ہے۔ قدیم علماء میں تحریر کی ایسی شگفتگی اور روانی کم دیکھی گئی ہے جو مفتی صاحب میں تھی۔اللہ تعالی نے ان کے کام میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ہر کام بڑی قابلیت سے جم کر کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ بہت دوسری اہم مصروفیتوں کے ساتھ تصنیف وتالیف کی خدمت بھی اعلی پیمانہ پر انجام دے رہے تھے سینکڑوں کتابوں کے علاوہ ان کا عظیم الشان کارنامہ ''تفسیر معارف القرآن'' ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے۔مفتی صاحب کی ایک غیر معمولی اور اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وقت کے تمام جدید مسائل پر غور وفکر کرتے تھے اور اپنی صوابدید کے مطابق ان کا حل نکالتے تھے۔ تحقیق کی راہ میں جب کبھی کسی مسئلہ سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، بے تکلف رجوع کر لیتے تھے اور اس سے ان کی بصیرت اور وسعتِ علم کا انداز ہوتا ہے۔

مفتی صاحب آج دنیا میں نہیں ہیں، لیکن ان کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی، وہ پاکستان میں علماء دیوبند کی آبرو تھے۔ حکومت کے معاملات میں دخیل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی عظمت اور وقار کو قائم رکھا۔مفتی صاحب کی نیک نیتی کا ایک کھلا ثمرہ یہ ہے کہ ان کی اولاد نے ان کے تمام علمی واصلاحی کاموں کو قابلیت اور سلیقہ سے سنبھال لیا ہے۔ان کی تمام ہی اولاد ماشاءاللہ ذی علم ہے اور صحیح راستہ پر قائم ہیں''[39]۔

حضرت حاجی ماسٹر محمد شریف (خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت تھانوی-ملتان):

مسلمانوں میں تفرق ومسلکی تعصب کے حوالے سے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر اور آپ کا طرز عمل بیان کرتے ہوئے حاجی ماسٹر محمد شریف صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب کا یہ بھی بڑا کمال تھا کہ صحیح مسلک سے ذرہ بھر نہ ہٹے اور کسی کی دل آزاری تک بھی نہ کی۔ایسا کرنا بڑا مشکل کام ہے پل صراط کی طرح نازک معلوم ہوتا ہے۔حضرت مفتی صاحب حق بات ایسے پیارے عنوان سے فرماتے تھے کہ مسلک میں اختلاف رکھنے والے کو بھی ناگوار نہ ہوتا تھا۔

حق پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مخالف بھی ایسی بات کہتا کہ شرعاً معمولی بھی گنجائش ہوتی تو قبول فرمالیتے۔ہمیشہ یہ تقاضا رہا ہے کہ اسے حتی الامکان مٹایا جائے۔مذاق سلیم کو مثبت انداز میں پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔کسی مسلک کا نام لیے بغیر بات یوں کہنی چاہیے کہ اکابر کا طرز یہ تھا۔ان کا مزاج ومذاق یہ تھا کہ ان سے گھلا ملا جائے اور مناسب مواقع پر انہیں اکابر کے کے صحیح مذاق کی دعوت دی جائے صرف اس حیثیت سے کہ وہ دین کی ایسی تعبیر ہے جیسے ہمارے اکابر نے اوفق بالسنتہ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔اور قدماء واکابر اسی مزاج کے حامل تھے۔اس طرح امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالی رفتہ رفتہ ناخوشگوار تفریق ختم ہوگا اور مل جل کر خدمت دین کا جذبہ بیدار ہوگا''[40]۔

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب:

مولانا غلام اللہ خان صاحب مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی اعظم گو ہماری نظروں سے او جھل اور ہمیں تا زیست داغ مفارقت کا صدمہ جانکاہ پہنچا کر اپنے مالک حقیقی کی اغوش رحمت میں جا پہنچے ہیں، لیکن جسم عنصری سے روح کے انفکاک کے بعد جس حقیقی منزل مقصود کو انہوں نے پالیا ہے، اس پر دنیا کی کئی زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔کیونکہ حقیقی مخلص مومن کی منزل مراد وصال الہی اور دیدار الہی ہے اور ہمیں اللہ تعالی کی بے پایاں اور ناپیدا کنار رحمتوں سے کامل امید ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو فردوس بریں کی ابد آباد اور پر بہار نعمتوں سے مالا مال فرمادیا ہوگا۔

جس عظیم شخصیت نے اپنی ساری زندگی دین اسلام کے لیے وقف کی ہو، توحید وسنت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا ہو، اسلام کی تحقیق وریسرچ میں اکناف عالم کے قلوب واذہان پر سکہ بٹھایا ہو، اپنی اجتہادی واستنباطی کاوشوں سے فقاہت وثقاہت کا ایک روشن باب سجایا ہو، زہد وتقوی سے اپنا ایک زندقہ کے متوالوں کا مشن بنایا ہو، ایک مصنف ومؤلف کی حیثیت سے اسلام کے ہر گوشے کی ترجمانی کی ہو کیا ایسی شخصیت کے بارے میں مومن ومتقی نہ ہونے کا شک کیا جاسکتا ہے؟ ہر گز نہیں جب حقیقت یہ ہے کہ ہمیں خالق کائنات کی رحمت کاملہ سے بھی امید ہے کہ ۔اللہ تعالی حضرت مرحوم کے ساتھ وہی معاملہ اور برتاؤ فرمائیں گے جس کا اس ذات اقدس سے متقین ومنین کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔

حضرت مفتی اعظم کی وفات کا المیہ ان کا اہل علم حضرات کے لیے احساس زیاں کی ایک اور راہ دکھاتا ہے ۔جو سرور کائنات حضرت رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے واقف ہیں کہ خدائے بزرگ وبرتر علم کو دنیا سے اس طرح نہ اٹھائیں گے۔کہ صحف وکتب سے اس علم کو محو کر دیا جائے گا۔بلکہ اس دنیا سے علم اٹھنا بایں صورت ہو گا۔کہ یکے بعد دیگرے علوم شریعت کے وارثین علماء کرام اس دنیا میں رحلت فرماتے چلے جائیں گے اور ان کے بعد اسکے جانشین آئیں گے۔جو ضلوا افاضلوا۔خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو گمراہ بھی کریں گے۔اگر حضرت نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان سچ ہے اور یقیناً سچ ہے اور شرح صدر سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت مفتی مرحوم کی وفات سے علم وعرفان کا ایک پورا باب اٹھ گیا اور ملت اسلامیہ کے لیے یہ کسی عظیم ترین المیہ وحادثہ سے کم نہیں۔مجھے تو جب بھی اس کا تصور یا خیال بھی آیا ہے تو دل ڈوبنے اور بیٹھنے لگتا ہے"[41]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق وعادات اور علمی خدمات کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مفتی صاحب مرحوم کا ظاہری وجسمانی ڈھانچہ ایک نحیف و نزار انسان کا ساتھا۔ پھر طبیعت میں اس قدر سادگی، فروتنی، عاجزی اور انکساری تھی۔ کہ کوئی شخص پہلی نظر میں ان کو دیکھنے سے یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عظیم شخصیت ہے۔ کہ جس کو پاکستان میں ''مفتی اعظم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہی اہل اللہ کا شیوہ وطریقہ ہے۔ ان کے سامنے دنیا کی شان و شوکت، ظاہری ٹھاٹھ، دنیوی سامان کی آرائش وزیبائش ترفہ و تنعم کی بودوباش اور کبر و نخوت کی نشست و برخاست پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی، وہ ہمیشہ ''والآخرۃ خیر وابقی'' کے فارمولے کو اپنی زندگی میں دہراتے رہتے تھے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں۔

حضرت مفتی اعظم کی سراپا علمی زندگی کا ایک عظیم شاہکار ان کی تفسیر ''معارف القرآن'' ہے۔ جو سادہ سلیس مگر عام فہم اور دلنشین پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ جس میں حضرت مفتی صاحب مرحوم نے قرآن مجید کے معانی و مطالب اور مفاہیم کو نہایت اچھوتے اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس تفسیر سے جہاں خواص باآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ وہاں عوام کے لیے بھی یہ علمی شاہکار رشد وہدایت کا ایک روشن مینار ہے اس تفسیر کا ایک انفرادی پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں فقہی مسائل اور احکام کا بھی خاطر خواہ ذخیرہ آگیا ہے۔ جس سے مسلک حنفیہ کی بڑھ چڑھ کر ترجمانی کی گئی ہے۔ مسلک حنفی کی دلدادہ حضرات کے لیے یہ چیز نعمت عظمی سے کم نہیں''[42]۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک حضرت مفتی اعظم خاموش سیاست پر یقین رکھتے تھے۔ بھارت سے برٹش گورنمنٹ کے انخلاء کے بعد حضرت مرحوم نے دیانتداری سے مسلم لیگ کی حمایت کو اسلام کی خدمت سمجھا اور پاکستان جیسی عظیم اسلامی اسٹیٹ کے قیام کے لیے انہوں نے شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثانی کی قیادت میں عظیم خدمات

سرانجام دیں۔ پھر پاکستان بننے کے بعد آپ نے کراچی میں ستاون (۵۷) ایکڑ زمین میں دار العلوم جیسے عظیم دینی ادارے کے داغ بیل ڈالی اور ساری زندگی اس دینی ادارے کی ترقی میں صرف فرمادی۔

اور کتاب وسنت کی تدریسی و تصنیفی لحاظ سے بھرپور خدمت فرماتے رہے۔ لیکن سیاست سے اس خاموشی کے دور میں جب بھی غلط کار لیڈر یا سیاست دان نے اسلام کے خلاف یاوہ گوئی کی۔ مفتی اعظم نے اس وقت اس کے ہرزہ سرائی اور اسلام دشمنی کی قلعی کھول کر عوام کے سامنے اس کو بے نقاب کر دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خان ایوب خان نے راولپنڈی میں جب اسلامی کانفرنس کا اہتمام وانصرام کیا جو اسلام کش اور الحاد پرور تھے حضرت مفتی اعظم نے فوراً اٹھ کر اس وزیر بے تدبیر کی ملحدانہ روش کی سختی سے تردید کی۔ دوسرے مشاہیر علمائے کرام نے بھی حضرت مفتی اعظم کی تائید کی اور اس طرح اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ کی بیخ کنی ہو گئی"۔(43)

پاکستان میں اسلامی قانون سازی کے عمل میں آپ کی جدوجہد کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"سردار عبد الرب نشتر مرحوم نے اپنے دور اقتدار میں اسلامی قوانین کی تدوین کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت مفتی اعظم کو دعوت دی۔ دونوں حضرات راولپنڈی میں تشریف لائے۔ لیکن نشتر صاحب کے پرزور تقاضا کے باوجود کسی سرکاری بلڈنگ میں رہنا گوارانہ کیا اور دونوں حضرات نے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ ہمیں خدا کے گھر قرب وپڑوس میں جو راحت نصیب ہوتی ہے۔ وہ سرکاری عمارت میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ سارے دن کی مصروفیات کار کے بعد اسلام کی یہ دونوں عظیم ہستیاں میرے غریب کدے میں تشریف لاتیں اور میرے پاس ہی رات کو آرام فرماتیں۔ بادشاہی کا نمونہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ کہ سردار عبد الرب نشتر بذات خود دونوں کو کار میں بٹھا کر میرے

پاس چھوڑ جاتے تھے۔بندہ ہیچمدان دونوں حضرات کی ذرہ نوازی اور شفقت ور اُفت کے اس بار احسان سے کبھی عہدہ براء نہیں ہو سکتا۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالی حضرت مفتی مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور بتقاضائے بشریت جوان سے زلات ہوئے۔ان سے اپنی رحمت کاملہ سے درگذر فرمادے''(44)۔

٤

فصلِ چہارم

شعراء وادباء کی نظر میں

فصل چہارم: شعراء وادباء کی نظر میں

آغاشورش کاشمیری:

آغاشورش کاشمیری اپنے عہد کے ممتاز ادیب، بلند پایہ مقرر اور بہترین شاعر تھے، علماء کے ساتھ ان کا عقیدت وں بھرا تعلق خاطر ساری زندگی برقرار رہا، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کے بھی معتقد رہے، انہوں نے اپنی کتاب "قلم کے چراغ" میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بڑے باکمال انداز میں کیا، وہ لکھتے ہیں:

> ''مفتی محمد شفیع۔۔۔دیوبند کے دورافتادہ قافلہ کے سرخیل، قد کوتاہ نہ دراز، سرتاپا پاکباز، گمشدہ زمانوں کے راست باز علماء کی ایک جیتی جاگتی تصویر، قرن اول کی سادگی کا نمونہ، طبیعت میں حلم، مزاج میں انکسار، زبان میں شیرینی، ادب و دین کا مرقع، حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ کا مرید، لیکن درباری نہ سرکاری، علم کا رسیا، قرآن کا شیدا، حدیث کا شائق، فقہ کا نباض، بیان میں پیچ نہ قلم میں خم، فقیدالمثال اساتذہ کا شاگرداور نامور شاگردوں کا استاد، چہرہ مہرہ شرافت کی دستاویز، کم سخن، کم آویز، دل خوفِ غیر اللہ سے خالی، دماغ غور و فکر کا خزینہ، عیب بینی اور نکتہ چینی سے بیزار، دوستوں کی چوٹوں سے جی خوش کرنے والااور دشمنوں کے وار کو ہنسی خوشی سہ جانے والا، مرنجاں مرنج، آنکھوں میں علم و حیاکارنگ و نور، عمر کہولت کی منزل میں، زندگی چشمہ صافی، بے شمار دینی رسائل کا مؤلف۔۔۔۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ڈوب کر اپنے آپ کو کھودینے والا، ایک درخشندہ چہرہ جو اس یقین کے ساتھ جی رہا ہے کہ وہ اپنی ہر سانس کیلئے وہ اللہ تعالی کے روبرو جواب دہ ہے''[(45)]۔

رئیس امروہوی:

رئیس امروہوی برصغیر کے بلند پایہ شاعر اور ممتاز صحافی تھے، یہ کئی اخبارات کی ادارت سے بھی وابستہ رہے، انہوں نے مفتی محمد شفیع کے انتقال کے موقع پر ایک مختصر نظم کہی:

فقیہ و شارح قرآن و مفتی اعظم — وہ جس کی ذات میں تھیں جلوہ گر تمام صفات
وہ "البلاغ" کا داعی، وہ دعوت تبلیغ — رئیس آ! آئینہ علم وفضل جس کی ذات
یہ ذکر تھا کہ کہوں کوئی مصرع تاریخ — یہ فکر تھی کہ لکھوں سال اختتام
تو ایک تجلی غیبی نے دی صدا کہ لکھو — "تجلیاتِ محمد شفیع" سالِ وفات

۱۳۹۶ھ (46)

جناب ولی رازی صاحب:

جناب ولی رازی ملک کے معروف مذہبی اسکالر اور کالم نگار ہیں، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے فرزند ہیں، ان کی غیر منقوط کتاب "ہادی عالم" سیرت پر لکھی گئی ایک منفرد کتاب ہے، انہوں نے اپنے والد کی رحلت کے موقع پر قطعہ تاریخ بیان کیا:

اللہ کے قابو میں ہے موت وحیاتِ ہر بشر — تاریخ رحلت کیلئے یوں غیب سے آئی خبر
رخصت ہوئے مفتی شفیع تو ہو گئے بے پاؤ سر — فقیہ و نظر، خلق وورع، قول و عمل، علم وبصر

۹۰ ۳۰ ۴۰ ۶ ۳۰۰ ۳۰ ۹۰۰ ۱۰۰

۱۳۹۶ھ (47)

جناب صباء متھراوی:

صباء متھراوی کا اصل نام رفیع الدین تھا، یہ ممتاز ادیب اور نامور شاعر گزرے ہیں، انہوں نے مفتی محمد شفیع کی وفات پر ایک نظم کہی تھی:

اٹھی ہے ارضِ پاک سے وہ پاک شخصیت
اے پاک بے نیاز وہ جنت مقام ہو
وہ پاک دل، وہ پاک نفس فاضل اجل
بزم جناں میں اس کے لئے اہتمام ہو
وہ روح علم مفتی اعظم، فقیہِ دہر
اس روح علم و فکر پہ رحمت مدام ہو
روز جزا ہو جب تو محمد شفیع ہوں
تحریر اس کا خلد نشینوں میں نام ہو
حور و غلماں ہوں ان کے واسطے جنت میں منتظر
ان کے بھی لبوں پہ صدائے سلام ہو
ان کا ہی ایک مصرع ہے ان کی اجل کا سال
اک لفظ "سربسجدہ" کا گر اہتمام ہو
مصرعہ صباؔ یہ ان کا ہے کیا بولتا ہوا
دوزخ کی آنچ مجھ پہ الہٰی حرام ہو(48)

جناب حکیم امداد اللہ احمد ذکیؔ:

حکیم امداد اللہ احمد ذکیؔ نے جو نظم لکھی، وہ درج ذیل ہے:

کیا بتائیں، آپ کا کیا ہے مقام
آپ کا فردوس میں ہے اب قیام
ذکر لب پر آپ کا ہے صبح و شام
آپ شمع محفل خیر الانام
جی رہے ہیں لے کے نام ہم آپ کا
ہے ہمارے ہاتھ میں جام آپ کا
جو نہ تھا کچھ آپ سے ذی شان بنا
جو نہ تھا انسان وہ انسان بنا
دشمنِ دیں صاحب ایماں بنا
آدمی آئینہ قرآں بنا
آپ ہی کے فیض سے عظمت ملی
زندگی کو رفعت و شوکت ملی
آپ سے روشن روایات قدیم
آپ کا کوچہ صراط مستقیم

آپ کی محفل کا ہر انسان فہیم
آپ کو حق سے ملا رتبہ عظیم

دین کا روشن ستارہ آپ تھے
وحدت حق کا نظارہ آپ تھے

تھے ہزاروں آپ کے حلقہ بگوش
آپ کے خادم ہوئے جنت بدوش

سن رہے تھے آپ آواز سروش
جز خیال مصطفیٰ کچھ تھا نہ ہوش

ہاتھ میں توحید کا پیمانہ تھا
دل رسول پاک کا کا شانہ تھا

آپ کا دل مرکز نور یقین
صدق کی تنویر سے روشن جبین

ہر ادا تھی شرح آیات مبین
بدر کامل آپ کے سب ہم نشین

آپ سے جو بھی ملا کامل ہوا
حاصل تقدیس آدم دل ہوا

قدر کے قابل تھے سارے اتقیا
دین کا تھا آپ سے روشن دیا

آپ بھی تھے شمع بزم مصطفیٰ
تھا بزرگان سلف سے سلسلہ

اب کہاں پائیں گے ہم شان وقیع
خلد میں ہیں مفتی محمد شفیع

اپنی قسمت پر نہ کیوں ہو اس کو ناز
دولت دیں سے نہ کیوں ہو سرفراز

کیوں نہ دل اس کا بنے وحدت کا ساز
منکشف اس پر نہ کیوں ہو دیں کے راز

کیوں نہ تابندہ ہو اس کی زندگی
آپ کے در کا گدا ہے یہ ذکی[49]

جناب مسلم غازی:

مسلم غازی کی نظم یہ ہے:

شیخ طریقت، مفتی اعظم پہنچا بارگہ حق میں دیں
جس نے پلائی دنیا بھر کو مے عرفان کے ساغر کی

ان کے مسائل سر الہیٰ معلومات کی زینت تھے
رحمت حق کے ساتھ تھی ہر دم ان پہ نظر پیغمبر کی

راستہ ان کا دیکھ رہے تھے کب سے شفیع روز جزا
حوریں بھی تھیں دید کی پیاسی کب سے شفیع برتر کی

میکدہ داور کی نظریں کب سے ان کی سمت رہیں
ساغر ہستی پی کر ان کو پیاس تھی جام کوثر کی

محفل ہستی چھوڑ کر حضرت انجمن جنت میں گئے
جیسے ہمارے سینوں میں ہو دل کی جگہ سل پتھر کی

تم سے کوئی سال رحلت ان کا اگر دریافت کرے — کہ دو غازیؔ موت العالم موت ہے یہ دنیا بھر کی(50)

جناب فضل کریم افضلؔ انصاری:

فضل کریم افضلؔ انصاری نے مفتی شفیع عثمانی کے انتقال کے بعد گلہائے عقیدت کچھ یوں پیش کیا:

عالم دین، بے بدل یکتائے دوراں اٹھ گیا — وائے قسمت سائیہ انوار یزداں اٹھ گیا
علمِ تفسیر و فقہ، درس حدیث مصطفیٰ — کاروان علم کا وہ میرا ساماں اٹھ گیا
سچ اگر پوچھو تو وہ اک علم کی معراج تھی — ہادی ارباب ذوق پختہ کاراں اٹھ گیا
علم و حلم و جود و تقویٰ تھا مدار زندگی — وہ نگار نور افزا ماہ کنعاں اٹھ گیا
سنت نبوی رہا ہو عمر بھر جس کا عمل — آج وہ منجملہ پرہیزگاراں اٹھ گیا
اٹھ گیا جو تھا نمونہ اسوہ اسلاف کا — باعثِ فخر و نشاط دینداراں اٹھ گیا
عمر بھر جو منکرات دین سے بچتا رہا — سالک راہ طریقت پاک داماں اٹھ گیا
اشرفؒ و انورؒ و اصغرؒ جس کو کرتے تھے پیار — نکتہ داں، نکتہ سنج صدر ہزاراں اٹھ گیا
پیکر خلق مجسم، بات تھی شیریں مقال — ہر عمل راحت فزائے بزم انساں اٹھ گیا
ڈھونڈتی پھرتی ہیں جس موتی کو نظریں ہر طرف — وہ در نایاب اور لعل بدخشاں اٹھ گیا
مسئلے مشکل سے مشکل حل ہو جاتے تھے جس سے — وہ فقیہ و عالم دیں نور یزداں اٹھ گیا
آج لو وہ بھی چراغ قوم و ملت گل ہوا — روشنی پاتی تھی جس سے بزم عرفاں اٹھ گیا
علم دیں والوں سے پوچھو ان کی قدر و منزلت — جن کے روح و قلب کا وہ جان جاناں اٹھ گیا
آ گئی فصل خزاں کیوں علم کے گلزار میں — کیا چمن سے ایک دم رنگ بہاراں اٹھ گیا
درد مندوں کا مداوا، بے کسوں کا غم گسار — اور مسکینوں کے غم کا ہائے درماں اٹھ گیا
تھی نظر اللہ پر ان کی بوقت واپسیں — محو ذکر رب اکبر شاد و شاداں اٹھ گیا
افضلؔ اب تو صبر کر! ہے صبر کرنے کا مقام — اب تیری باری ہے وہ دنیا سے مہماں اٹھ گیا(51)

مفتی جمیل احمد تھانوی:

مفتی محمد شفیع کی رحلت پر مفتی جمیل احمد تھانوی نے مرثیہ کہا، وہ درج ذیل ہے:

اک شیخ وقت و ہادی عالم نہیں رہے
شرع و طریق عشق کے سنگم نہیں رہے

کوچوں سے دہریت کے ہے اب زخم زخم دین
رکھتے تھے ایسے وقت جو مرہم اب نہیں رہے

تقویٰ و زہدومعرفت حق کے مقتدا
میدان علم و فضل کے رستم نہیں رہے

ٹوٹی کمر ہر ایک کی سانحے کے بعد
ہرکام کے کسی میں وہ دم خم نہیں رہے

افتاء و درس و وعظ، تصانیف و نظم و نثر
بے مثل کارہائے منظم نہیں رہے

چودہ سو سالہ نظریئے اسلام کے جو آج
یورپ زدوں کے دل میں مسلم نہیں رہے

تفسیر میں نکالے ہیں چن چن کے ان کے خار
شکوک و شبہات کے یہ سم نہیں رہے

اصلاح و تربیت کا رہا تھانوی طریق
اف "عصر" کے یہ شیخ معظم نہیں رہے

دینی کتب کی اشاعت کا ایک نظام
دنیا و دیں جو دونوں تھے مدغم نہیں رہے

اک مختصر سے جثہ سے دو پیر بھائی آپ کے
ہاں ہاں وہ خانقاہ میں کچھ کم نہیں رہے

جو شیخ عصر تھے اتنے بڑے کام
بابائے نجم و اطہر ہمدم نہیں رہے

تاریخ ارتحال ہے ہر ایک کی "فوت شیخ"
تینوں کے فیض عام تھے اک دم نہیں رہے

ہوش و حواس باختہ کیوں ہوں اہل دیں
وہ باکمال مفتی اعظم نہیں رہے[52]

جنید شوق چاٹگامی:

اسی طرح جنید شوق چاٹگامی نے بھی "غم کی کہانی" لکھی، جو درج ذیل ہے:

گلشن میں جو وہ رونق گلزار نہیں ہے
ہے کون سا گل باغ میں جو خار نہیں ہے

آندھی جو چلی، لٹ گیا وہ گلشن شاداب
اب اس کی کوئی چیز مزیدار نہیں ہے

تاریکی محفل سے خجل ہے شب مظلم
محفل میں جو وہ نور کا مینار نہیں ہے
اک درد ہے،اک رنج ہے،اک غم ہے،دلوں
کوئی نہیں اس غم کا جو بیمار نہیں ہے
میں فرط غم،ہجراں میں ہیں ہم مضطر و ناشاد
افسوس ہمارا کوئی غم خوار نہیں ہے
الفاظ نہیں جو "غم کی کہانی"سنادوں
اک درد ہے پر طاقت اظہار نہیں ہے
مغموم نہ اب صرف رفیع و تقی ہیں
کوئی نہیں جو اس غم سے دوچار نہیں ہے ملتا
رخصت ہوا وہ شفقت و ایثار کا پیکر
کہیں وہ شفقت و ایثار نہیں ہے
اے حضرت مفتی شفیعؒ و شہ افتا
اب فقہ و فتاویٰ کا وہ دربار نہیں ہے
وہ فخر گلستان رشید احمدؒ و قاسمؒ
وہ حضرت مکی کا وفادار نہیں ہے
محمود کی وہ آنکھ کا تارہ ہوا غائب اشرف
شبیرکاوہ صاحب اسرار نہیں ہے
علی و انور و اصغر کا دلارا
وہ حضرت یاسین کا دلدار نہیں ہے تصنیف میں
تفسیر کے میدان میں سوہ سابق غایات
وہ فارس مضمار نہیں ہے
افسوس کہ افسوس کہ دنیائے ادب میں
وہ شاہ سخن شاعر خوددار نہیں ہے
ہاتف نے کی مجھ سے یہ تاریخ وفات اب
مخدوم وطن ،قافلہ سالار نہیں ہے
آئے شوق نہ لب پر ہو کوئی حرف شکایات
اس راہ میں کچھ شکوہ سزاوار نہیں ہے[53]

خلاصۃ الباب

فقیہ العصر محدثِ مصر حضرت علامہ محمد زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول فقہ کے طویل تجربے نے آپ "فقیہ النفس" کے مقام تک پہنچادیا ہے۔ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کی صرف تعریف ہی نہیں کی، بلکہ باقاعدہ آپ کو "صحیح معنی میں فقیہ النفس" کا خطاب دیا ہے اور جو لوگ علامہ زاہد الکوثری کے تبحر علمی سے واقف ہیں، انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے الفاظ کو کسی تصنع یا مبالغے پر محمول نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے قلم اور ان کے کسی کی تعریف و توصیف میں محتاطانہ مزاج سے اہل علم حضرات بخوبی واقف ہیں۔

شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھے گئے مکتوبات اور مختلف تحریروں میں آپ کے متعلق تعریفی کلمات کہے ہیں، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے بقول آپ کی تفسیر "معارف القرآن" دور حاضر کے لیے یہ تفسیر بہت مفید ہے، زبان بھی سلیس اور ادبی ہے۔ فوائد و مسائل اور احکام کی تشریحات بھی نہایت عمدہ طریقہ پر کی گئی ہیں۔ مسلک اہلسنت کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نئی اردو زبان میں واقعی تفسیر کی ضرورت تھی جو حضرت مفتی صاحب کی "معارف القرآن" سے پوری ہوگئی۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب آپ کی علمی استعداد کے بخوبی قائل تھے، انھوں آپ کے ساتھ اپنی رفاقت کا ذکر کیا اور آپ کی خدمات کو سراہا، ان کے بقول آپ تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن میں بھی کمال کو پہنچے اور اسی لیے الحمد للہ آج آپ کے متوسلین بکثرت موجود ہیں اور مخلوق کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، آپ کو تصنیف و تالیف کا ذوق بھی ابتداء سے تھا فقہ، حدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص و عوام کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی زمانہ طالب علمی سے تھا، عربی و فارسی اور اردو میں نہایت عمدہ قصائید مراثی اور واقعاتی نظمیں لکھی ہیں جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے آخری دور میں تفسیر "معارف القرآن" لکھی جو علم تفسیر میں ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی علمی خدمات کا مختلف جہات سے ذکر کیا ہے اور آپ کے امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے مفید معلومات فراہم فرمائی ہیں۔ ان کے بقول حضرت مفتی صاحب کی علمی طبیعت مزاج میں حضرت شیخ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی

توجہات کو بڑا داخل ہے جس طرح حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ، کی توجہات سے یہ مزاج بن گیا کہ وقت کی قدر ہو اور ضیاع وقت سے احتراز کیا جائے اور مفید عوام تالیفات سے دین کی خدمت کی جائے۔

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی آپ کے ساتھ تربیتی تعلق تھا، انھوں نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ پر اور دارالعلوم کراچی کی تاریخ وتاسیس پر روشنی ڈالی، ان کے بقول حضرت مفتی صاحب قدس سرہ، کو اللہ تعالی نے علوم ظاہری کیساتھ علوم باطنی کی دولت بھی فروانی کے ساتھ عطا فرمائی تھی علوم باطن کے بغیر علوم ظاہر ایسے ہیں جیسے روح کے بغیر جسم، اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب کو جسم کے ساتھ اس کی روح بھی عنایت فرمائی تھی، آپ کی زندگی میں علم و عمل کے اعلی معیار پر ہونے کے باوجود انتہائی سادگی تھی، آپ ہر کس ناکس سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے، ان کا انداز زندگانی اسی طرح سادہ اور بے تکلف تھا اور کوئی امتیازی شان معلوم نہ تھی، ان کی ساری زندگی اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈھلی ہوئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی ذات میں بڑی محبوبیت تھی۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو "بھیاجی" کہہ کر پکارتے تھے، کیونکہ انھوں نے جب سے اپنے گھر میں جب آنکھ کھولی تو حضرت والد صاحب کے لئے اپنے سب بڑے اور چھوٹے بہن بھائیوں کو ''بھیاجی''ہی کہتے سنا اور دیکھا، انھوں نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی شب وروز مصروفیات کے متعلق کافی مفصل تذکرہ فرمایا۔ نیز انھوں نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنی پاکستان ہجرت کا آنکھوں دیکھا حال بھی لکھا۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادیوں نے لکھا کہ آپ کا اپنی اولاد (خصوصا اپنی بچیوں) کے ساتھ تعلق اور برتاؤ بہت مشفقانہ تھا، آپ ان کی تمام جائز خواہشات بڑی خوشی سے پوری فرماتے، اگر کسی بات پر فہمائش کی ضرورت محسوس کرتے تو انداز بیان نہایت نرم اور ناصحانہ ہوتا، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ دن کو تصنیفی وتدریسی خدمات کے باوجود رات کو بچوں کی خدمت کرتے، اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو ان کی بیمار پرسی اور خاطر مدارت میں خصوصی اہتمام فرماتے، دن کی تمام مصروفیات کے باوجود دن بھر ایک وقت گھر والوں کے لیے ضرور نکال لیتے تھے۔ اور وہ وقت عصر سے مغرب تک کا وقفہ ہوتا تھا۔ اس میں آپ کے سب بچے شریک ہوتے اور یہ مجلس بڑی بے تکلف مجلس ہوتی۔

مفتی عتیق الرحمن صاحب کے بقول مفتی صاحب آج دنیا میں نہیں ہیں، لیکن ان کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی، وہ پاکستان میں علماء دیوبند کی آبرو تھے۔ حکومت کے معاملات میں دخیل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی عظمت اور وقار کو قائم رکھا۔ مفتی صاحب کی نیک نیتی کا ایک کھلا ثمرہ یہ ہے کہ ان کی اولاد نے ان کے تمام علمی واصلاحی کاموں کو قابلیت اور سلیقہ سے سنبھال لیا ہے۔ ان کی تمام ہی اولاد ماشاءاللہ ذی علم ہے اور صحیح راستہ پر قائم ہیں۔

حضرت حاجی ماسٹر محمد شریف صاحب (خلیفۂ مجاز حکیم الامت حضرت تھانوی-ملتان) کے بقول حضرت مفتی صاحب کا یہ بھی بڑا کمال تھا کہ صحیح مسلک سے ذرہ بھر نہ ہٹے اور کسی کی دل آزاری تک بھی نہ کی۔ ایسا کرنا بڑا مشکل کام ہے پل صراط کی طرح نازک معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب حق بات ایسے پیارے عنوان سے فرماتے تھے کہ مسلک میں اختلاف رکھنے والے بھی ناگوار نہ ہوتا تھا۔

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے حوالے سے اپنے تاثرات قلم بند فرمائے ہیں اور فرمایا ہے کہ حضرت مفتی اعظم گو ہماری نظروں سے اوجھل اور ہمیں تازیست داغ مفارقت کا صدمہ جانکاہ پہنچا کر اپنے مالک حقیقی کی اغوش رحمت میں جا پہنچے ہیں، لیکن جسم عنصری سے روح کے انفکاک کے بعد جس حقیقی منزل مقصود کو انہوں نے پالیا ہے، اس پر دنیا کی کئی زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ حقیقی مخلص مومن کی منزل مراد وصال الٰہی اور دیدار الٰہی ہے اور ہمیں اللہ تعالی کی بے پایاں اور ناپیدا کنار رحمتوں سے کامل امید ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو فردوس بریں کی ابد آباد اور پربہار نعمتوں سے مالامال فرمادیا ہوگا۔

آغا شورش کاشمیری اپنے عہد کے ممتاز ادیب، بلند پایہ مقرر اور بہترین شاعر تھے، علماء کے ساتھ ان کا عقیدتوں بھرا تعلق خاطر ساری زندگی برقرار رہا، مفتی محمد شفیع کی خدمات کے بھی معتقد رہے، انہوں نے اپنی کتاب "قلم کے چراغ" میں مفتی محمد شفیع کا تذکرہ بڑے باکمال انداز میں کیا۔

رئیس امروہوی برصغیر کے بلند پایہ شاعر اور ممتاز صحافی تھے، یہ کئی اخبارات کی ادارت سے بھی وابستہ رہے، انہوں نے مفتی محمد شفیع کے انتقال کے موقع پر ایک مختصر نظم کہی، صباء متھراوی (رفیع الدین) ممتاز ادیب اور نامور شاعر گزرے ہیں، انہوں نے بھی مفتی محمد شفیع کی وفات پر ایک نظم کہی، مفتی محمد شفیع کی رحلت پر مفتی جمیل احمد تھانوی نے مرثیہ کہا، اسی طرح جنید شوق چاٹگامی نے بھی "غم کی کہانی" لکھی۔

حواشی، مصادر و مراجع، باب پنجم

(1) محمد زکریا، شیخ الحدیث، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۲۰،۱۹)۔

(2) ایضاحوالہ سابقہ (ج ا، ص ۲۰)۔

(3) ایضامحولہ بالا (ج ا، ص ۲۵،۲۶)۔

(4) محمد طیب، حکیم الاسلام، قاری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۲۸)۔

(5) ایضاحوالہ سابقہ (ج ا، ص ۲۸،۲۹)۔

(6) ایضامحولہ بالا (ج ا، ص ۳۰)۔

(7) محمد طیب، حکیم الاسلام، قاری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۲۹)۔

(8) محمد یوسف، بنوری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۳۱،۳۲)۔

(9) ایضاحوالہ سابقہ (ج ا، ص ۳۲)۔

(10) ایضامحولہ بالا (ج ا، ص ۳۲،۳۳)۔

(11) محمد یوسف، بنوری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۳۴،۳۵)۔

(12) عبدالحیی، ڈاکٹر، عارفی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۳۷،۳۸)۔

(13) ایضاحوالہ سابقہ (ج ا، ص ۴۳-۴۵)۔

(14) ایضامحولہ بالا (ج ا، ص ۴۵)۔

(15) عبدالحیی، ڈاکٹر، عارفی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ا، ص ۴۶)۔

(16) ایضاحوالہ سابقہ (ج ا، ص ۴۵،۴۶)۔

(17) ایضامحولہ بالا (ج ا، ص ۴۸)۔

(18) عبدالحیی، ڈاکٹر، عارفی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۱، ص ۴۸)۔

(19) رضی عثمانی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۳۹)۔

(20) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۱۰۴۱، ۱۰۴۲)۔

(21) ایضامحولہ بالا (ج ۲، ص ۱۰۴۳)۔

(22) رضی عثمانی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۴۵، ۱۰۴۶)۔

(23) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۱۰۴۶)۔

(24) رضی عثمانی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۴۶، ۱۰۴۷)۔

(25) ایضامحولہ بالا (ج ۲، ص ۱۰۴۷)۔

(26) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۱۰۴۷)۔

(27) ایضامحولہ بالا (ج ۲، ص ۱۰۳۹)۔

(28) رضی عثمانی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۵۴، ۱۰۵۵)۔

(29) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۱۰۵۵)۔

(30) ایضامحولہ بالا (ج ۲، ص ۱۰۵۵، ۱۰۵۶)۔

(31) رضی عثمانی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۵۷، ۱۰۵۸)۔

(32) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۱۰۵۹، ۱۰۶۰)۔

(33) رقیبہ عفت، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۶۱، ۱۰۶۲)۔

(34) ایضامحولہ بالا (ج ۲، ص ۱۰۶۲، ۱۰۶۳)۔

(35) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۱۰۶۳)۔

(36) رقیبہ عفت، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۱۰۶۵)۔

(37) تقی عثمانی، مفتی، نقوش رفتگاں، کراچی، مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۷ء (ص ۷۱-۷۴)۔

(38) عتیق الرحمن، مفتی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۹۷۲)۔

(39) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۹۷۳-۹۷۵)۔

(40) حاجی ماسٹر محمد شریف، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۹۷۹)۔

(41) غلام اللہ، شیخ القرآن، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۹۸۳، ۹۸۲، ۹۸۵)۔

(42) ایضاحوالہ سابقہ (ج ۲، ص ۹۸۶، ۹۸۷)۔

(43) ایضامحولہ بالا (ج ۲، ص ۹۸۸)۔

(44) غلام اللہ، شیخ القرآن، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۱۱ء، (ج ۲، ص ۹۸۸، ۹۸۹)۔

(45) آغا شورش کاشمیری، قلم کے چراغ، لاہور، دار الکتاب (ص ۱۲۷)۔

(46) رئیس امروہی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۴)۔

(47) ولی رازی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۴)۔

(48) صبا متھراوی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۵)۔

(49) امداد اللہ احمد ذکی، حکیم، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۶، ۱۲۴۷)۔

(50) مسلم غازی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۷)۔

(51) فضل کریم افضل انصاری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۸)۔

(52) جمیل احمد تھانوی، مفتی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۴۹)۔

(53) جنید شوق چاٹگامی، مفتی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۲۰۰۵ھ (ج ۲، ص ۱۲۵۰)۔

کتابیات(Bibilography)

عربی

- القرآن الكريم.
- الأبشيهي، شهاب الدين محمد بن أحمد بن منصور الأبشيهي أبو الفتح (المتوفى: 852هـ)، المستطرف في كل فن مستظرف، الناشر: عالم الكتب، بيروت، الطبعة: الأولى، 1419 هـ.
- ابن أبي جمهرة، عبد الله بن أبي جمهرة، الأزدى، الأندلسي،(متوفى ٦٩٩هـ)، شرح البخاري = بهجة النفوس وتحليها بماله وما عليها، الصدق الخيرية، الطبعة: ١٣٦٣هـ.
- ابن حبان، محمد بن حبان بن أحمد بن حبان بن معاذ بن مَعْبدَ، التميمي، أبو حاتم، الدارمي، البُستي (المتوفى: 354هـ)، صحيح ابن حبان، ت: الشيخ شعيب الأرنؤوط، مؤسسة الرسالة – بيروت، الطبعة: الثانية، 1414 – 1993.
- ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (المتوفى: 1252هـ)، رد المحتار على الدر المختار=حاشية ابن عابدين، الناشر: دار الفكر-بيروت الطبعة: الثانية، 1412هـ - 1992م.
- البخاري، محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي، صحيح البخاري، بتحقيق وترقيم: د.مصطفى ديب البغا،دار طوق النجاة،الطبعة الأولى=١٤٢٢.
- البزار، أبو بكر أحمد بن عمرو بن عبد الخالق بن خلاد بن عبيد الله العتكي المعروف بالبزار (المتوفى: 292هـ)، مسند بزار= البحر الزخار، بتحقيق: المحقق: محفوظ الرحمن زين الله، (حقق الأجزاء من 1 إلى 9)

وعادل بن سعد (حقق الأجزاء من 10 إلى 17) وصبري عبد الخالق الشافعي (حقق الجزء 18) مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة، الطبعة: الأولى، (بدأت 1988م، وانتهت 2009م).

- الترمذى، محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى (المتوفى: 279هـ)،سنن ترمذى، تحقيق وتعليق:أحمد محمد شاكر (جـ 1، 2) ومحمد فؤاد عبد الباقي (جـ 3)وإبراهيم عطوة عوض المدرس في الأزهر الشريف (جـ 4، 5)الناشر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي – مصر،الطبعة: الثانية، 1395 هـ - 1975 .
- الثعالبي، عبد الملك بن محمد بن إسماعيل أبو منصور الثعالبي (المتوفى: 429هـ)، التمثيل والمحاضرة، بتحقيق: عبد الفتاح محمد الحلو، ط: الدار العربية للكتاب، الطبعة: الثانية، 1401 هـ - 1981 م.
- الزيلعي، عبد الله بن يوسف، الزيلعي، نصب الراية، تحقيق: محمد عوامة، لبنان، الناشر: مؤسسة الريان للطباعة والنشر - بيروت -لبنان/ دار القبلة للثقافة الإسلامية- جدة – السعودية، الطبعة: الأولى، 1418هـ/ 1997م.
- شفيع العثماني المفتي، أحكام القرآن ، إدارة القرآن ، كراتشي، 1987م.
- شفيع العثماني المفتي، الازدياد السني على اليانع الجني، إدارة المعارف كراتشي، سن الطبعة: محرم 1423ه.
- شفيع العثماني المفتي، الحيلة الناجزة، كمال پريس، دهلي، 1936م.
- شفيع العثماني المفتي، الكشاف عن بعض مسائل الأوقاف، مكتبة دار العلوم- كراتشي.
- شفيع العثماني المفتي، أماثل الأقوال الأفاضل الرجال ، دار الإشاعة ديوبند، الهند.
- شفيع العثماني المفتي، تميز الهدى من الهوى عن الفرق بين البيع والربا، مجلس التحقيق الحاضرة كراتشي، 1399 ه.

- شفيع العثماني المفتي، طريق السداد فى عقوبة الارتداد ، دارالاشاعت ديوبند، الهند.
- شفيع العثماني المفتي، كشف الظنون فى حكم الخط والتلغراف والتلفون، إدارة المعارف كراتشي.
- شفيع العثماني المفتي، نفحات، إدارة المعارف كراتشي.
- شفيع العثماني المفتي، نهايات الأرب في غايات النسب، جمعية المصلحين، سهارنفور، الهند.
- شفيع العثماني المفتي، هدية المهديين في آية خاتم النبيين، دار الإشاعة ديوبند، الهند.
- شفيع العثماني المفتي، وقاية المسلمين عن ولاية المشركين، إدارة الإسلاميات- لاهور.
- الطبرانى، أبو القاسم، سليمان بن أحمد، أبو القاسم الطبرانى، المعجم الأوسط، دار الحرمين،القاهرة، تحقيق: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، الطبعة: الأولى ١٤١٥هـ -١٩٩٥م.
- عبدالرحمن البرنى، دكتور، علماءُ ديوبند وخدماتهم في علم الحديث، أكاديمية شيخ الهند.
- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (المتوفى: 1014هـ)، المحقق: حققه وعلق عليه: محمد نزار تميم وهيثم نزار تميم، الناشر: دار الأرقم - لبنان / بيروت، الطبعة: بدون.
- مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261هـ)، صحيح مسلم، بترقيم: فؤاد عبد الباقي، دار إحياء التراث العربي – بيروت، الطبعة الاولى، ١٤١٢هـ- ١٩٩١م

- المیداني،أبو الفضل أحمد بن محمد بن إبراهيم الميداني النيسابوري (المتوفى: 518هـ) المحقق: محمد محيى الدين عبد الحميد، الناشر: دار المعرفة - بيروت، لبنان.
- الهيثمي، علي بن أبي بكر بن سليمان، أبو الحسن نور الدين، الهيثمي (المتوفى: 807هـ)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، بتحقيق: حسام الدين القدسي، القاهرة، مكتبة القدسي، سن الطبعة: 1414 هـ، 1994 م.

اردو

- احسان دانش، جہانِ دگر، خزینۂ علم وادب لاہور ،۲۰۰۱ء
- احمد سعید، پروفیسر، حصولِ پاکستان، ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور، س ن
- احمد سعید، بزم اشرف کے چراغ، لاہور، المیزان، ۲۰۰۵ء
- اشرف خان، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۵ء
- اظہار الحسن محمود، عشق رسول اور علماء دیوبند، مکتبۃ الحسن، لاہور، س ن
- اعجاز الحق قدوسی، اقبال اور علمائے پاک وہند، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء
- آفتاب احمد، مولانا، خیر السوانح، ادارہ خیر المعارف ملتان، ۲۰۰۶ء
- اکبر شاہ بخاری، بیس علماء حق، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱۴۲۳ھ
- اکبر شاہ بخاری، اکابرین وفاق المدارس العربیہ پاکستان، لاہور، س ن
- اکبر شاہ بخاری، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۰ء۔
- اکبر شاہ بخاری، حضرت مفتی اعظم پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ۔
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، پچاس جلیل القدر علماء، مکتبہ المیزان، لاہور ۲۰۰۶ء
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، تذکرہ اولیائے دیوبند، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، سو بڑے علماء، نیشنل بک سروس، لاہور، ۲۰۰۲ء

- اکبر شاہ بخاری، حافظ، مفتی اعظم پاکستان اکابر و معاصرین کی نظر میں، س ن
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، اکابر علماء دیوبند، ادارہ اسلامیات، لاہور، س ن
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، س ن
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، مقالات مفتی اعظم مفتی محمد شفیعؒ، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۵ء
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، معارف مفتی اعظم، زمزم پبلشرز
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، تحریکِ پاکستان کے عظیم مجاہدین، طیب اکیڈمی ملتان، س ن
- اکبر شاہ بخاری، حافظ، چالیس بڑے مسلمان، ادارۃ القرآن کراچی، ۲۰۰۱ء
- اویس سرور، مولانا، اسلافِ امت کا بچپن، بیت العلوم کراچی، ۲۰۰۹ء
- ایچ بی خان (حافظ بابر)، برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علما کا کردار، قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
- ترمذی، عبدالشکور، مولانا، مفتی، پاک وہند کے نامور علماء ومشائخ، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۴۲۷ھ
- ترمذی، عبدالشکور، مولانا، ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۵ء
- تقی عثمانی، مفتی، نقوشِ رفتگاں، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۲۸ھ—اپریل ۲۰۰۷ء
- تقی عثمانی، مفتی، مقالاتِ عثمانی، دائرۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۷ء
- تقی عثمانی، مفتی، البلاغ نمبر، بیاد فقیہ ملت، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۵ء
- تقی عثمانی، مفتی، تراشے، مکتبہ معارف القرآن کراچی، فروری ۲۰۰۲ء

- تقی عثمانی،، مفتی، میرے والد میرے شیخ، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۱۵ھ — ۱۹۹۴ء
- تقی عثمانی، خطبات دورۂ ہند، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۱۷ء
- تقی عثمانی، مفتی، اکابرِ دیوبند کیا تھے؟ ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۱۵ھ — ۱۹۹۴ء
- حامد علی خان، مولانا، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، انارکلی لاہور، ۱۹۸۸ء
- حنیف خالد، مقالات و مضامین و سوانح، ادارۃ المعارف کراچی
- رفیع عثمانی، مفتی، مقدمہ معارف القرآن، ادارہ معارف القرآن، کراچی
- رفیع عثمانی، حیات مفتی اعظم، کراچی ادارۃ المعارف، ۲۰۱۱ء
- رفیع عثمانی، مفتی، البلاغ مفتی اعظم نمبر، کراچی مکتبہ دار العلوم ۲۰۰۵ء
- روح اللہ نقشبندی، مثالی ماؤں کی مثالی اولادیں، دار الاشاعت کراچی، ۲۰۱۰ء
- ستار طاہر، پاکستان (تصور، تحریک، تکمیل) صادق پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
- سکھروی، عبدالروف، مفتی، مجالس مفتی اعظم مفتی محمد شفیعؒ، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۱۸ء
- سمیع الحق، مولانا، کاروانِ آخرت، موتمر المصنفین، س ن
- سید ریاض الدین، سوانح و تعلیمات حضرتِ عارفیؒ، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۲۱ھ
- سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، مکتبۃ الفیصل، لاہور، ۲۰۰۴ء
- سیفی، رشید اشرف، متاعِ نور، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۹۹۷ء

- شفیع عثمانی، مفتی، احکامِ عیدالاضحی، صدیقی ٹرسٹ، کراچی، س ن
- شفیع عثمانی، مفتی، اسلام کا نظامِ اراضی، دارالاشاعت کراچی، اپریل ۱۹۷۹ء
- شفیع عثمانی، مفتی، بیمہ زندگی، دارالاشاعت کراچی، س ن
- شفیع عثمانی، مفتی، پردے کے شرعی احکام، ادارہ اسلامیات لاہور، فروری ۱۹۷۹ء
- شفیع عثمانی، مفتی، احکام القمار، ادارہ اسلامیات لاہور، س ن
- شفیع عثمانی، مفتی، احکام حج و عمرہ، پانیر آرمز، وکٹوریہ روڈ کراچی، س ن
- شفیع عثمانی، مفتی، احکامِ دعا، ادارۃ المعارف کراچی، اگست ۱۹۹۱ء
- شفیع عثمانی، مفتی، اخبارات و جرائد کی مذہبی ضرورت، دارالاشاعت دیوبند
- شفیع عثمانی، مفتی، اسلام اور موسیقی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۸۷ء
- شفیع عثمانی، مفتی، پراوڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۳ء
- شفیع عثمانی، مفتی، تصویر کے شرعی احکام، ادارۃ المعارف کراچی، اپریل ۱۹۷۹ء
- شفیع عثمانی، مفتی، تقریر ترمذی، (غیر مطبوعہ)
- شفیع عثمانی، مفتی، جدید مسائل کے شرعی احکام، دارالاشاعت کراچی، ۱۳۸۰ھ
- شفیع عثمانی، مفتی، جہیز کی شرعی حیثیت، صدیقی ٹرسٹ، س ن
- شفیع عثمانی، مفتی، جواہر الفقہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، جنوری ۲۰۱۲ء

- شفیع عثمانی، مفتی، ختم نبوت، مکتبہ معارف القرآن کراچی، جنوری ۲۰۰۹ء
- شفیع عثمانی، مفتی، دل کی دنیا، ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۱۶ھ
- شفیع عثمانی، مفتی، سیرتِ خاتم الانبیاء، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۳۶۸ھ
- شفیع عثمانی، مفتی، شراب کی مذمت اور اس کی خرابیاں، صدیقی ٹرسٹ
- شفیع عثمانی، مفتی، ضبط ولادت کی عقلی و شرعی حیثیت، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۸۳ء
- شفیع عثمانی، مفتی، مجالس حکیم الامتؒ، دارالشاعت کراچی، ۱۹۷۶ء
- شفیع عثمانی، مفتی، مکاتیبِ حکیم الامت، ادارۃ المعارف کراچی
- شفیع عثمانی، مفتی، آداب النبی ﷺ، ادارہ اسلامیات لاہور، اگست ۱۹۷۵ء
- شفیع عثمانی، مفتی، نقوش وتاثرات، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء
- شفیع عثمانی، مفتی، جواہر الفقہ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۱۰ء
- شفیع عثمانی، مفتی، میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء
- شورش کاشمیری، قلمی چہرے، مجلسِ یادگارِ شورش، کراچی
- ظفیر الدین، مفتی، مشاہیر علمائے دیوبند، دفترِ اجلاس صد سالہ دیوبند
- عشرت حسین جاوید، پروفیسر، دو سو مردانِ حق، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان
- عقیل عباس جعفری، پاکستان کرونیکل، ورثہ

- فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، دارالاشاعت کراچی، ۱۳۹۶ھ
- فیوض الرحمن، ڈاکٹر، تعارفِ قرآن، مکتبہ مدنیہ لاہور
- کوثر مدنی، عبدالرحمن، مولانا، یادگارِ صالحین، مکتبہ انوارِ طیبہ
- ماہر القادری، یادِ رفتگاں، البدر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۶ء
- متاعِ احتشام الحق، شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ احتشامیہ کراچی
- مجاہد الحسینی، مولانا، علماء دیوبند: عہد ساز شخصیات
- مجذوب، خواجہ عزیز الحسن، اشرف السوانح، ،ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ لاہور
- مجلہ الحقانیہ، شعبہ ءاشاعت جامعہ حقانیہ، ساہیوال
- محمد ارشد، مآثر مفتی اعظم پاکستان، ادارہ اسلامیات کراچی
- محمد اسد سلیم شیخ، انسائیکلوپیڈیا تحریکِ پاکستان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء
- محمد اسلام انصاری، حکیم، ملتِ اسلامیہ کی محسن شخصیات، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۱ء
- محمد زاہد الحسینی، قاضی، تذکرۃ المفسرین، دارالاشاعت اٹک، شعبان ۱۴۰۱ھ
- محمد طاہر مصطفی، تفسیری رجحانات کا ارتقاء، شکیل سنز، راولپنڈی
- محمد ظفر اقبال، سو مشہور علمائے کرام، شاہین پبلی کیشنز کراچی
- محمد علی چراغ، اکابرینِ تحریکِ پاکستان، سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۹۰ء

- محمد منصور احمد، مولانا، انار کے درخت تلے، مکتبہ الشہداء کراچی
- محمد اسحاق ملتانی، ارشاداتِ اکابر، تالیفات اشرفیہ ملتان
- محمد اسماعیل مدنی، ڈاکٹر، مکتوبات شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، دارالاشاعت کراچی
- معین الدین عقیل، ڈاکٹر، مسلمانوں کی جد جہدِ آزادی، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور
- مکاتیب حکیم الامت، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۵ء
- منشی عبدالرحمن، تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی، ادارۃ المعارف ملتان
- منیب احمد، مولانا، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء۔
- ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، حدیثِ پاکستان، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی
- ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، کاروانِ زندگی، لکھنؤ، مکتبہ اسلام، ۲۰۰۰ء
- ندیم الواجدی، مولانا، خدا رحمت کند، دار الکتاب دیوبند، ہند
- نور البشر، مولانا، سرمایۂ گراں مایہ، کراچی، مکتبہ معہد عثمان بن عفان، ۲۰۱۴ء
- نور محمد زہری، حافظ، تذکرہ علمائے حقانی (سندھی)، مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدر آباد
- وکیل احمد شیروانی، اشرف المقالات، مجلس صیانۃ المسلمین لاہور
- ولی مظہر، عظمتوں کے چراغ، مجلسِ کارکنانِ تحریکِ پاکستان ملتان
- یوسف لدھیانوی، مولانا، ماہنامہ "البلاغ"، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دار العلوم، ۲۰۰۵ء

رسائل وجرائد ومجلات

- جواہر شریعت مجموعہ رسائل جلد نمبر2، مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی، بنگلور-انڈیا، مکتبہ مسیح الامت دیوبند
- ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم نمبر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۲۰۰۵ء
- ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک نوشہرہ، مکتبہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ، فروری ۱۹۸۱ء
- ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک نوشہرہ، مکتبہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ، شوال ۱۳۹۶ھ، اکتوبر ۱۹۷۷ء
- ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک نوشہرہ، مکتبہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ، ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ، نومبر ۱۹۷۶ء
- ماہنامہ انوار مدینہ، لاہور، مکتبہ جامعہ مدنیہ جدید، جنوری ۲۰۰۸ء
- ماہنامہ انوار مدینہ، لاہور، مکتبہ جامعہ مدنیہ جدید، جنوری ۲۰۱۵ء
- ماہنامہ بینات، ج ۳۰، کراچی، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، صفر ۱۳۹۷ھ بمطابق فروری ۱۹۷۷ء
- ماہنامہ بینات، ج ۳۰، کراچی، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، محرم الحرام ۱۳۹۷ھ بمطابق جنوری ۱۹۷۷ء
- ماہنامہ تجلی، ج ۲۷، دیوبند، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء
- ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور، ۷ جولائی ۱۹۸۱ء

انگریزی

- Mufti Muhammad Shafi, The laws of Dua, Darul Isha'at Karachi,2001
- Mufti Muhammad Shafi, Islam on Grafting and Transplanting of Human Organs, Darul Isha'at Karachi
- Mufti Muhammad Shafi, The Issue of Interest, Darul Isha'at Karachi,2008
- Mufti Muhammad Shafi, Signs of Qiyamah and the arrival of the maseeh, Darul Isha'at Karachi,2007
- Mufti Muhammad Shafi, Repelling of poverty in Islam, Darul Isha'at Karachi, 2006
- Mufti Muhammad Shafi, The World Within, Darul Isha'at Karachi, 2004
- Mufti Muhammad Shafi, Sins that produce nothing, , Darul Isha'at Karachi,1993
- Mufti Muhammad Shafi, Distribution of wealth in Islam, begum Aisha bawani,1979.

تمت